میر شناسی: عصرِ حاضر میں

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

ریگولر پروگرام

سیشن ۲۰۰۳ء — ۲۰۰۸ء



مقالہ نگار:

نذر عباس

لیکچرار، اردو

گورنمنٹ کالج، بھلوال

نگران:

ڈاکٹر محمد کامران

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

شعبۂ اُردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور



میر تقی میر



پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

انتساب

اُس

''لمحے''

کے نام،

جس نے مجھے بدل دیا۔

فہرست ابواب

دیباچہ:

میؔر کے ساتھ میری باقاعدہ وابستگی اس وقت سے ہے جب میں آج سے اٹھارہ سال پہلے ایم۔اے۔اردو کا طالب علم تھا۔ یہ وابستگی صرف وابستگی کی حد تک نہ رہی بلکہ اس نے ''محبت'' کی شکل اختیار کر لی۔ اس وابستگی کو ''محبت'' کی شکل کب، کیسے اور کیوں ملی؟ اس کا واضح تعین مجھ سے آج تک نہیں ہو سکا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ میؔر کے دھیمے اور سُریلے لہجے میں زندگی گزارنے کا جو حوصلہ موجود ہے وہ مجھے اور کہیں پر نظر نہیں آیا۔ میؔر عجیب شخص ہے جو انتہائی پستیوں میں گرے ہوؤں کو بلندیوں میں جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔ مر مر کے زندہ رہنے کی بات کرتا ہے۔ حوصلہ ہی حوصلہ۔۔۔ محبت ہی محبت۔۔۔ اسی بات نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے۔

''میؔر'' سے محبت نے ''میؔر شناسی'' کے میدان میں اُتارا تو معلوم ہوا کہ میؔر اس سمندر کی وسعت رکھتے ہیں جس کی حد کا تعین بے بسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ''میؔر شناسی'' کی کوششوں میں اہلِ علم نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا ہے۔ میرے اس مقالے کا موضوع ''میؔر شناسی: عصرِ حاضر میں'' مکمل طور پر ان تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کے سہارے آگے بڑھتا ہوا ''میؔر شناسی'' کی قدر اور امکانات کا تعین کرتا ہے۔

''میؔر شناسی'' ایک باقاعدہ روایت کی شکل میں ہے لیکن یہ روایت اس قدر مضبوط بنیادیں قائم کرنے میں ناکام رہی جس قدر غالبؔ شناسی اور اقبالؔ شناسی کی روایت نے مضبوط بنیادیں قائم کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میؔر بہت بڑے شاعر ہیں لیکن اڑھائی سو سال کے زمانے پر محیط میؔر شناسی کی کوششیں اتنی حوصلہ افزاء نہیں ہیں۔

''میرؔ شناسی: عصرِ حاضر میں'' کو میں نے پانچ ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے میرؔ شناسی کی کاوشوں کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالے کا پہلا باب تمہیدی اور تعارفی نوعیّت کا ہے جس میں تذکرہ نگاری کی روایت کے حوالے سے میرؔ شناسی کو سامنے لایا گیا ہے۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ باب ڈیڑھ سو سال کی میرؔ شناسی پر محیط ہے لیکن میرؔ کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے جن مضبوط دلائل کی ضرورت تھی، اس ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں ہمیں وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود میرؔ شناسی کی اس ڈیڑھ سو سالہ روایت نے اُن کی شخصیت اور فن کی تصویر کے وہ ہلکے خطوط ضرور فراہم کر دیے ہیں جن کی مدد سے بعد میں آنے والے میرؔ شناسوں نے ان کے فن اور شخصیت کی جو تصویر بنائی وہ حسن کی حامل ٹھہری۔ تذکرہ نگاری کی یہ روایت اس وقت کے تنقیدی شعور کے عین مطابق ہے۔ اسی تنقیدی شعور کی روشنی میں میرؔ کی شخصیت اور فن کو جس طرح سمجھنے کی کوششیں ہوئی ہیں۔ اُن کو سامنے لاتے ہوئے میرؔ کے مقام و مرتبہ کا تعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب نے جب وسعتیں اختیار کیں تو تحقیقی اور تنقیدی مزاج کتاب کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوا۔ بیسویں صدی جہاں پر اور بہت سی چیزیں انسانی زندگی میں لانے کا اعزاز رکھتی ہے وہاں پر کتاب کو کئی رنگوں میں پیش کرنے کا سہرا بھی اسی صدی کے سر ہے۔ کتاب کا محدودیت سے وسعت کا سفر میرؔ شناسی کو بھی تذکرہ نگاری کی محدود فضا سے وسعت کی طرف لانے میں کامیاب رہا۔ بیسویں صدی میں میرؔ شناسی کسی ایک روایت کے سہارے کی محتاج نہ رہی۔ اس کے بعد میرؔ شناسی کی کوشش مکمل کتب، جزوی کتب، ادبی تواریخ، دیباچہ جات، مقدّمہ جات، ادبی رسائل اور تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات کی صورت میں سامنے آئی۔

اس تحقیقی و تنقیدی مقالے کا دوسرا باب میرؔ کے فن اور شخصیت کے حوالے سے لکھی جانے والی مکمل کتب پر مشتمل ہے۔ مکمل کتاب کسی شخصیت اور اس کے فن کو بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔ کیونکہ اس میں مصنّف کے پاس اپنی بات کو دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔

تفصیلات موضوع کو بڑی حد تک نمایاں کر دیتی ہیں۔ میرؔ شناسی کے حوالے سے لکھی جانے والی مکمل کتب نے بھی اُن کی شخصیت اور فن کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس باب میں مکمل کتب کی مدد سے میرؔ شناسی کے بننے والے رجحان کو مجموعی طور پر سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مکمل کتب کے حوالے سے میرؔ شناسی کی عصرِ حاضر میں کوششوں کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ان پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کے حوالے سے میرؔ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی ابھی تک ضرورت ہے۔

''میرؔ شناسی عصرِ حاضر میں'' کا جائزہ مکمل کتب کے حوالے سے لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میرؔ شناسی کے حوالے سے دیگر مآخذ کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے لیکن محض باب دوّم کی طوالت کے ڈر سے اس باب میں صرف مکمل کتب کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میرؔ شناسی کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوّم کا تعین میرؔ شناسی کے حوالے سے لکھی جانے والی جزوی کتب کے جائزے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس باب میں ایسی کتب کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو مکمل طور پر میرؔ کی شخصیت یا فن کے لیے وقف نہیں ہیں بلکہ ان کتب میں میرؔ کے ساتھ ساتھ دیگر شعراء یا ادب کے رجحانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان جزوی کتب میں میرؔ کے ساتھ ساتھ دیگر شعراء یا رجحانات کی بحث میرؔ کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بننے والی تصویر کو زیادہ خوبصورت انداز میں نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جزوی کتب میرؔ کی زندگی اور فن کو اس حد تک تفصیل سے بیان تو نہیں کر سکیں جتنی تفصیل کے ساتھ مکمل کتب نے انھیں بیان کیا ہے لیکن پھر بھی انھیں میرؔ شناسی میں اہمیت کی حامل گردانا جا سکتا ہے۔ ادبی تاریخ نگاری کو بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ ادبی تواریخ رجحانات پر بحث کرتے ہوئے ان رجحانات کی محرک شخصیات کو بھی زیرِ بحث لاتی ہیں۔ اس لیے میرؔ کو بھی ان ادبی تواریخ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان ادبی تواریخ میں بھی میرؔ کے فن اور شخصیت کے حوالے سے کئی مباحث شامل کیے گئے ہیں۔ ان ادبی تواریخ کے مطالعہ سے میرؔ شناسی کے رجحانات کو سمجھنے میں بڑی آسانی حاصل ہوئی ہے۔

باب چہارم میں میؔر شناسی کے حوالے سے ہونے والا باقی ماندہ کام سامنے لا کر میؔر شناسی کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں:

۱۔ انتخابات کے دیباچہ جات اور مقدّمہ جات

۲۔ ادبی رسائل میں شامل مضامین اور

۳۔ تعلیمی اداروں میں لکھے جانے والے مقالہ جات

کو شامل کیا گیا ہے۔

میؔر شناسی میں میؔر کے کلام کے انتخابات کے دیباچہ جات اور مقدّمہ جات نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان انتخابات میں میؔر کی زندگی اور فن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان دیباچہ جات اور مقدّمہ جات نے ایک روایت کی صورت اختیار کرتے ہوئے میؔر کی زندگی اور فن کے بارے میں بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ان معلومات نے میؔر کی تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے اسے مزید نمایاں کیا ہے۔

ادبی رسائل کا کردار اردو ادب میں بڑا اہم ہے۔ ادبی رسائل نے تحقیقی وتنقیدی نوعیّت کے مضامین معیار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شائع کیے ہیں۔ میؔر شناسی کے حوالے سے ان ادبی رسائل کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کو بھی کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان مضامین نے میؔر کی زندگی اور فن کے بارے میں معلومات میں مزید اضافے کیے ہیں۔ اسی باب میں تعلیمی اداروں میں لکھے جانے والے تحقیقی وتنقیدی مقالہ جات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ جات طالب علمانہ کوششیں ہونے کے باوجود اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ انھیں ماہر اساتذہ کی نگرانی میں مکمل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان مقالہ جات میں منتخب موضوع کی وضاحت کے لیے معتبر حوالے شامل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان مقالہ جات نے بھی میؔر شناسی میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کے متعدد پہلو اُجاگر کیے ہیں۔

پانچواں باب ''حاصلِ بحث'' پر مشتمل ہے جس میں میؔر شناسی کی تمام کوششوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے جہاں پر میؔر شناسی کے تمام رجحانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے وہاں پر میؔر شناسی کے امکانات کو

بھی سامنے لایا گیا ہے۔ یہ باب ''نتائج'' کی کوشش ہے جسے موضوع کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی اس کاوش میں جن مآخذ کا سہارا لیا ہے، ان کے بارے میں ایک بات کو مدِّنظر رکھا ہے کہ ان میں ایسے مآخذ کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے جو عام طور پر بڑی اہمیت کے حامل نہیں سمجھے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم مآخذ کے ساتھ ساتھ کم اہمیت کے حامل مآخذ سامنے لا کر ''میرؔ شناسی'' کے رجحان کی کوششوں میں اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اتار چڑھاؤ کے رجحان میں سے میرؔ کو شخصیت اور فن کے حوالے سے دریافت کرنے کی کوششوں کو سامنے لانا تھا۔ میرؔ شناسی کی روایت اڑھائی سو سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس لیے تمام مآخذ تک رسائی ناممکن تھی لیکن پھر بھی مآخذات کو زیرِ تحقیق موضوع کی وضاحت کے لیے اس قدر ضرور شامل کیا گیا ہے کہ حتمی نتائج تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

''تحقیق'' میرے خیال میں مشکل یا آسان نہیں بلکہ صبر آزما ہے۔ اس صبر آزمائی میں جہاں پر مجھے ماورائی سہاروں نے سنبھالے رکھا وہاں پر میرے جاننے والوں نے بھی میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ چند لوگوں کے نام کا انتخاب میرے لیے مشکل ترین مرحلہ ہے جس سے میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان تمام مہربانوں کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔ باوجود اس کے میں اس مقالے کے نگران جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران صاحب کا نام لے کر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس راہ میں اکیلا ہوں۔ ان کی محبّتوں نے مجھے یہ فیصلہ نہیں کرنے دیا کہ وہ میرے استاد ہیں یا دوست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نذر عباس
لیکچرار، اُردو
گورنمنٹ کالج بھلوال



باب اوّل

میر شناسی کے ابتدائی نقوش
تذکرہ نگاری کی روایت

میرؔ شناسی کے ابتدائی نقوش

تذکرہ نگاری کی روایت:

’’میر تقی میرؔ‘‘ اُردو ادب کے کلاسیکی شعراء میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری ’’کلاسیک‘‘ کے معیار کے عین مطابق ہے۔ یہ شاعری اپنے زمانے کی حدود سے ماورا ہو کر آنے والے زمانے میں بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کلامِ میرؔ کو ہر تنقیدی مکتبۂ فکر ایک عظیم فن پارہ تسلیم کرتا ہے۔ ان کی شاعری ایسی شاعری ہے جس کی بنیاد پر وہ ہر ادبی نسل کے ساتھ ایک زندہ رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے ’’ہم سفر‘‘ بن گئے ہیں۔

میرؔ کی عظمت کا اعتراف ہر زمانے میں ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی حیثیت نمایاں ہوتی گئی لیکن اس کے باوجود، میرؔ پر اُن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جتنا کام ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہو سکا۔ پھر بھی اڑھائی سو سال کے عرصے میں میرؔ شناسی کے حوالے سے ہونے والا تحقیقی اور تنقیدی کام معیار اور مقدار کے لحاظ سے اتنا ضرور ہے کہ اس کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لے کر عصرِ حاضر میں میرؔ شناسی کے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ میرؔ شناسی کی ان کوششوں کی وجہ سے ہم اُن کی شخصیت اور فن کی عظمت کا تعیّن کر سکتے ہیں۔

انسان اپنی شخصیت اور فن کا خود بھی نقاد ہوتا ہے۔ کسی انسان کی اپنے متعلق رائے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرؔ شناسی کی ابتداء بھی میرؔ کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت اور شاعری کے متعلق جو رائے دی ہے، اس سے اختلافِ رائے تو ہو سکتا ہے لیکن ان تنقیدی اشاروں کو بالکل نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔

میرؔ نے خود شناسی کا اظہار دو طرح سے کیا ہے:

۱۔ اپنے اشعار میں

۲۔ آپ بیتی ’’ذکرِ میرؔ‘‘ میں

میرؔ نے اپنی شاعری میں خودشناسی کو اس طرح بیان کیا ہے:

کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

جس شعر پہ سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج نے سنا تو ہے میرا کہا ہوا

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمین تھام لیا

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

حُسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

''ذکرِ میرؔ'' میں خودشناسی کی کوشش آباشناسی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ میرؔ نے جہاں پر ''ذکرِ میرؔ'' میں عصری تاریخ کو سمونے کی کوشش کی ہے وہاں پر اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے اپنی ذات کو متعارف کرایا ہے۔ اگرچہ ''خودشناسی'' احساسِ تفاخر کی حامل ہوتی ہے لیکن جب میرؔ کی شاعری اور ذات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ احساسِ تفاخر صرف احساسِ تفاخر نہیں رہ جاتا بلکہ اس سے ان کی تصویر کے ایسے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں جو آنے والے نقادوں کے لیے میرؔ شناسی میں بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں۔

انھوں نے اپنے کلام کے بارے میں حتمی تنقیدی رائے تو نہیں دی اور نہ ہی ''ذکرِ میر'' میں بیان کردہ واقعات سے نقاد مکمل طور پر متفق ہیں لیکن پھر بھی ان کی اپنی شخصیت اور فن کے متعلق آراء ہمیں میرؔ شناسی کے سفر میں رہنمائی ضرور فراہم کرتی ہیں۔

میرؔ کی اپنی ذات اور فن کے بارے میں رائے پہلی نظر میں شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے لیکن اڑھائی سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود انھوں نے اپنے کلام کی جن خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن پر فخر کیا ہے، آج بھی نقاد ان خوبیوں کے معترف ہیں۔

کسی شخص کا اپنی ذات اور فن کے متعلق آراء دینا شاید اتنا قابلِ تحسین نہ ہو جتنا ہم عصر لوگوں کا۔ میرؔ کی اپنے متعلق آراء کے ساتھ ساتھ میرؔ شناسی کی یہ روایت ان کے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء کے ذریعے مزید آگے بڑھی۔

سوداؔ کے بقول:

؎ سوداؔ تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

ناسخؔ معتقدِ میرؔ ہونے پر اس طرح زور دیتے ہیں:

؎ شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میرؔ کے سامنے مصحفیؔ کا عاجزانہ رویّہ اس طرح کا ہے:

؎ اے مصحفیؔ تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میرؔ کے منہ پر

ذوقؔ کہتے ہیں:

؎ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ کے ہاں میرؔ کی عظمت کا اعتراف اس طرح سے ہے:

ریختہ کے تمہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اسی طرح شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، الطاف حسین حالیؔ، اکبر الہ آبادیؔ اور حسرتؔ موہانی نے اپنے اپنے انداز میں میرؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہؔ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میرؔ پھرتی ہے

یہ غزل پڑھتے اگر بزمِ سخن داں میں ظفرؔ
کیونکہ تحسیں کے لیے پھر نہ سرِ میرؔ ہلے

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہوں
شاگرد میرزا کا مقلّد ہوں میرؔ کا

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

شعر میرے بھی ہیں پُردرد ولیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

میرؔ کے بارے میں شاعروں کا انداز نیازمندانہ سہی لیکن ان شعروں میں ان کے کلام کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ خوبیاں حقیقتاً ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے ہم عصر شعراء سے لے کر بعد میں آنے والے موجودہ زمانے کے شعراء تک کا، میرؔ کے کلام کی خوبیوں کی نشان دہی صرف اور صرف نیازمندی کا ہی اظہار نہیں ہے بلکہ یہ اُن کے کلام سے شناسائی فراہم کرنے کا بھی ایک انداز ہے۔ میرؔ کے

ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء کا یہ اعترافِ عظمت ان کو ''خدائے سخن'' کا درجہ عطا کرتا ہے۔ شعراء کی یہ تعریف و توصیف میر شناسی کا رنگ لیے ہوئے ہے لیکن اُن کے بارے میں شعراء کا یہ اظہارِ رائے تاثراتی انداز کا حامل ہے۔

میر شناسی کے ابتدائی نقوش میر کی اپنی آراء، ہم عصر شعراء اور بعد میں آنے والے شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ ادبی تذکروں میں بھی موجود ہیں۔ تذکرہ، بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ شعراء کے کلام کا انتخاب جب صرف انتخاب کی حد سے آگے بڑھا تو انتخاب کے ساتھ ساتھ شاعر کا نام، مختصر حالاتِ زندگی اور کلام پر مختصر رائے بھی شامل ہونے لگی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''بیاض کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے۔ بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا ہے جب کہ اس میں انتخابِ اشعار، صاحبانِ اشعار کے نام اور تخلّص کا اضافہ کر دیا گیا تو اس کا نام تذکرہ ہو گیا۔ بعد ازاں شعراء کے نام اور تخلّص میں خاص ترتیب پیدا کی گئی۔ کہیں ابجدی ترتیب ملحوظ رکھی گئی، کہیں تہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی۔ اس کے ساتھ مختصر حالاتِ زندگی اور کلام پر مختصر تبصرے کا اضافہ ہوا اور تذکرہ، بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضا میں داخل ہو گیا۔'' [1]

تذکروں کی یہ نیم تنقیدی رائے بھی کسی شاعر کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں بڑی حد تک معاون ہے۔ اس تنقید کا رنگ تعارفی، تحسینی یا تنقیصی ہے۔ تنقید کے اس رنگ کے ذمہ دار اُس زمانے کے تہذیبی اور اخلاقی معیار ہیں۔ بے شک تقریظ اور تاثر کی اس دلدل میں تلاشِ حق مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس انداز کی تنقید کے حامل تذکروں کی مدد سے بھی ہم چند حقائق تک پہنچ سکتے ہیں۔

ادبی تذکروں میں مفصل تنقیدی رائے نہیں ملتی لیکن کسی شاعر کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالاً آراء ضرور مل جاتی ہیں۔ تذکرہ نگاری کی یہ روایت اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک رہی۔ تذکرہ نگاری کی روایت کا پہلا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ہے جسے میر نے

۱۷۵۲ء میں لکھا اور اس روایت کا آخری تذکرہ ''آبِ حیات'' ہے جسے محمد حسین آزادؔ نے ۱۸۸۰ء میں لکھا۔ تذکرہ نگاری کی روایت ''آبِ حیات'' تک آتے آتے نیم تاریخی انداز اختیار کر لیتی ہے اور ''آبِ حیات'' ہی ادبی تاریخ نگاری کی روایت کی بنیاد بنی۔ ''نکات الشعراء'' سے لے کر ''آبِ حیات'' تک اُردو شعراء کے سڑسٹھ تذکرے لکھے گئے جن میں سے زیادہ تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

میرؔ کا ذکر جن ادبی تذکروں میں شامل ہے ان کے نام یہ ہیں:

نکات الشعراء از میر تقی میرؔ	:	۱۷۵۲ء
تذکرہ ریختہ گویان از فتح علی حسینی	:	۱۷۵۲ء
مخزنِ نکات از قیام الدین قائمؔ	:	۱۷۵۴_۵۵ء
ریاضِ حسنی از عنایت اللہ فتوتؔ	:	۱۷۵۴_۶۰ء
چمنستانِ شعراء از لچھمی نرائن شفیقؔ	:	۱۷۶۱_۶۳ء
طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوقؔ	:	۱۷۷۴_۷۶ء
تذکرہ شعرائے اُردو از میر حسن	:	۱۷۷۷_۷۸ء
مسرت افزا از ابوالحسن امیر الدین امراللہ	:	۱۷۷۹ء
گلشنِ سخن از مردان علی خان مبتلاؔ	:	۱۷۸۰ء
گلزارِ ابراہیم از علی ابراہیم خلیلؔ	:	۱۷۸۳_۸۴ء
تذکرہ ہندی گویاں از غلام ہمدانی مصحفیؔ	:	۱۷۹۴_۹۵ء
گلشنِ ہند از مرزا علی لطفؔ	:	۱۸۰۰_۰۱ء
گلشنِ ہند از حیدر بخش حیدری	:	-----
عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور	:	۱۸۰۱_۰۲ء
مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسمؔ	:	------
گلشنِ بے خار از مصطفٰی خان شیفتہؔ	:	۱۸۳۴_۳۵ء

خوش معرکۂ زیبا از سعادت خان ناصرؔ	:	۱۸۴۴۔۴۶ء
گلستانِ بے خزاں از قطب الدّین باطنؔ	:	۱۸۴۵۔۴۹ء
طبقات الشعرائے ہند از کریم الدّین رفیلن	:	۱۸۴۶۔۴۷ء
سراپا سخن از سیّد محسن علی	:	۱۸۵۲۔۵۳ء
گلشنِ ہمیشہ بہار از نصر اللہ خان خویشگیؔ	:	۱۸۵۳۔۵۴ء
ریاض الفردوس از محمد حسین خان شاہجہان پوری	:	۱۸۵۹۔۶۰ء
قطعۂ منتخب از عبدالغفور خان نسّاخؔ	:	۱۸۵۹۔۶۰ء
سخنِ شعراء از عبدالغفور خان نسّاخؔ	:	۱۸۶۴۔۶۵ء
تذکرہ شمع انجمن مع نگارستانِ سخن از نواب صدیق حسن خان، سیّد نورالحق	:	۱۸۷۵ء
بزمِ سخن از سیّد علی حسن خان	:	۱۸۸۰ء
آبِ حیات از محمد حسین آزاد	:	۱۸۸۰ء

تذکرے، بیاضوں، کچکولوں اور مجموعوں سے مختلف چیز ہیں۔ یہ باقاعدہ تالیفات ہیں جو شاعروں کے حالات اور منتخب کلام کی حامل ہوتی ہیں۔ تذکروں میں عام طور پر شاعروں اور شاعری پر اچھی بری رائے بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی شاعر تذکرہ نگاروں کی رائے سے بچ بھی جاتا ہے۔ ان میں شاعروں کے حالات لکھتے وقت عام طور پر ان دو طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

۱۔ شاعروں کے ناموں کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے

۲۔ شاعری کے ادوار کے اعتبار سے

اگرچہ تذکرے میں شاعر کے حالاتِ زندگی عموماً اجمالی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی بڑی حد تک ان تذکروں میں لکھے گئے حالاتِ زندگی سے شاعر کا تعارف ہو جاتا ہے۔

تذکروں میں تنقیدی اشارات معنوی خصوصیات کے بجائے ظاہری صورت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے

بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید تاثراتی انداز کی حامل ہوتی ہے۔ آج کے تنقیدی معیار کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ تنقید، جدید تنقید کے تمام تر تقاضے پورے نہیں کرتی لیکن ان تذکروں کے تنقیدی شعور پر اس وجہ سے حرف نہیں آتا کہ جس ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں یہ تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اس میں موضوع اور مواد سے زیادہ توجہ ظاہری صورت پر دی جاتی تھی۔ جب زمانے کی پرکھ کا مزاج ہی ظاہری صورت پر انحصار کر رہا ہو تو نقاد بھی اسی مزاج کے حوالے سے ادب پارے کی قدر کا تعین کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

میرؔ کی شاعرانہ عظمت کے پیشِ نظر تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ بے شک یہ رائے ہر تذکرہ نگار نے اپنے انداز میں دی ہے لیکن ان کے کلام کے خصائص کسی حد تک ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ تذکروں میں زیادہ تر میرؔ کے کلام کے انتخاب کو مدِ نظر رکھا گیا ہے لیکن پھر بھی ان کے کلام کے حسن و قبح پر تنقیدی آراء نے میرؔ شناسی میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ مختلف تذکروں میں میرؔ کے کلام پر تذکرہ نگاروں کی تنقیدی آراء کچھ اس طرح سے ہیں۔ فتح علی حسینی ''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں لکھتے ہیں:

> ''سخن سنج بے نظیر، میر محمد تقی، میرؔ تخلص زاد کاھش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد شمع استعدادش برکردہ شعلۂ ادراک سراج الدین علی خان آرزو است۔ فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمِ آب دادہ حقا کہ دراں تلاشِ معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بروئے کار آوردہ۔'' [۲]

قیام الدین قائمؔ ''مخزنِ نکات'' میں لکھتے ہیں:

> ''معجز طراز کرامت تحریر، محمد تقی متخلص بہ میرؔ، شاعرِ درست، انواعِ شعر را بہ شستگی و رنگی سرانجام دہد۔'' [۳]

لچھمی نرائن شفیقؔ ''چمنستانِ شعراء'' میں رقمطراز ہیں:

> ''اکبر آبادی، میرِ میدانِ سخنوری و شہنشاہِ اقلیمِ معنی پروری است، اشعۂ آفتابِ کمالش در منبع الفاظ بہ نہایت درخشانی پیدا، ولمعۂ ماہتابِ معنیش بشب عمارت بکمال تابانی ہویدا..........

مضامینِ رنگین می سازد۔ بزاران معنی بیگانہ جنابش............
پُرفرحت می دہد کمیابش۔ نقطۂ طبع زادش چوں در رخِ عزیز ومحترم
وحرفِ رقم زد قلمش مثالِ زرِ سفید رائج عالم۔'' ۴

قدرت اللہ شوقؔ کی میرؔ کے بارے میں رائے ہے کہ:

''شہ سوارِ سمندِ عرصۂ فصاحت، فارسِ مضمارِ بلاغت، مجمع قابلیت وہنر
صاحبِ طبع وخوش فکر، سرآمدِ مستعدانِ عصر، محاورہ دان ومتین، متلاشی
مضامین رنگین، متجسس الفاظ چرب وشیریں۔ ھرچند سادہ گواست
اما در سادہ گوئی، تہہ داری وپرکاری او ظاہر ونمودار است۔'' ۵

میر حسنؔ کے خیال کے مطابق:

''رفعتِ رواقِ کاخِ بیانش از طاقِ سپہر برتر، وگوہر کانِ ضمیرش
از جوہرِ مہر عالی گوہر۔ فکر عالیش درعینِ خوش آبی وطبعِ روانش
بہ نہایت شادابی۔ چراغِ نثرش روشن و ساحتِ نظمش گلشن۔
شعرش چوں درِخوش آب و اندازِ سخنش بے حساب صیقل
ذکائے او زنگ زدائے آئینۂ خورشید، پیشِ ضیائے اُو روئے
رخشانِ ماہ سفید۔'' ۶

''تذکرۂ شورش'' (رموز الشعراء) میں غلام حسین شورشؔ نے انھیں شاعرِ بےنظیر تو کہا ہے لیکن
سیادت کے متعلق لکھتے ہیں:

''پس ایشاں برائے استحکامِ سیادت کاذبہ خود میرؔ تخلص
نمودہ اند۔'' ۷

امیر الدین امر اللہ نے تذکرہ ''مسرت افزاء''، ''نکات الشعراء'' اور میرؔ کی ذات کے نقائص
بیان کرنے کے لیے لکھا۔ میرؔ کے بارے میں اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ فطرتاً مغرور اور سب شاعروں کی
عیب جوئی کرتے تھے۔ ''نکات الشعراء'' میں انھوں نے شاعروں کا ذکر تحقیر اور بے دلی سے کیا ہے اور جو
شعر منتخب کیے ہیں وہ بھی ناپسندیدہ اور بے رتبہ ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس تذکرے میں اپنے جن

اشعار کا انتخاب کیا ہے وہ بھی اکثر و بیشتر ناپسندیدہ اور بے رتبہ ہیں لیکن اتنی مخالفت کے باوجود میؔر کے بارے میں ان کے ہاں یہ جملہ بھی ملتا ہے:

''محمد تقی۔ میدانِ سخن کے میؔر اور اس فن کے شیرِ نیستاں۔'' ۸

میؔر کی غزل گوئی کے بے مثل ہونے کے بارے میں مردان علی خان مبتلؔا ''گلشنِ سخن'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ذکاء ذہن و علو فطرت و درستی نظم و صفائے فکرت از کلام دل نشین مبرہن و ہویداست۔ الحق دریں زمان سرآمد ریختہ گویان می توان شمرد۔ از اقسام فنون سخن گستری در غزل گوئی بے مثل واحدے را مجال نیست کہ دم از ہمسری او تواند زد۔''

''تذکرہ ہندی گویاں'' میں غلام ہمدانی مصحفؔی، میؔر و مرزا کا تقابل اس انداز سے کرتے ہیں:

''اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کند و مرزا را در ہجو و قصیدہ بر و فضیلت می دہد، غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ برو مسلم است۔'' ۹

اس کے علاوہ مصنف نے میؔر کے بارے میں جو معلومات دی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ اس وقت ان کی عمر اسّی سال ہے اور ان کے چار دیوان ریختہ کے اور ایک دیوان فارسی کا، متعدد مثنویاں اور شکارنامہ ہے۔

''تذکرہ عقدِ ثریا'' از غلام ہمدانی مصحفؔی میں مصنف نے میؔر کو متوکل انسان قرار دیا ہے جس نے مالداروں کے آگے اپنا ہاتھ کبھی نہیں پھیلایا لیکن شاعر اور عمائدینِ سلطنت ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ وہ اُس زمانے میں کسی کو اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے تھے، عزیز و اقارب آپ کو کج خلق، مغرور، خود پسند اور غیر منصف سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کے متعلق مصنف کی رائے ہے کہ:

''ابتدائے سخن گوئی سے ریختہ ہی کے لیے مشہور ہیں۔ فارسی شاعری کا کچھ ایسا دعویٰ نہیں کرتے گر چہ فارسی کا کلام بھی ریختہ سے کم نہیں کہتے تھے۔'' ۱۰

''گلشنِ ہند'' مرزا علی لطفؔ کی تصنیف ''گلزارِ ابراہیم'' از علی ابراہیم خاں کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے لیکن انھوں نے اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کیے ہیں۔ اس تذکرہ کے مطابق میرؔ ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ گئے۔ غزل میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے جب کہ قصیدہ میں سوداؔ کمال رکھتے ہیں۔ میرؔ کی مثنوی بھی لوگ پسند کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق:

> ''اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔'' ۱۱

''گلشنِ ہند'' میں حیدر بخش حیدری نے شاعروں کا حال انتہائی اختصار سے بیان کرتے ہوئے میرؔ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''میرؔ تخلص نام میرؔ محمد تقی، اکبرآباد کے رہنے والے فخرِ شاعرانِ ہند، نظم خوب کہتے تھے۔'' ۱۲

اعظم الدولہ سرورؔ ''عمدۂ منتخبہ'' میں میرؔ کی تعریف و توصیف کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ:

> ''تعریف اشعارش محتاج بہ شرح و بست نیست، مہارتے تمام در فصیح گوئی و فنونِ شاعری دارد، و بلند تلاشانِ ایں فن شاعر مسلّم الثبوت می شمارند، و بہ استادی او قائل اند، وضع دردیۂ شعرگوئی بہ نہجے کہ دارد کسے را میسر (نہ) شدہ است بسیار عزیزاں تلاش تتبع ذہاں او کردند لیکن بہ آں نہ رسیدند۔'' ۱۳

''مجموعۂ نغز'' قدرت اللہ قاسمؔ کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میرؔ کو مغرور اور متکبر لکھا ہے، کیونکہ بقول ان کے وہ شیخ سعدیؔ کے کلام پر بھی داد نہیں دیتے تھے اور ولیؔ جیسے عظیم شاعر کے بارے میں لکھا کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور ہے لیکن اس کے باوجود وہ میرؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''محمد تقی میرؔ [شا] عرے است بے [نظیر] وسخن سنجے است خوش تقریر عندلیب خوش نوائے باغ فصاحت بلبلِ ہزار داستان

گلزارِ بلاغت شیر بیشہ سخنوری ہزبر صحرائے ہنر گستری شہسوار
عرصۂ سخن طرازی فارس مضمار نکتہ پردازی جادو کلام معانی آفریں
سحر بیان صنائع بدائع آگین میر اقلیم شیریں زبانی دبیر قلمرو
عذب البیانی طرزِ گفتارش بے بدل اندازِ اشعارش ضرب المثل
زعم بعضے آں کہ سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سوداؔ
در غزل گوئی سخن بوئے نرسانیدہ اما حق آنست کہ:

ع ہر [گلے] را رنگ و بوے دیگر است

مرزاؔ دریائے است بیکراں و میرؔ نہرے است عظیم الشان
در معلومات قو[اعدفن] میرؔ بر مرزاؔ برتری است و در قوتِ شاعری
مرزاؔ را بر میرؔ سروری۔" ۱۴

محمد حسین آزادؔ نے "آبِ حیات" لکھتے وقت اسی تذکرے سے مدد لی ہے۔ مصنف نے جہاں پر میرؔ کی شاعری کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے وہاں پر انھیں شخصی حوالے سے تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے بددماغ اور دیگر شعراء کے بارے میں ان کے ناروا رویّے کا ذکر بھی کیا ہے۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ "گلشنِ بے خار" میں معتدل رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رشحۂ قلمش در شگفانیدنِ گل ہائے مضامین تازہ ہم رنگِ ابر
نو بہار صد آہِ دردناک بہ تاثیر یک مصراع او نیست............
از اقسامِ شاعری در قصیدہ فکرِ خوشے نہ داشتہ، چندان کہ غزلش
بلند مرتبہ تر است، ہم چنیں قصیدہ اش پست پایہ تر۔" ۱۵

تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" سعادت خان ناصرؔ کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے اور میرؔ کے حوالے سے ایسے واقعات کا اندراج کیا ہے جن سے ان کی خودسری اور بدمزاجی واضح ہوتی ہے:

۱۔ جب میرؔ لکھنؤ جانے لگے تو جس گاڑی پر گئے، ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے بات تک نہ کی۔

۲۔ مرزا مغل سبقتؔ نے جب میرؔ سے شعر کہنے کی فرمائش کی تو انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کے بشرہ سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ ایک دن شاہ قدرت اللہ قدرتؔ کے ساتھ کشتی پر سوار تھے۔ انھوں نے شعر سنا کر داد چاہی تو میرؔ نے کہا: دیوان کو دریا میں ڈال دو۔

۴۔ عمادالملک نواب غازی الدّین خاں دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ دریا میں سیر و تماشے کے واسطے مرغانِ آبی بط و سرخاب بھی تھے۔ میرؔ اتفاقاً ادھر آ گئے۔ نواب نے چند قصیدے پڑھے اور داد چاہی لیکن میرؔ نے کہا کہ ہر بط کو آپ کے شعر پر وجد ہے، میری داد کی کیا ضرورت ہے۔

۵۔ ایک دن نواب آصف الدّولہ بہادر دواوین کا مطالعہ کر رہے تھے۔ دیوان کی ایک جلد ان سے دُور پڑی تھی اور یہ جلد میرؔ سے قریب تھی۔ انھوں نے کہا مجھے دیوان کی جلد اُٹھا دیجیے۔ میرؔ نے خود دیوان کی جلد اُٹھا کر نہ دی بلکہ ایک خادم سے کہا کہ سنو تمہارے آقا کیا کہتے ہیں؟ نواب کو یہ بات ناگوار گزری اور کتاب خود اُٹھا لی۔ اس کے بعد جب رفیع سوداؔ کے بارے میں نواب نے کہا کہ شاعر مسلّم الثبوت ہے تو اس کے بعد میرؔ نے کہا:

''ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است''

اس پر نواب اور ناراض ہو گئے۔

صاحبِ تذکرہ میرؔ کے عشق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آخر آخر میرؔ صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا اور صورت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائینہ ہونے لگی۔'' ۱۶

قطب الدّین باطنؔ ''گلستانِ بے خزاں'' میں میرؔ کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں:

''اوستادِ اساتذہ جدید و قدیم جن کے سب شاعر معتقد ہیں جو جاہل ان کی نسبت الفاظ اہانت لکھے، اوس سے گفتگو فصاحت،

خادمہ کلکِ جادونگار، بلاغت کنیز، خامہ طوبیٰ اطوار محاورات، روزمرہ غاشیہ بردار، طبع شوخ گہربار، مضمون عاشقانہ، سحابِ فکر سے ترشح کرتے ہیں۔ نباتاتِ کیمیا خصلت مرزبوم شعر میں نشوونما پر اوترتے ہیں۔ اہتزازِ نسیم طبع نے وہ گل ہائے بوقلموں کھلائے جن کی نکہت سے شام سیاران انجم سے ہو جائے۔۔۔ زبانِ گویا کا کام نہیں کہ ان کے لب و لہجہ کے روبرو گفتگو کرے۔'' ۱۷

''طبقات الشعرائے ہند'' میں کریم الدّین رفیلن کی میرؔ کے بارے میں رائے ہے کہ:

''شعر اوسکا تمام شعراء سابقین اور متاخرین سے بے شک بہت اچھا ہے۔ تمام فنونِ نظمیہ وہ جانتا تھا۔ خصوصاً غزل اور مثنوی اوسکے سب سے بہتر ہے۔آج کے زمانے تک تمام شعراء اوسکے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے۔ یہ شاعر واقع میں ایسا ہی ہے کہ اگر اوسکو بادشاہ شعراء کا کہیں تو بجا ہے۔۔۔ میرؔ کا قصیدہ اچھا نہ ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی میں سوداؔ کو میرؔ پر فوقیت ہے اور غزل میں میرؔ کو سوداؔ پر۔'' ۱۸

سیّد محسن علی تذکرہ ''سراپا سخن'' میں میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرؔ سخنور بے نظیر میر تقی مغفور، خلف میر عبداللہ خواجہ زادے، ہمشیر زادے اور شاگرد سراج الدّین علی خاں آرزوؔ، باشندۂ اکبر آباد مقیم لکھنؤ۔'' ۱۹

نصر اللہ خاں خویشگی ''گلشنِ ہمیشہ بہار'' میں لکھتے ہیں:

''میرؔ تخلص، سرخیل بلغائے عظام افصح فصحائے کرام شاعر والا مقام در نظم و نثر ذوالاحترام، میر محمد تقی نام مردے ترانہ سنج لطیفہ گو ہمشیرہ زادہ سراج الدّین علی خان آرزو ست اولاً بشاہ جہاں آباد و فارغ البال می بود نوبتے از آں جا بسوئے لکھنو نمود اگر چہ بخرج مایحتاج محتاج

نہ بودہ مگر روزی از خوان احسان نواب وزیر می یافت دہم در آنجا بسر ملک عدم شتافت ایں ابیات از نتائج طبع آں سرآمد سخنوران راست۔" ۲۰

محمد حسین خان نے "ریاض الفردوس" میں انتہائی مختصر رائے ان الفاظ میں دی ہے:

"(میر) تخلص محمد تقی اکبرآبادی مولد، لکھنوی مسکن، فخر شعرائے ماتقدم وتاخر۔" ۲۱

تذکرہ "قطعۂ منتخب" کے مطابق میر کے والد کا نام میر عبداللہ ہے اور وہ آرزو کی بہن کے بیٹے تھے۔ عنفوانِ شباب میں دلّی گئے، پھر لکھنؤ جا کر سکونت اختیار کی۔ نواب وزیر کی سرکار سے وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی اور ان کے کلام کے متعلق مصنّف کی رائے یہ ہے:

"سوائے قصیدہ کے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے، خصوصاً مثنوی و غزل گوئی میں لاثانی تھے، اشعار ان کے بغایت مرتبہ رتبۂ بلند رکھتے ہیں۔" ۲۲

عبدالغفور نسّاخ اپنے دوسرے تذکرے "سخنِ شعراء" میں لکھتے ہیں:

"سوائے قصیدہ کے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ فرطِ اشعار حاجت بیان نہیں۔ مثنوی و غزل گوئی میں اوستادِ مسلّم الثبوت گزرے۔ اُن کی اوستادی سے کسی کو انکار نہیں۔ جو درد ان کے کلام میں ہے کسی ریختہ گو کے کلام میں نہیں۔" ۲۳

کلب حسین نادر "تذکرۂ نادری" میں میر کی جو تصویر پیش کرتے ہیں، وہ اس طرح سے ہے:

"مستند شعرائے ماضی و حال استاد عدیم المثال سیّد محمد تقی اکبرآبادی شاگرد و خواہرزادہ سراج الدّین علی خان آرزو۔" ۲۴

"بزمِ سخن" میں سیّد علی حسن خان کے خیال کے مطابق مثنوی اور غزل میں میر کی مثال نہیں ملتی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اوستادِ مسلّم الثبوت بودہ است۔ کسے را از وے انحرافی نیست، خسروے اقلیم سخنوری و سخندانی ست و موجود الفاظ و معانی

چمن آرائی گلشنِ سخن است و بہار افزائے گلبن فن در جمیع
اصنافِ سخن جز بہ قصیدہ قادر بود علی الخصوص در مثنویات وغزلیات
نظیرے نداشت۔" ۲۵

بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرے "سفینۂ ہندی" میں میرؔ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ یہ ہیں:

"ہمشیرزادۂ خان آرزو مغفور است، مولدش شاہجہان آباد است،
بعد تحصیلِ علوم رسمی رغبت ریختہ گوئی پیدا کردہ، تذکرہ متضمنِ
احوالِ شعرای ریختہ گو تالیف نمودہ، در ہر ہفتہ روزی بخانۂ او
مجمع ریختہ گویان مشاعرات ایشاں میشد، اواخر در شعر فارسی ہم
مہارتی بہم رسانیدہ گاہی میگفت، در ریختہ گوئی باستادی نام بر
آوردہ، در عہدِ نواب آصف الدّولہ بہادر مرحوم وارد لکھنؤ شدہ،
بہ دوصد روپیہ در ماہہ ممتاز شد، راقم او را یکدو مرتبہ دیدہ ام، بسیار
آرمیدہ مزاج و پسندیدہ اطوار است، و دریں ایام ذاتِ او از
معتمدان روزگار است۔" ۲۶

یہ تذکرہ فارسی شعراء کا ہے۔ اس میں میرؔ کو فارسی شعراء میں شامل کرتے ہوئے ان کے صرف فارسی کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ اس تذکرے کے حوالے سے میرؔ کی انفرادیت ہے جب کہ عام طور پر میرؔ کو اُردو شعراء کے تذکروں میں شامل کرتے ہوئے ان کا صرف اُردو کلام ہی منتخب کیا گیا ہے۔

"مرآۃ الشعراء" محمد یحییٰ تنہاؔ کا تذکرہ ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی درج کرتے وقت انھوں نے "ذکرِ میر" کو مدِّ نظر رکھا ہے اور ان واقعات سے اتفاق کیا ہے جو "ذکرِ میر" میں درج ہیں۔ وہ میرؔ اور دردؔ کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خواجہ میر دردؔ ایک صوفی صافی تھے۔ ان کا کلام بھی بے شک
پُردرد ہے مگر میرؔ جو ہمہ تن درد تھے اور تصوّف سے کچھ تعلق نہ
رکھتے تھے، اپنے اشعار سے لوگوں کو تڑپا دیتے تھے۔" ۲۷

انھوں نے میرؔ کا شمار اُردو شعراء کے تیسرے طبقے میں کیا ہے۔ میرؔ کی غزل کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''آپ اُردو کے غزل گوشعراء میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں جو سادگی اور درد و اثر آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے اس کی تلاش دوسری جگہ بے سود ہے۔'' ۲۸

میرؔ کی بہ حیثیت غزل گو تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان کے کلام میں رطب و یابس کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کا کلام رطب و یابس سے پر ہے اور بعض غزلیں تو ایسی ہیں جن میں ایک شعر بھی شعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ان کے تقریباً چودہ ہزار اشعار میں سے صرف ایک ہزار اچھے شعر ہیں اور ایک ہزار معمولی۔ بے شک:

''ان کا منتخب کلام جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے لیکن ان کا ادنیٰ کلام خذف سے بدتر ہے۔'' ۲۹

میرؔ کے ہاں لفظوں کا استعمال موقع کے مناسبِ حال ہوتا ہے اور ہمارے ہاں رائج تراکیب جو غالبؔ سے منسوب ہیں۔ اگر ''کلیاتِ میرؔ'' پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تراکیب میرؔ پہلے استعمال کر چکے ہیں:

ع کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ : غالبؔ

ع کاو کاوِ مژۂ یار و دلِ زار و نزار : میرؔ

لیکن بعض تراکیب میرؔ کے ہاں ایسی ہیں جو قبولِ عام کی سند حاصل نہ کر سکیں۔ ان کے ہاں بعض الفاظ مذکر پائے جاتے ہیں جب کہ آج کل لوگ ان کو مؤنث باندھتے ہیں اور بعض الفاظ جو میرؔ نے مؤنث باندھے ہیں آج کل مذکر بولے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں متروک الفاظ و محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے:

؎ جب سرِ راہ آوے ہے وہ شوخ
ایک عالم کا جان جاتا ہے (جان۔۔۔مذکر)

ؔ ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی (ثانی۔۔۔مؤنث)

ؔ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (ٹک: متروک)

میرؔ نے محاورات اور ضرب الامثال کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے:

ؔ مر گیا کوہکن اسی غم میں
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

انھوں نے ہندی الفاظ کا بھی خوب استعمال کیا ہے:

ع اس کی گلی میں جا کر کس رات میں نہ کوکا

لیکن میرؔ نے اس وقت کے لب و لہجے سے خاص دلّی کی زبان کا تتبع کیا ہے جس پر انھیں فخر تھا۔ انھوں نے شیخ کی بُری طرح خبر لی ہے جس سے اُن کی بدمذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کئی اشعار میں رکاکت موجود ہے:

ؔ شیخ کی سی شکل ہے شیطان
جس پہ شب احتلام ہوتا ہے

میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں لیکن ان کے قصیدے پھیکے ہیں۔ مثنوی میں میرحسن ان سے بہتر ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود:

> ''میرؔ صاحب نے جس سلاست اور روانی کے ساتھ اپنے مطالب کو ادا کیا ہے اور اپنے اشعار میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس کی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے۔'' ۳۰

خان آرزوؔ کے برتاؤ کی وجہ سے ان میں نازک مزاجی اور بدماغی پیدا ہوئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نواب آصف الدّولہ کی خوشامد کی۔

''مرقعِ شعراء'' ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مرتب کیا ہے لیکن اس پر مصنّف کا نام اور سالِ اشاعت درج نہیں۔ اس کے مطابق:

> ''کلامش منیع، خیالات او رفیع مگر از بسکہ دماغش نازک افتادہ۔۔۔ سیادت او داد میرزا منشی۔۔۔ معرکۂ سخن چینی او دمبدم تازہ، و مطاعن اہلِ زمان درحق اُو بلند آوازہ۔ شورش کلام اوفتنہ خوست، اژدرنامہ گواہ اوست۔ لآلی اشعار آبدارش منتشر و ہمہ ہارا پیش نظر۔'' ۳۱

''تذکرہ شعرائے اُردو'' کے مصنّف اصغر حسین خاں نظیرؔ لدھیانوی کے خیال کے مطابق میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ آرزوؔ سے انھوں نے غزل میں فیض اُٹھایا جو ان کے دُور کے رشتہ دار تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق:

> ''غزل میں میرؔ کا جواب نہ اس عہد میں تھا نہ آج تک پیدا ہوا۔ غزل میں میرؔ کا لوہا ہر اُستاد نے مانا ہے۔ میرؔ کی غزل میں سوز، درد، تڑپ اور حسرت و یاس کے مضامین کی افراط ہے۔'' ۳۲

میرؔ کی زبان سادہ اور ہندی کے قریب ہے ان کی بعض غزلوں کے اوزان بھی ہندی ہیں۔ مصنّف نے میرؔ کے قصائد کو بالکل نظرانداز کیا ہے۔ اگرچہ انکے قصائد، سوداؔ کے قصائد جتنا درجہ نہیں رکھتے لیکن پھر بھی قابلِ توجہ ضرور ہیں۔

''تذکرۂ نادری'' میں کلب حسین نادرؔ نے میرؔ کے بارے میں صرف یہ جملہ لکھ کر پانچ اشعار کی ایک غزل شامل کر دی ہے:

> ''مستند شعرائے ماضی و حال، استاد عدیم المثال سیّد محمد تقی اکبر آبادی شاگرد و خواہرزادہ سراج الدّین علی خان آرزو۔'' ۳۳

''آبِ حیات'' تذکرہ نگاری کی روایت کی آخری کڑی کہی جا سکتی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے

جس نے تذکرہ نگاری کی مروّجہ روایت کو ادب کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اس کتاب نے ادبی تاریخ نگاری کے بنیادی خدوخال مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ سوانح، تنقید اور لسانی تحقیق کے شعبوں کو بھی متعارف کرایا۔ اس لیے:

> ''آبِ حیات، اُردو کی پہلی تصنیف ہے جسے ''تذکرۃ الشعراء'' کے ساتھ ساتھ ہم ادبی تاریخ، ادبی سوانح، ادبی تنقید اور لسانی تحقیق کا اوّلین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔'' ۳۴

''آبِ حیات'' کے مصنف محمد حسین آزادؔ نے میرؔ کی شاعری پر اچھی خاصی بحث کی ہے۔ اگرچہ یہ بحث مکمل تنقید نہیں ہے لیکن میرؔ شناسی کی طرف ایک اہم قدم ضرور ہے۔ میرؔ کی غزل کے متعلق آزادؔ لکھتے ہیں:

> ''غزل اصولِ غزلیت کے لحاظ میں سوداؔ سے بہتر ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذّت بخشتا ہے۔'' ۳۵

میرؔ کے ہاں ذات اور کائنات کے غم نے جوش اور شگفتگی کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں پُرشکوہ الفاظ، بندش کی چستی، مطالب کی دقّت اور مضامین کی بلند پروازی نہیں، یہ اوصاف قصائد کے لیے لازمی ہیں۔ اسی وجہ سے میرؔ کے قصیدے، سوداؔ کے مقابلے میں تعداد میں بھی کم اور درجے میں بھی کم ہیں۔ ان کی مثنویاں اچھی ہیں لیکن یہ مثنویاں ان کی غزل کے معیار کی حامل نہیں ہیں۔ واسوخت اُردو ادب کے لیے شاعری کی ایک نئی صنف تھی۔ میرؔ کو اُردو میں واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے بعد میں سیکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے لیکن آج تک واسوخت میں ان کے پائے کا کوئی شاعر نہیں۔ ان کے واسوخت کی یہ اہمیت خیالات اور اندازِ بیان کی انفرادیّت کی وجہ سے ہے۔ مخمّس کی صنف کو انھوں نے شہر آشوب اور مناقب کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان شہر آشوبوں میں جن لوگوں کے نام آئے ہیں ان کی برائی یا بے جا تعریف نہیں کی گئی البتہ جو مخمّس مناقب میں ہیں ان میں حسنِ اعتقاد کی جھلک نمایاں ہے۔

میرؔ کی زبان کے بارے میں آزادؔ کی رائے ہے کہ:

> ''میرؔ صاحب کی زبان، شستہ کلام، صاف بیان، ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔'' ۳۶

''نکات الشعراء'' کے حوالے سے آزادؔ نے لکھا ہے کہ میرؔ نے ایک ہزار شاعروں کا حال لکھا ہے لیکن ان کی تنقید سے کوئی بھی بچ نہ سکا۔ جب کہ ولیؔ کے بارے میں بھی انھوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ ایسا شاعر ہے جو شیطان سے زیادہ مشہور ہے۔

ادبی تذکروں میں میرؔ شناسی کے صرف ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ تذکرے ایک روایت کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں، اس زمانے میں تحقیق اور تنقید کی یہی صورت تھی۔ تذکرہ نگاری کی روایت ''نکات الشعراء'' ۱۷۵۲ء سے لے کر ''آبِ حیات'' ۱۸۸۰ء تک رہی۔ اس روایت کے تحت لکھے جانے والے تذکروں میں زیادہ تر تذکرے ایسے ہیں جن میں میرؔ کا ذکر شامل ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت میں دو زبانوں کا سہارا لیا گیا:

۱۔ فارسی

۲۔ اُردو

تذکرے خواہ اُردو شعراء کے لکھے گئے لیکن ان کے حالاتِ زندگی اور کلام پر رائے فارسی زبان میں دی گئی۔ اُردو زبان میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں، ان کی تعداد فارسی زبان میں لکھے جانے والے تذکروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ میرؔ کے بارے میں ان ادبی تذکروں کی آراء کو جب دیکھا جاتا ہے تو تین قسم کے واضح رویّے ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ توصیفی رویّہ

۲۔ معاندانہ رویّہ

۳۔ معتدل رویّہ

توصیفی رویہ اختیار کرنے والے تذکرہ نگاروں میں قیام الدین قائمؔ، لچھمی نرائن شفیقؔ، قدرت اللہ شوقؔ، میر حسن، مردان علی خان مبتلاؔ، اعظم الدولہ سرورؔ، قطب الدین باطنؔ، محمد حسین خاں، کلب حسین نادرؔ اور بھگوان داس ہندی شامل ہیں۔

توصیفی انداز کے حامل تذکروں کے ساتھ ساتھ میرؔ کی مخالفت میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ ان تذکروں میں دی گئی رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نگاروں کا میرؔ کے بارے میں رویہ معاندانہ ہے۔ میرؔ کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنے والے تذکرہ نگاروں میں غلام حسین شورشؔ، امیر الدین امر اللہ، قدرت اللہ قاسمؔ اور سعادت خان ناصرؔ شامل ہیں۔

میرؔ شناسی میں توصیفی اور معاندانہ رویے کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاروں نے کسی حد تک معتدل رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ طبقہ ایسے تذکرہ نگاروں کا ہے جنھوں نے میرؔ کے کلام کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان تذکرہ نگاروں میں غلام ہمدانی مصحفیؔ، علی ابراہیم خاں، مرزا علی لطفؔ، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، کریم الدین رفیلن، سید محسن علی، مولوی عبدالغفور نساخؔ، سید علی حسن خان، محمد یحییٰ تنہاؔ، اصغر حسین خان نظیرؔ لدھیانوی اور محمد حسین آزادؔ شامل ہیں۔

ادبی تذکرہ نگاری کی پوری روایت میں میرؔ کے بارے میں فراہم کردہ معلومات اور کلام کے بارے میں تنقیدی رویہ مکمل تحقیقی اور تنقیدی معیار پر پورا نہ بھی اُترے تو یہ چند بنیادی معلومات کی فراہمی کا بہترین نمونہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

ادبی تذکرے جو توصیفی رجحان کے تحت لکھے گئے، ان میں میرؔ کے کلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تعریفوں پر مبنی ہے اور بڑی حد تک کوشش کی گئی ہے کہ ان کے کلام کے بارے میں کوئی ایسا جملہ نہ لکھا جائے جو ان کے کلام کی قدر و قیمت کم کرنے کا سبب بنے۔ توصیفی رویے کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاری کی روایت میں ایک معاندانہ رویہ بھی سامنے آیا۔ ایسے تذکروں میں میرؔ کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار کیا گیا جس سے ان کی تحقیر مقصود تھی لیکن سب سے اچھا انداز ان تذکروں کا تھا جن میں میرؔ کی ذات اور کلام کے بارے میں معتدل رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو کسی حد تک ان کی بہتر صورت کو ہمارے سامنے لانے میں کامیاب رہی۔

تذکرہ نگاری کی روایت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میرؔ کی ذات کے حوالے سے جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ میرؔ، اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔
۲۔ میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ اور علی متقی دونوں لکھے گئے ہیں لیکن زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے علی متقی سے اتفاق کیا ہے۔
۳۔ شاعری میں سراج الدّین علی خان آرزوؔ نے ان کی معاونت کی۔
۴۔ وہ متوکل انسان تھے۔
۵۔ وہ اس زمانے میں کسی کو اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔اس وجہ سے عزیز و اقارب انھیں مغرور، خود پسند اور غیر منصف سمجھتے تھے۔
۶۔ میرؔ، ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ گئے۔
۷۔ کئی تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی سیادت پر شک کیا ہے لیکن اکثر تذکرہ نگار انھیں سیّد ہی لکھتے ہیں۔
۸۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

ایسے تذکرے جن میں میرؔ شکنی کا انداز اختیار کیا گیا ہے، ان کے مطابق:

۱۔ میرؔ، سیّد نہ تھے۔
۲۔ وہ فطرتاً مغرور اور سب شاعروں کی عیب جوئی کرتے تھے۔
۳۔ ''نکات الشعراء'' میں انھوں نے جن شعراء کا ذکر کیا ہے، وہ بے دلی سے کیا ہے اور ان کا انتخابِ کلام بھی معیاری نہیں۔حتیٰ کہ اپنا انتخابِ کلام بھی ناپسندیدہ ہے۔
۴۔ وہ خودسر اور بدمزاج تھے۔

میرؔ کی شاعری کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں کی آراء کو اگر سامنے رکھا جائے تو ان کی فنی تصویر کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ کی طبیعت معنی ایجاد تھی۔

۲۔ ان کی شاعری شگفتگی اور رنگینی کی حامل ہے۔

۳۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت ہے۔

۴۔ ان کی سادہ گوئی بھی تہ داری اور پرکاری کی حامل ہے۔

۵۔ میؔر غزل اور مثنوی میں مرزا سوؔدا سے بہتر جب کہ قصیدہ اور ہجو میں مرزا سوؔدا ان سے بہتر ہیں۔

۶۔ ان کا دردیہ شعر گوئی کا انداز کسی اور کو میسر نہیں۔

۷۔ ان کی شاعری نکتہ پردازی، معنی آفرینی، سحر بیانی اور صنائع بدائع کی حامل ہے۔

۸۔ ان کے کلام میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ مطالب کی ادائیگی کمال درجے کی ہے۔

۹۔ ان کی غزل میں سوز، درد، تڑپ اور حسرت و یاس کے مضامین کی افراط ہے۔

۱۰۔ ان کی زبان سادہ اور ہندی کے قریب ہے۔ اس میں فارسی تراکیب اور بندشیں کم ہیں۔

تذکرہ نگاری کی روایت باقاعدہ تنقید نگاری کی روایت نہیں تھی بلکہ یہ بیاض نگاری کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ اس روایت کے تحت جہاں پر شعراء کا کلام منتخب کیا گیا وہاں پر ان کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ جب تذکرہ نگاری کی روایت آگے بڑھی تو چند جملوں میں شاعر کی زندگی اور کلام کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش کسی شاعر کی زندگی یا فن کی مکمل تصویر پیش کرنے میں تو ناکام رہی لیکن اس نے قاری کو شاعر کا ہلکا سا شخصی اور فنی خاکہ ضرور فراہم کر دیا۔ اسی روایت کے ہیولے سے آنے والے دور میں تنقید نگاری نے فیض اُٹھایا اور شعراء کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تصاویر میں خوبصورت رنگ بھرا گیا۔ تذکرہ نگاری کی روایت جدید تنقیدی انداز آنے سے اگرچہ ختم ہوگئی لیکن جدید تحقیقی اور تنقیدی انداز کو پروان چڑھانے میں اس روایت نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

میؔر شناسی کے حوالے سے تذکرہ نگاری بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ اسی روایت نے میؔر کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ یہ معلومات زمانی اعتبار سے ان کی زندگی کے قریب ترین ہیں

اس لیے ان کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر چہ زمانہ قریب میں قائم ہونے والی آراء میں ایسی آراء بھی شامل ہوتی ہیں جو ذاتی مخالفت کی بنیاد پر مبنی ہوتی ہیں اور کسی شخص کی صحیح تصویر پیش کرنے کے بجائے اس کو غلط انداز میں پیش کر سکتی ہیں لیکن ایسی آراء کو تحقیقی اور تنقیدی انداز سے پرکھنے کے بعد صحیح صورتِ حال تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میرؔ کی ذات اور فن کے بارے میں سامنے آنے والی آراء میں ذاتی مخالفتیں اور ہمدردیاں شامل ہیں۔ اسی وجہ سے تذکروں میں جہاں پر میرؔ کی ذات اور فن کے حوالے سے توصیفی انداز اختیار کیا گیا ہے وہاں پر مخاصمانہ رویّہ بھی بڑا واضح ہے۔

اُردو شعراء کے تذکروں کی روایت میرؔ کی اپنی زندگی میں شروع ہو گئی تھی اس لیے ہم ان تذکروں کی سرسری رائے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ میرؔ اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے اور تذکرہ نگار ان کے فن اور زندگی سے واقف بھی تھے۔ ان تذکروں میں چونکا دینے والی متضاد آراء یہ ہیں:

۱۔ میرؔ کے والد کا نام محمد علی، علی متقی، اور عبداللہ لکھا گیا ہے۔ محمد علی اور علی متقی کو اگر ہم مختلف دلائل کی روشنی میں ایک نام تسلیم کر بھی لیں تو عبداللہ کے بارے میں ہم کیا فیصلہ کریں۔ بے شک اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے والد کا نام محمد علی درست تسلیم کیا ہے لیکن پھر بھی چند ایک نے ہی سہی، عبداللہ لکھا تو ہے۔ یہ سہوِ کاتب تو ہے نہیں پھر میرؔ کے والد کا نام میرؔ عبداللہ لکھنے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔ میرؔ شناسی کی روایت میں بے شک اس بات کو تو ثابت کرنے کی بڑی کوششیں ہوئی ہیں کہ میرؔ کے والد کا اصل نام محمد علی تھا اور پرہیز گاری کی بنیاد پر انھیں علی متقی کے نام سے پہچانا جاتا تھا لیکن میر عبداللہ نام لکھنے کے اسباب کی نشاندہی کرنے کی کوشش میرؔ شناسوں کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اگر یہ غلطی سے لکھا گیا ہے تو پھر اس غلطی کی نشاندہی کرنا بھی ضروری ہے تا کہ ایک عظیم شاعر کے بارے میں پائی جانے والی بنیادی غلطی دُور ہو سکے۔

۲۔ میرؔ کی سیادت کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں کی آراء مختلف ہیں۔ بے شک اکثر تذکرہ نگار میرؔ کو سیّد ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی زمانے میں تذکرہ نگاروں

نے میر کو سیّد ماننے سے انکار کیا ہے۔ اگر میر سیّد تھے تو ان وجوہات کو مکمل طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے جن کی بنیاد پر اسی زمانے میں میر کو ذاتی حوالے سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

۳۔ میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اردو شاعروں کا اوّلین تذکرہ تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس تذکرے کے بارے میں بھی متضاد آراء سامنے آئی ہیں۔ خاص طور پر شعراء کی تعداد کے حوالے سے متداول نسخے کو سامنے رکھا جائے تو بہت زیادہ فرق ہے۔ اس کے علاوہ اس تذکرے میں شامل شعراء کے حوالے سے بھی متداول نسخے اور ممکنہ نسخے میں شامل شعراء کے بارے میں رائے میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ اگر متداول نسخے سے پہلے ''نکات الشعراء'' کا کوئی ایسا نسخہ موجود تھا جس نے محمد حسین آزاد کو ''آبِ حیات'' لکھتے وقت بھی معلومات فراہم کی ہیں تو وہ اپنی اصل شکل میں کہاں پر موجود ہے۔ میر کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت جو نسخہ ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک لوگوں کی رہنمائی کرتا رہا، وہ کہاں چلا گیا اور اگر نہیں تو اس قسم کی غلط فہمی نے کہاں پر جنم لیا اور اس کی وجوہات کیا تھیں۔ ''نکات الشعراء'' کے بارے میں بھی تذکرہ نگار تضاد کا شکار رہے ہیں اور بعد میں آنے والے میر شناس بھی مجموعی طور پر اپنی حتمی رائے قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

تذکرہ نگاری کی روایت نے جہاں میر شناسی کے حوالے سے اُن کی زندگی اور فن کے متعلق بنیادی معلومات فراہم کر کے میر کی زندگی اور فن کو نمایاں کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے وہاں پر اسی روایت نے ہمیں کئی مغالطوں کا شکار بھی کر دیا ہے۔ کیونکہ میر شناسی کی اسی روایت کو مینارۂ نور تصور کرتے ہوئے بعد میں آنے والے میر شناسوں نے کام کیا اور ان آراء کو جو تذکرہ نگاری کی روایت میں شامل تھیں، حوالے کے طور پر پیش کرتے ہوئے میر کی مختلف تصاویر کو ہمارے سامنے پیش کیا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱

۲۔ سیّد فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۳۔ قیام الدّین قائمؔ، مخزنِ نکات، مرتبہ ڈاکٹر اقتداء حسن، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، طبع اوّل ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۱

۴۔ لچھمی نرائن شفیقؔ، چمنستانِ شعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقیٔ اردو دکن، ۱۹۲۸ء، ص ۲۶۱

۵۔ قدرت اللہ شوقؔ، تذکرہ طبقات الشعراء، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۶

۶۔ میر حسن، تذکرہ شعرائے اُردو، بہ تصحیح و تنقید، مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی، انجمن ترقیٔ اردو ہند، دہلی، طبع جدید ۱۹۴۰ء، ص ۱۵۱

۷۔ غلام حسین شورش، تذکرہ شورش (رموز الشعراء)، مرتبہ محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۴۸۹

۸۔ امیر الدّین امر اللہ، تذکرہ مسرت افزاء، ترجمہ عطاؔ کاکوی، عظیم الشان بکڈپو پٹنہ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۹

۹۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ، تذکرہ ہندی گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقیٔ اردو دکن، ۱۹۳۳ء، ص ۲۰۴

۱۰۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ، تذکرہ عقدِ ثریا، تلخیص و ترجمہ عطاؔ کاکوی، عظیم بکڈپو پٹنہ، ۱۹۶۷ء، ص ۳۶

۱۱۔ مرزا علی لطف، گلشنِ ہند، حیدرآباد دکن، ۱۹۰۶ء، ص ۲۱۰

۱۲۔ حیدر بخش حیدری، گلشنِ ہند (تذکرہ حیدری)، اردو دنیا کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۷

۱۳۔ اعظم الدّولہ سرورؔ، عمدۂ منتخبہ، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵۳

۱۴۔ قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز (جلد دوم) مرتبہ محمود شیرانی، نیشنل اکادمی دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۰۔۲۳۱

۱۵۔ نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہؔ، گلشنِ بے خار، مرتبہ کلب علی خاں فائق، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۵۷۱

۱۶۔ سعادت خاں ناصر، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۴

۱۷۔ قطب الدّین باطنؔ، گلستانِ بے خزاں، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۶

۱۸۔ کریم الدّین رفیلن، طبقات الشعرائے ہند، مطبع العلوم مدرسہ دہلی، ۱۸۴۵ء، ص ۱۱۵۔۱۱۶

۱۹۔ سیّد محسن علی، سراپا سخن، تلخیص و ترتیب، اقتداء حسن، اظہار سنز لاہور، ۱۹۷۰ء، ص۹۹

۲۰۔ نصر اللہ خاں خویشگی، گلشن ہمیشہ بہار، مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو کراچی، اشاعت اوّل ۱۹۶۷ء، ص۳۰۶

۲۱۔ محمد حسین خاں، ریاض الفردوس، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل، شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۱۴۱

۲۲۔ مولوی عبدالغفور نسّاخ، قطعۂ منتخب، مرتبہ انصار اللہ نظر، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اشاعت اوّل ۱۹۴۷ء، ص۶۹۔۷۰

۲۳۔ مولوی عبدالغفور نسّاخ، سخنِ شعراء، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص۴۷۹

۲۴۔ کلبِ حسین نادرؔ، تذکرۂ نادری، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص۱۵۴

۲۵۔ سیّد علی حسن خان، بزمِ سخن، مفیدِ عام آگرہ، ۱۸۷۹ء، ص۱۰۹

۲۶۔ بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی، مرتبہ عطاؔ کاکوی، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ بہار، ۱۹۵۸ء، ص۲۰۵۔۲۰۶

۲۷۔ محمد یحییٰ تنہاؔ، مرآۃ الشعراء، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، س۔ن، ص۱۹۳

۲۸۔ ایضاً، ص۱۹۴

۲۹۔ ایضاً، ص۱۹۷

۳۰۔ ایضاً، ص۲۰۶

۳۱۔ م۔ن، مرقع شعراء، مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، دھومی مل دھرم داس دہلی، ۱۹۵۶ء، ص۔ن۔

۳۲۔ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، تذکرہ شعرائے اُردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، بار اوّل ۱۹۵۳ء، ص۵۷

۳۳۔ کلبِ حسین نادرؔ، تذکرۂ نادری، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص۱۵۴

۳۴۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۶۱۰

۳۵۔ محمد حسین آزادؔ، آبِ حیات، مرتبہ تبسم کاشمیری، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۰ء، ص۱۶۹۔۱۷۰

۳۶۔ ایضاً، ص۱۷۲



باب دوم

میرؔ شناسی: عصرِ حاضر میں

مکمل کتب

میؔر شناسی، عصرِ حاضر میں: مکمل کتب

''میؔر شناسی'' نے جب محدودیت سے وسعت کی جانب سفر اختیار کیا تو تحقیقی اور تنقیدی کتب میں میؔر شناسی کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ تحقیقی اور تنقیدی کتب میں سے وہ کتب جو مکمل طور پر میؔر کی ذات اور فن کے حوالے سے لکھی گئیں، ''میؔر شناسی'' میں اہم کردار ادا کرنے میں کامیاب رہیں۔

مکمل کتاب کسی موضوع پر تفصیلات کے اظہار کے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس میں مصنف اپنی رائے قائم کرنے کے لیے مؤثر دلائل اور وضاحتوں کا سہارا لے سکتا ہے۔ اس لیے مکمل کتاب بہترین نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ میؔر پر لکھی جانے والی مکمل کتب نے ''میؔر شناسی'' میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کتب میں ان کی ذات اور فن کے حوالے سے لکھنے والوں نے مدلّل بحث کرتے ہوئے حتمی نتائج تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان مکمل کتب میں سے کسی کتاب میں تو میؔر کی پوری زندگی اور فن کو سمجھا گیا ہے اور کسی کتاب میں ان کی شخصیت اور فن کے چند مخصوص گوشوں کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے جب کہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں میؔر کی کسی تصنیف کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ''میؔر شناسی'' کی کوشش کی گئی ہے۔

اب ہم ''میؔر شناسی'' کے حوالے سے مکمل کتب کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اس جائزے کی روشنی میں ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو تصویر بنتی ہے اس کو واضح کر سکیں:

''نقدِ میر'' ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی ''میؔر شناسی'' کے حوالے سے اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے مختلف مضامین کی مدد سے میؔر کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ میؔر کا رنگِ طبیعت
۲۔ میؔر کا انداز
۳۔ کلامِ میؔر میں فکری عنصر
۴۔ میؔر اور نیرنگِ عناصر

۵۔ میر تقی میؔر اور نقاش کا فن

۶۔ میؔر کے قبولِ عام کی بنیادیں

۷۔ تقلیدِ میؔر یا شارعِ عام

۸۔ غالبؔ۔۔۔ معتقدِ میؔر

۹۔ میؔر و غالبؔ کی چند ہم طرح غزلیں

۱۰۔ میؔر کی مثنوی نگاری

۱۱۔ میؔر کے ادھورے گیت

۱۲۔ میؔر کا ایک نقاد ـــــ محمد حسین آزادؔ

۱۳۔ میں اور میؔر

۱۴۔ میؔر کا احساسِ شہریت

۱۵۔ میکدے میں میؔر

''میؔر کا رنگِ طبیعت'' میں مصنف نے ان کی زندگی کے ابتدائی مؤثرات کا جائزہ لیا ہے۔ جن سے ان کے رنگِ طبیعت کی تخلیق ہوئی ہے۔ ان مؤثرات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ زمانے کے اجتماعی احساسات

۲۔ میؔر کے بچپن، لڑکپن اور زمانۂ شباب کے واقعات

سلطنت اور بادشاہی کی ہیچ مقداری، بے ثباتی کا گہرا احساس، شرفِ انسانی سے بے اعتمادی، تقدیر و توکّل کے متعلق منفی رویّہ، تنہائی اور سکون کی تلاش، سہل انگاری، اعلیٰ ادبی اور جمالیاتی اقدار کا فقدان اور سوقیت کا فروغ ان کے زمانے کے اجتماعی احساسات تھے۔

میؔر کے حالات کا جو جائزہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے لیا ہے، اس کے مطابق میؔر کے والد صوفی تھے۔ خود میؔر حد درجہ غیور اور نازک طبع شخص تھے۔ بے نیازی، استغنا، خودداری اور کم آمیزی ان کی طبیعت کے امتیازی عناصر تھے۔ دردمندی، سوز و گداز اور عاشقانہ تڑپ ان کی خاص صفات تھیں۔ ان کے والد اور چچا ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثرانداز ہوئے۔ ان کے بچپن میں مر جانے کی

وجہ سے عملی لحاظ سے میرؔ میں زندگی سے نباہ کرنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اُبھر ہی نہ سکی۔ ان کے رنگِ طبع میں مریضانہ قنوطیت نہ سہی لیکن یہ زندگی کی ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کے اہل نہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں بے دماغی اور بددماغی دونوں موجود ہیں۔ افسردگی کو اگر دیکھا جائے تو میرؔ کے ہاں افسردگی کا ایک خاص مفہوم ہے۔ جب تک ان کے اندر کی دنیا میں ہلچل رہی، انھیں اپنی افسردگی سے انکار رہا۔ میرؔ کی دردمندی اس غم کی ارتقائی صورت ہے جس نے انسانی فطرت کو کمال بخشا، کیونکہ جس قسم کا میرؔ کا غم تھا:

> ''اس قسم کا غم وسیع انسانی ہمدردی اور اعلیٰ انسانیت میں مبدّل ہوکر نسخۂ کیمیا بن جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر غم عالم گیر اجتماعی شفقت کا وسیلہ اور سرچشمہ بن جاتا ہے۔ غم کی اس اعلیٰ صورت کو میرؔ نے ''دردمندی'' سے تعبیر کیا ہے۔'' [۱]

میرؔ کا غم انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی احساسات کا حامل ہے۔ یہ غم خلوص اور راستی کی وجہ سے یاس کی تلخی کے باوجود ہمت شکن نہیں ہے۔ ان کے ذاتی اور اجتماعی حالات نے ان کو غم پرستی، بے دماغی بددماغی، افسردگی اور دردمندی جیسی صفات کا حامل بنا دیا اور اسی سے ان کا رنگِ طبیعت بنا ہے۔

''میرؔ کا انداز'' میں میرؔ کے طرزِ شعرگوئی پر بحث کرتے ہوئے سچے جذبات، سوز واثر، سادگی، لہجۂ عام، عام انسانی اپیل، موسیقیت اور صناعتی تکمیل کو ان کے انداز کے عناصر قرار دیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات روایتی اور رسمی ہونے کے باوجود بعض موضوعات ایسے بھی ہیں جنھیں صرف ان سے ہی مخصوص کیا جا سکتا ہے جیسے بے کسی اور غم والم۔

مصنف نے میرؔ کے انداز کی مجموعی طور پر نمائندگی کرنے والی جن عام خصوصیات کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ خلوص اور صداقت

۲۔ معمولیات سے دل چسپی

۳۔ لہجۂ عام اور بول چال کا انداز

۴۔ پیرایہ ہائے ادا کی گیرائی اور مانوسیت

۵۔ صوتی محاسن

۶۔ مصوری کا کمال

''کلامِ میؔر میں فکری عنصر'' کے زیرِ عنوان عام خیال کے برعکس میؔر کی شاعری میں فکری عناصر کو دریافت کیا گیا ہے جو کہ غیر مرتب ہیں، کیونکہ ان کے ہاں عقلی تجزیہ صاف اور نمایاں صورتیں اختیار نہیں کرتا۔ میؔر نے مابعدالطبیعاتی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مشاہدات اور مناظر میں پوشیدہ باطنی حقیقتوں کے انکشاف کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے اپنے احساس کو قوانینِ طبعی سے برتر سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں استدلال ناقص ہے۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ہاں سکون بخش حقائق بھی ہیں۔ ان کی عقلیات بے شک محدود سہی لیکن مشاہدات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ حقائق کی تلاش میں وہ عموماً جستجو کی پہلی منزل کے بعد گم سے ہو جاتے ہیں اور انھیں حقیقت تک پہنچنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حقائق کے ادراک کے لیے وہ تصفیۂ باطن کا راستہ اختیار کرتے ہیں نہ کہ عقل و دانش کا۔ لیکن:

> ''میؔر حقائق کی لذت سے بے بہرہ نہیں۔ ان کے یہاں حقائقِ عالیہ
> موجود ہیں مگر شاعرانہ زبان و بیان میں۔'' ۲؎

میؔر نے اپنی شاعری میں خدا، خدا اور انسان کا تعلق، کائنات، موت، انسان کا مقام اس کائنات میں، جیسے موضوعات پر لکھا ہے اور ان موضوعات پر اپنے انداز میں غور وفکر کیا ہے۔

''میؔر اور نیرنگِ عناصر'' میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ میؔر نے کائنات کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور یہ غلط ہے کہ انھوں نے کائنات کی خارجی رنگارنگی کے متعلق آنکھ بند رکھی بلکہ:

> ''میؔر نے مطالعۂ فطرت سے بصیرت حاصل کی ہے اور اس کے
> نتیجے کے طور پر ان کے قلب و دماغ کو وہ روشنی حاصل ہوئی
> کہ انھیں اس جہان کے پردے میں ہر جگہ ایک ''جہانِ دیگر''
> نظر آیا۔'' ۳؎

انھوں نے کیٹس، شیلے، ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کی طرح نیچرل شاعری نہیں کی لیکن کائنات کے سارے حسن کا اعتراف کیا ہے۔ وہ فطرت کے حسن کے مدّاح ضرور ہیں لیکن اس حسن کو انسانی حسن سے کم تر سمجھتے ہیں:

ے پھول، گُل، شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت

فطرت کے بارے میں رسماً ہی سہی ان کے ہاں صوفیانہ تخیّل نظر آتا ہے۔ وہ ہمہ اوستی کم اور ہمہ از اوستی زیادہ ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا عام نقطۂ نظر یہ ہے کہ فطرت، خدا اور انسان الگ الگ ہیں۔

''میر تقی میرؔ اور نقاش کا فن'' میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ میرؔ کے ہاں مصوّری کا ذکر محض شاعرانہ نہیں بلکہ وہ فنِ تصویر کے گہرے رموز سے باخبر تھے۔ تذکروں میں ان کی اس استعداد کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن انھوں نے مصوّری کے فن کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی بنیادی حقیقتوں پر گہرا غور کیا ہے اور اس فن کے فلسفیانہ اور جمالیاتی اصولوں پر ایسی نظر ڈالی ہے جس کے بغیر فنِ مصوّری کی ماہیت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

میرؔ کی حسِ سامعہ خاصی اُلجھی ہوئی ہے جب کہ تصویر کے فن میں وہ ماہر ہیں۔ ان کے ہاں تصویر صرف پیکرِ خطوط کا نام نہیں بلکہ مستقل اظہاری اور معنوی صلاحیتوں کا نام ہے۔

ے اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے لائق
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

ان کے ہاں تصویر کی سب سے بڑی صفت حیرت ہے جو تصویر میں حرکت اور زندگی کا قائم مقام ہے۔ مصوّر کا کام صرف تصویر کو بنانا نہیں بلکہ اس تصویر سے متعلقہ تاثرات و احساسات کو پیش کرنا ہوتا ہے اور ان تاثرات و احساسات کا نام ''حیرت'' ہے۔ ان کے ہاں تصویر محض فریبِ نظر نہیں ہے، کیونکہ اس میں حقیقت کے اظہار کے لیے مستقل معانی ہوتے ہیں جو حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ میرؔ انسان کو خدا کی فن کاری کا وہ اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہیں جس کی نقالی کسی اور مصوّر کے بس کی بات نہیں ہے اور اس کائنات کا حُسن بھی انسانی حُسن کے مقابلے میں دوسرے درجے کا ہے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کائنات کا حُسن انسان کی منقلب صورت کو بھی مانتے ہیں۔

ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

مصوری کے بارے میں میرؔ کے اشارات محض تقلیدی نہیں بلکہ تنقیدی ہیں اور یہ تنقیدی خیالات اس عرفان و بصیرت سے بھرپور ہیں جو اچھی خاصی تربیت کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہیں۔

''میرؔ کے قبولِ عام کی بنیادیں'' میں مصنف نے میرؔ کی برتری میں ان کی خودنگر شخصیت، عجیب و غریب کردار، بلند علمی حیثیت، فنّی قابلیت اور ناقدانہ قوت جیسی صفات کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کے مقبول ہونے میں اس شاعر کے کلام میں غم یا نشاط کے غالب رجحان کے ساتھ ساتھ تفریح، تبدیلی توجہ یا ''سہارے'' کی صورتوں کے استعمال پر ہے۔ انھوں نے غم کے ساتھ ساتھ نشاط کا پہلو بھی رکھ دیا ہے اور غربت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ امراء کے محلات کے سامنے غریب کی جھونپڑی بھی اہمیت کی حامل لگتی ہے۔ ان کی شاعری کا لہجہ عوامی ہے لیکن یہ شاعری روایتی اسالیب اور خاص پسند صنعت کاری کے اعتبار سے بھی بلند درجے کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری خواص اور عوام دونوں میں پسند کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ:

''انھوں نے شدید جذباتی کیفیتوں کو عام فہم اور مؤثر طور پر بیان کرنے میں بڑی فن کاری کا اظہار کیا ہے اور اسی پر ان کے قبولِ عام کی عمارت قائم ہے۔'' [۳۴]

''تقلیدِ میرؔ یا شارعِ عام'' میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ ''تقلیدِ میرؔ'' اُردو شاعری کی ایک مستقل رسم معلوم ہوتی ہے۔ تقلید کی یہ کوشش صلاحیتوں کے حق میں مفید نہیں ہے کیونکہ کسی غیر معمولی تخلیق میں یکسانی کی صورت ممکن ہی نہیں۔ شاعری تنہائی کی ریاضت کا نام ہے اور تقلید کی کوشش میں ایسا ممکن ہی نہیں۔ اگرچہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا اثر قبول کر سکتا ہے اور اتفاقی ہم رنگی پیدا ہو جانا بھی ممکن ہے لیکن کوئی شاعر دوسرے بڑے شاعر کی تقلید کر کے بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ میرؔ کی شاعری کی تقلید نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں حساسیت بہت زیادہ ہے۔ غالبؔ کے ہاں میرؔ کی دیوانگی اور جنون کے بعض تیور

پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے روٹھ کر نئی دنیا تخلیق کرنے کی آرزو بھی موجود ہے لیکن مکمل طور پر تقلیدِ میرؔ نہیں۔ شادؔ عظیم آبادی کے ہاں اگر کچھ میریت ہے تو وہ ان کی گیت نما غزلوں میں ہے جن میں وہ میرؔ کی طرح ایک سیلانی جوگی نظر آتے ہیں۔ آثرؔ کی زبان میں میرؔ کا لہجہ کسی حد تک پیدا ہو گیا ہے جو ان کی میرؔ سے محبت کا نتیجہ ہے۔

جدید مقلّدوں اور مدّاحوں کی فہرست میں قیوم نظرؔ، ناصرؔ کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ابنِ انشاؔ، شان الحق حقیؔ اور اختر انصاری شامل ہیں۔ جدید شعراء نے تقلیدِ میرؔ میں کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں لیکن:

> ''یہ صرف لہجۂ میرؔ کی نقالی ہے جس میں نہ شاعروں کی اپنی آواز اُبھری ہے نہ میرؔ کی آواز، اور اکثر حالات میں تو یہ تحسین وعقیدت کا ایسا مظاہرہ ہے کہ ہم اس کو کسی طرح روحِ میرؔ کی تجدید نہیں کہہ سکتے۔'' ۵

''غالبؔ۔۔۔معتقدِ میرؔ'' میں غالبؔ پر میرؔ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غالبؔ کی میرؔ کے بارے میں رائے اکتسابِ فیض کے اقرار کے مترادف ہے لیکن ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ دونوں شعراء نے مشترکہ ادبی روایات سے استفادہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کون سے عناصر غالبؔ کے کلام میں براہِ راست پرانی روایات سے آئے ہیں اور کون کون سے عناصر میرؔ کی وساطت سے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ غالبؔ اور میرؔ کے ظاہری خصائص ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

میرؔ و غالبؔ کے احساس اور فکر و نظر کے بعض انداز ہم رنگ ہیں۔ ان کی مماثلتوں کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ خارجی: ہم طرح غزلیات، لفظوں اور جملوں کا اشتراک، اسالیب کا اشتراک۔

۲۔ داخلی: (الف) مضمون کا کامل یا جزوی اشتراک

(ب) نقطۂ نظر کا اشتراک

میرؔ اور غالبؔ کے ہاں اگر اشتراک کو تلاش کیا جائے تو دونوں میں حد سے بڑھا ہوا

احساسِ کمال پایا جاتا ہے اور ان کا یہی شعورِ برتری ان کی شاعری میں بے پناہ انفرادیت کا ذمہ دار ہے۔ دونوں کے ہاں فن کے معاملے میں ایک طرح کی نازک مزاجی پائی جاتی ہے اور فن سے باہر دونوں انسانیت کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلّماتِ متعارفہ کی تردید دونوں کے ہاں ہے لیکن میرؔ، غالبؔ کی طرح اشخاص کی تردید نہیں کرتے بلکہ مسلّم اوصاف اور کوائف کی تردید و تنقیص کرتے ہیں۔ بے شک اشخاص کے متعلق میرؔ بھی کبھی کبھی غالبؔ کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں لیکن دنیائے عشق کے ''عزت داروں'' کو یہ زیادہ نہیں چھیڑتے۔

میرؔ اور غالبؔ دونوں کے ہاں ہنگامۂ حیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ''گفتگو'' کا میلان، احساس کی انتہائی شدّت، محبتّوں کی ارتقائی حالتیں اور لہو سے متعلقہ جزیات کی فراوانی بھی دونوں کے ہاں ایک جیسی ہے اور:

> ''جن غزلیات میں خون، شکار، گردباد، غبار، بے کسی و بے دماغی
> اور زندگی کی معمولی اور پیش پا اشیاء و صفات کا تذکرہ ہو اور
> طرزِ بیان صاف یا نسبتاً اور مقابلتاً صاف ہو، وہ اکثر اور عموماً
> میرؔ کے اثرات کا پتا دیتی ہیں۔'' ۶

میرؔ کے اثرات غالبؔ کے تمام ادوارِ شاعری پر ہیں۔ وہ میرؔ کے رسمی معتقد نہ تھے بلکہ میرؔ ان کے لیے ذہنی ارتقاء کے سفر میں فیض و ہدایت کا سرچشمہ تھے۔

''میرؔ و غالبؔ کی چند ہم طرح غزلیں'' میں غالبؔ پر میرؔ کی خارجی مماثلتوں کو ثابت کیا گیا ہے۔ غالبؔ نے میرؔ کی غزلوں کی سادگی کے بجائے ان کی غزل کی جذباتی گہرائی اور شدّتِ احساس کے اثرات کو زیادہ قبول کیا ہے۔ ان کے ہاں ہم طرح غزلوں میں اسلوبِ اظہار تو بیدلؔ کا اختیار کیا گیا ہے لیکن جذبہ میرؔ کا ہے۔

''میرؔ کی مثنوی نگاری'' کے حوالے سے مصنف نے میرؔ کو پہلا عشقیہ قصہ لکھنے والا تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، کیونکہ دکنی شعراء نے ان سے پہلے عشقیہ قصے لکھے۔ ان کی مثنویوں میں سب خوبیاں نہیں ہیں لیکن مثنوی کے فن کو انھوں نے محدود دائرے میں خاصی ترقی دی ہے۔ ان کی مثنویوں کی بحریں

نامانوس ہیں اور ان کی زبان میر حسن کے مقابلے میں ناہموار ہے۔

''میر کے ادھورے گیت'' میں مصنف نے میر کی طویل بحروں کے حوالے سے ان کے کلام کی خصوصیات کو اُجاگر کیا ہے کیونکہ اُردو کے کسی شاعر نے طویل بحر کو میر سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان کی شاعری گہرے زخم اور وافر لہو ہونے کے باوجود قاری کے لیے طویل بحروں کی وجہ سے گوارا ہے کیونکہ بحروں کے آہنگ اور حسنِ ترتیب سے پیدا ہونے والی خوشگوار موسیقی، درد و غم کی چبھن کو نسبتاً کم کر دیتی ہے۔ اُن کا طویل بحروں کے استعمال میں انہاک یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے خاص مضامین کے لیے گیت نما نظموں کی جستجو میں رہتے تھے۔ ان کی طویل بحروں والی غزلیں گیت تو نہیں ہیں مگر ان میں گیتوں کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میر کی لمبی بحر والی غزلیں ان ''پینگوں'' اور جھولوں کی طرح ہیں جن کے پلّے اونچے اونچے درختوں کی ٹہنیوں سے بندھے ہوئے ہوں اور ان میں دل والوں اور دل والیوں کے لیے اتنی وسعت ہے جتنی وسعت ان کے ارمانوں کی ہوتی ہے۔

''میر کا ایک نقاد۔۔۔محمد حسین آزاد'' میں مصنف نے آزاد کی میر کے بارے میں رائے سے اختلاف کیا ہے۔ آزاد نے شاعروں پر تبصرہ کرتے وقت ان کی شخصیت سے تاثر لیا ہے۔ میر کے بارے میں منفی آراء حکیم قدرت اللہ قاسم نے ''مجموعۂ نغز'' میں صرف میر کو بدنام کرنے کے لیے دی تھیں، کیونکہ وہ میر کے طریقۂ انتقاد کو رسمیاتِ تذکرہ نویسی کے خلاف بغاوت سمجھتے تھے۔ آزاد نے اگر شخصیت کو ہی بنیاد بنا کر شاعری پر رائے دینی تھی تو میر کی شخصیت کا مطالعہ داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر کر لیتے جب کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آزاد نے میر کی جس بددماغی کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے وہ اگر ثابت ہو بھی جائے تو اضطراری ہے جو جنون کا نتیجہ ہے، وگرنہ شاعری میں تو جگہ جگہ میر کی مسکینی اور خاک نشینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے بارے میں آزاد نے اعتراضات تو کیے ہیں لیکن ان اعتراضات کی حقیقت کے بارے میں چھان بین نہیں کی۔ اصل میں وہ میر کی ذہنی مجبوریوں کو سمجھ ہی نہیں سکے۔

''میں اور میر'' میں مصنف نے میر سے وابستگی کے تدریجی مراحل کا ذکر کیا ہے۔ ابتداء میں مصنف کو قومی شاعری میں دل چسپی کی وجہ سے میر کی شاعری سے کوئی دل چسپی نہیں تھی لیکن بعد میں جب میر کی شاعرانہ اور مصوّرانہ عظمت ان پر آشکار ہوئی تو ان کی شاعری میں انھیں انسانی ذوق کی

پاسداری، طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ، پامردی اور شرافت نظر آئی۔ ان کے خیال کے مطابق:

''میرؔ ہر وقت اور ہر گھڑی کا شاعر نہیں مگر نازک لمحات اور
سخت احساسات میں میرؔ سے بہتر رہنما اور دوست بہت کم
کسی کو ملے گا۔'' ۷

''میرؔ کا احساسِ شہریت'' میں مصنف نے میرؔ کے ہاں شہریت کے احساس اور شہری قدروں کے احترام کی بات کی ہے۔ میرؔ نے جتنا عشق کے شہری ماحول کی اہمیت کا احساس دلایا ہے، کلاسیکی شاعروں میں سے کسی شاعر کے ہاں اتنا احساس نہیں ہے۔ وہ صحرائی اور بیابانی عاشق بننا نہیں چاہتے۔ ان کے خیال میں شہر میں رہ کر بھی عاشقی کی ساکھ قائم رکھی جا سکتی ہے۔

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

شہر کے لفظ کے ساتھ میرؔ کے ہاں کلچر لازم ہے اور یہ کلچر بھی دتی کا ہے۔

''میکدے میں میرؔ'' اس کتاب کا آخری مضمون ہے جسے مصنف نے فلم ''سات لاکھ'' کے ایک کردار سے متاثر ہو کر لکھا۔ یہ کردار ایک شرابی کا ہے جسے بدحواس حرکتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس حالت میں وہ میرؔ کی غزل کے شعر گنگناتا ہے جس کے بعد مصنف نے میرؔ کی شاعری کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا کہ آیا میرؔ رندی کیفیتوں سے واقعی باخبر تھے یا یہ محض شاعرانہ رنگ تھا۔ میرؔ کی شاعری کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''عالم الغیب خدا ہے مگر محسوس ایسا ہوتا ہے کہ میرؔ اس ماحول
سے پوری طرح باخبر تھے جو مئے و مینا سے متعلق ہے۔ یہ بھی
معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کے لیے اس عالم کی بعض خاص کیفیتیں اور
حالتیں غیر معمولی حد تک مرغوب تھیں اور ان کے ذکر کو محض
استعارہ یا رسمی تذکرہ نہیں کہا جا سکتا۔'' ۸

لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرؔ کے ہاں مئے و مینا کا ذکر خالصتاً رسمی اور استعاراتی رنگ میں

بھی ہوا ہے۔ ان کے اشعار کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جس میں ''حالیہ'' انداز پایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ میرؔ مئے خانے کے کوائف اور مئے خواری کی کیفیتوں سے آگاہ تھے۔

اس کتاب کو موضوعات میں تقسیم کر کے میرؔ کی شخصی اور ادبی زندگی کا ایک جامع خاکہ بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے جہاں پر میر کے حالاتِ زندگی ہمارے سامنے آتے ہیں وہاں پر ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

''محمد تقی میرؔ'' ڈاکٹر جمیل جالبی کے دو لیکچرز پر مشتمل کتاب ہے جو انھوں نے میرؔ کی زندگی اور فن پر دیے۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ حیات و سیرت اور تصانیف

۲۔ مطالعۂ شاعری

مصنف لکھتے ہیں کہ میرؔ اکبرآباد میں جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ انتشار کا زمانہ تھا جس کے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے نامساعد حالات میں زندگی بسر کی۔ ان کے والد زاہد و متقی تھے۔ اگرچہ انھیں برصغیر میں ہر کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اکبرآباد میں وہ میدانِ صفا کا ایک اہم نام ضرور تھے۔ جب میرؔ کے والد کی وفات ہوئی تو وہ بالکل بے سہارا ہو گئے۔ اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو گھر بٹھا کر تلاشِ معاش میں نکلے لیکن بے سود رہا۔ جب دلّی آئے تو نادر شاہ درّانی کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت نے شہر اور شہریوں کو برباد کر دیا تھا۔ جب نادر شاہ نے دلّی سے کوچ کیا اور کچھ عرصہ بعد حالات معمول پر آئے تو میرؔ دوسری بار دلّی پہنچے اور اپنے سوتیلے ماموں آرزوؔ کے ہاں ٹھہرے۔ اس وقت اُن کی عمر سترہ سال تھی۔ انھوں نے جن حالات میں زندگی گزاری ان سب کا اثر اپنے مخصوص طریقے سے محسوس کیا۔ میرؔ نے سینہ سپر ہو کر ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ ان کے مزاج کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رُخ ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت ہے جس میں وہی مرض پسندی نظر آتی ہے جو انگریزی زبان کے رومانی شعراء کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ ان کے والد، چچا اور وہ خود شروع ہی سے نقطۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک نارمل رویّہ تھا جو میرؔ کو میراث میں ملا تھا۔

میرؔ کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے ''دیوانگی'' نہایت اہم ہے، کیونکہ ان کے مخصوص جذبات اور مخصوص نقطۂ نظر کا مخرج یہی دیوانگی ہے۔ وہ انتہائی حسّاس تھے اور اسی حسّاسیّت نے انھیں توازن کی کمی کا شکار کر دیا۔ اُن کا مزاج ایسا مزاج تھا جو پریشانیوں کا گہرا اثر لے کر قنوطیّت میں ڈوب جاتا ہے، اس کے باوجود اُن کی قنوطیّت وہ قنوطیّت نہیں جو زندگی سے مکمل فرار کی راہ دکھاتی ہے۔ اُن کی زندگی کی ابتداء جن حالات میں ہوئی وہ قابلِ فخر نہیں تھے لیکن انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ حسّاس طبیعت اور زندگی کی تلخیوں کا گہرا اثر قبول کرنے کے باوجود وہ لکھتے رہے اور اپنی داخلی کائنات کے رازوں سے پردہ اُٹھاتے رہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں میر تقی میرؔ کی شاعری پر بحث ہے جس میں مصنّف لکھتے ہیں کہ میرؔ کا اصل میدان غزل ہے۔ ''پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند'' والی رائے اُن کے کلام کے بارے میں نہیں بلکہ یہ تقی اوحدیؔ کی رائے امیر خسرو کے کلام کے بارے میں ہے۔ ان کا کلیات پڑھتے وقت ہمیں طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ ہمیں غمزدہ کر دیتے ہیں، کبھی وہ ہمارے غموں کا تدارک کر دیتے ہیں، کبھی وہ ایسی سچائی کا شعور دیتے ہیں جس سے ہم شاید واقف تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میرؔ نے ہمیں کر دیا۔ کبھی ہم اس سے اُکتا جاتے ہیں لیکن ان سب کیفیات کے ساتھ ساتھ ان کے شعر ہمارے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیں بدلتے رہتے ہیں اور جب کلیات ختم ہوتا ہے تو ہم سیکڑوں اشعار نہ صرف منتخب کر چکے ہوتے ہیں بلکہ احساس و جذبے کی دنیا میں ہلچل مچا کر وہ ہمارے گونگے جذبوں کو زبان بھی دے چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم خود کو پہلے سے زیادہ باشعور اور زندہ انسان محسوس کرنے لگتے ہیں۔

میرؔ کے ہاں عشق ذات کے حوالے سے بھی ہے اور کائنات کے حوالے سے بھی۔ کیونکہ ان کا کائناتی عشق ''کُل'' کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے اور اسی عشق میں گِھر کر کائنات اپنا وجود مکمل طور پر اس جذبے میں رنگ لیتی ہے۔ اس لمحے عشق ایک ایسی بلندی پر براجمان ہوتا ہے کہ میرؔ کو خدا کی طرح کائنات میں عشق ہی عشق نظر آتا ہے۔ اس لمحے ان کے ہاں عشق ہی خالق، عشق ہی خلق اور عشق ہی باعثِ ایجادِ خلق ہوتا ہے۔ ان کے تصوّرِ عشق کا یہ اظہار ان کی مثنویوں ''شعلۂ عشق''، ''دریائے عشق'' اور

''معاملاتِ عشق'' میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے۔ بقول مصنّف:

> ''میرؔ کے ہاں عشق کے دو دائرے ہیں۔ ایک بڑا دائرہ اور دوسرا اس کے اندر ایک چھوٹا دائرہ۔ بڑا دائرہ وہ ہے جو کُل کو محیط ہے۔ یہاں عشق ساری کائنات پر حاوی ہے۔ عشق ہی روحِ کائنات ہے۔ اسی لیے سارے عالم میں خدا کی طرح میرؔ کو عشق ہی عشق نظر آتا ہے۔'' ۹

ان کی مثنویات نشاطیہ نہیں بلکہ المیہ ہیں۔ انھیں غم والم کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ غم والم اس دور میں بھی تھا اور خود میرؔ کے مزاج میں بھی تھا۔ غم ان کے ہاں انسانی زندگی کا حصہ بن کر سامنے آیا ہے۔ یہ غم ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ غنائی شاعری، ذاتی انکشاف کی شاعری ہے۔ وہ درد جو شاعر کو بیتاب کرتا ہے اور مختلف قسم کے جذبے جو اس درد کی کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر ایک ایسا عالم طاری کر دیتے ہیں جہاں الفاظ اپنے معنی اور غنا کے ساتھ خدمت کرتے نظر آتے ہیں۔

طرزِ میرؔ، سادگی کے باوجود پُرکاری کی حامل ہے۔ یہ شاعری کا کمال ہے۔ اسی وجہ سے ان کی پیروی ہر ایک کو مشکل نظر آئی۔ ان کی سادگی میں جہاں سہل ممتنع ہے وہاں اس میں ایجاز کے ساتھ ایک ایسی کمال معنی خیزی بھی ہے کہ کوزے میں دریا سمایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں میرؔ کے ہاں فصاحت و بلاغت ایک وحدت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

میرؔ نے طویل بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ یہ طویل بحریں ان کے جذبے کی شدت کو پھیلا کر دھیما کر دیتی ہیں جو گیتوں کا مزاج اپنے اندر لیے ہوئے مانوس فضا پیدا کر دیتی ہیں، لیکن اس کلام میں نشتریت اس درجہ ہے کہ یہ دلوں کو چیرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لفظوں اور ان کی ترتیب سے پیدا ہونے والی آوازیں، بحروں کا آہنگ، قافیوں کا استعمال، ردیف کی تکرار اور ان سب میں غم ملے لہجے سے ایک ایسی فضا کی تخلیق ہوتی ہے جو مسحور کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں فن میں ٹھہراؤ ہے، ایک ایسی نفاست ہے جس سے کلام میں فنّی توازن پیدا ہو گیا ہے اور یہ توازن سعدیؔ کا سا توازن ہے۔ مصنّف میرؔ اور سعدیؔ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شخصیت سعدیؔ کی طرح پہلودار نہیں ہے اور نہ ان کی

شاعری میں وہ وسعت ہے لیکن گہرائی، آفاقیت اور زورِ کلام
میں ان کی غزل سعدؔی کی غزل کی ہم پایہ ہے۔ مشرق میں
سعدؔی، حافظؔ اور میرؔ ہی غزل کی روایت کے تین ممتاز ترین
نمائندے ہیں۔'' ۱۰

آنے والے وقتوں میں شاعری بدلنے کے باوجود میرؔ کی شاعری کی اہمیت ان کی تخلیقی قوتوں کی وجہ سے ضرور رہے گی۔ انھوں نے بول چال کی زبان کو شاعری میں استعمال کر کے اس کے ارتقاء کو تیز کر دیا ہے۔ ان کے ہاں گہرے فنّی شعور اور موزوں ترین الفاظ کے استعمال کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی زبان فارسی زبان کے زیرِاثر نہیں بلکہ ان کے ہاں فارسی الفاظ وتراکیب اُردو کے مزاج میں ڈھل کر نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہر قسم کے الفاظ اور محاورات کا تجربہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ:

''میرؔ نے عام بول چال کی زبان کو شاعری کی زبان بنا کر
جاگیردارانہ ذہنیت کا وہ بت بھی توڑ دیا جس نے زبان کی
حقیقی ترقی کے راستے کو روک رکھا تھا۔'' ۱۱

میرؔ کا کمالِ شاعری بنیادی طور پر غزل میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کا جو مزاج غزل میں ہے، اس کا دوسری اصنافِ شاعری پر بھی گہرا اثر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنویات اُردو کی دیگر مثنویات سے مزاج میں مختلف ہیں۔ انھوں نے جو واردات اپنی مثنویات میں بیان کی ہے، کسی نہ کسی طرح وہ اس کا عملی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ ہجویات میں وہ سوداؔ کی طرح کسی کی پگڑی اُچھال کر خوش نہیں ہوتے جب کہ قصائد میں سوداؔ کو میرؔ پر فوقیت حاصل ہے۔

مصنّف اس کتاب کی مدد سے میرؔ کی پوری زندگی اور فن کو سامنے لانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں جہاں پر انھوں نے میرؔ کی زندگی اور فن کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا ہے وہاں پر اپنی رائے کا کھل کر اظہار بھی کیا ہے۔ اس طرح ان کے کلام کی خصوصیات نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

''تلاشِ میرؔ'' نثار احمد فاروقی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے نو عنوانات کے تحت ''میرؔ شناسی'' کی کوشش کی ہے۔ عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ میرؔ کا آرٹ

۲۔ مطالعۂ میرؔ کے امکانات

۳۔ میرؔ اور یقینؔ

۴۔ میرؔ اور سعادت علی

۵۔ میرؔ کی مثنوی شعلۂ شوق کا مآخذ

۶۔ مثنوی دریائے عشق

۷۔ میرؔ کی مثنویاں

۸۔ ''نکات الشعراء'' کی ایک اور روایت

۹۔ تذکرۂ معشوق چہل سالہ

اس کتاب کے ابتدائیہ میں خلیق انجم لکھتے ہیں کہ اُردو زبان میں لطیف جذبات و احساسات کے نازک ترین اظہار کے کتنے اور کیسے امکانات ہیں یہ ہمیں میرؔ کی شاعری پڑھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے لیکن ''نقدِ میرؔ'' کی طرف التفات بہت دیر میں ہوا، کیونکہ:

> ''تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کو ہم ''نقدِ میرؔ'' نہیں کہہ سکتے۔ نہ اس کی انتقادی اہمیت ہے۔ تذکرہ نگاری کی اپنی زبان اور اپنی اصطلاحیں ہیں مگر وہ کسی کا شاعرانہ رتبہ متعیّن کرنے میں لازماً معاون نہیں ہوتیں۔'' ۱۲

''میرؔ کا آرٹ'' کے عنوان کے تحت مصنّف وضاحت کرتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے نصف اوّل تک اُردو شاعری میں کچھ انفرادیّت یا اپنا پن نہ تھا کیونکہ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے فارسی کا سکہ چلتا تھا۔ سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے جب فارسی کے شاعروں کی حوصلہ افزائی نہ کی گئی تو اُردو شاعری کو فروغ ملنا شروع ہوا۔ دربار میں جہاں پر فارسی زبان کی پذیرائی ہوتی تھی، اُردو زبان کی

پذیرائی بھی شروع ہو گئی۔ ریختہ گو شاعروں کی پہلی کھیپ جو آئی وہ ایرانیوں کے احساسِ برتری سے بغاوت کر کے آئی۔

میؔر کی شاعری کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے ادبی سماج، تہذیب، شخصیت اور گھریلو ماحول سے واقف ہوں۔ میؔر نے ''نکات الشعراء'' میں ریختہ کی جو قسمیں گنوائی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ایک مصرعہ فارسی ہو اور دوسرا ہندی۔

۲۔ آدھا مصرعہ فارسی کا ہو اور آدھا ہندی کا۔

۳۔ فارسی کے حروف اور فعل استعمال کیے جائیں۔ یہ قسم قبیح ہے۔

۴۔ ریختہ میں فارسی زبان کی ترکیبیں استعمال کی جائیں۔ اگر یہ زبانِ ریختہ کے مزاج کے مطابق ہوں تو جائز ہے۔

۵۔ ایہام۔

۶۔ ''انداز'' یہ تمام صنعتوں کو محیط ہے۔ اس میں تجنیس، ترصیع، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ ساری خوبیاں شامل ہیں۔

ان کے اس مختصر بیان نے اس عہد کی شاعری کے تقریباً تمام اسالیب کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جس کی روشنی میں صرف ان کی شاعری کو نہیں بلکہ ان کے ہم عصر شعراء کے کلام کو دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میؔر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان جملوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہو گا جو انھوں نے ''نکات الشعراء'' لکھتے وقت دیگر شعراء کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس سے بھی ان کے نظریۂ شاعری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میؔر کا شاعری کے بارے میں جو خیال ہے وہ یہ ہے کہ:

> ''ایہام کی طرف میلان یا لفظوں کی بازی گری شعر کو بے رتبہ
> بناتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے لیے اسلوب کو وہ ثانوی حیثیت
> دیتا ہے۔ اصل چیز شعر کی معنوی فضا کا رکھ رکھاؤ ہے یعنی اس میں

لطافت ہو، دردمندی ہو، خیال کی ندرت ہو، فکر کی گہرائی ہو
اور وہ بات جسے ایک لفظ میں میرؔ بار بار دہراتا ہے یعنی ''مزہ''
یہ بنیادی وصف ہے۔ اس کے بعد اس کی اہمیت ہے کہ
پیرایۂ اظہار میں شائستگی ہو، زبان میں بازاری پن یا لب ولہجہ
میں ابتذال نہ ہو۔'' ۱۳

میرؔ کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ایسے اشعار جن میں لفظی رعایت، مینا کاری، نادر تشبیہات، بیان کی پاکیزگی، شائستہ لب ولہجہ، سلاست، لفظی تصویر کشی اور خیال کی تجسیم پائی جاتی ہے۔

۲۔ ایسے اشعار جو صرف لفظی رعایت اور روایتی مضامین پر مشتمل ہیں۔

۳۔ وہ اشعار جن میں مشکل ردیف وقوافی، پیچیدہ مضامین، ژولیدہ اندازِ بیان اور ساختگی کا اثر نمایاں ہے۔

میرؔ نے ہندی اور فارسی کی وہ بحریں استعمال کی ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے اسلوب میں Rhythm پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور انھیں وہ بنیادی پتھر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بقول مصنف:

''الفاظ کی اہمیت کا میرؔ نے ایک ہی طرح احساس یا اظہار
نہیں کیا۔ اس کی جتنی امکانی صورتیں ہوسکتی ہیں، جن سے
معانی میں تہ داری، اسلوب میں شیشہ کاری اور مفہوم میں
کیف و اثر پیدا ہوسکتا ہے، اُن سب کو پورے سلیقے کے
ساتھ برتا ہے۔'' ۱۴

میرؔ نے ایہام کی عملاً نفی کی ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ایہام میں اگر خوبصورتی ہو تو اسے مطلقاً نظرانداز کر دیا گیا ہو۔ انھوں نے اس ایہام کا فائدہ رعایت لفظی کی شکل میں اُٹھایا ہے۔ تکرارِ الفاظ سے انھوں نے ایسی تصویر کشی کی ہے جس سے مفہوم میں وسعت اور اثر پیدا ہوگیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ

لمحاتی کیفیتوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے لب و لہجے سے ان کے کلام میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ سادہ، بلیغ، پراثر اور ترنّم سے بھرپور الفاظ

۲۔ واردات کی صداقت اور مانوسیت

۳۔ قوتِ مشاہدہ کا اظہار

میرؔ نے عوامی بولی کو اپنے عارفانہ اور حکیمانہ مضامین کے ابلاغ کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ وہ اس راز سے باخبر تھے کہ زبان کا عام چال چلن ہی سند اور معیار ہوتا ہے اور اس سے زبان میں لچک اور وسعت آتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جس نفسی واردات اور ذہنی کرب کا اظہار کیا ہے وہ خود اس نفسی واردات اور ذہنی کرب سے گزرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صداقت اور واقعیت ہے اور اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان محسوسات اور کیفیات سے گزرے، جن سے میرؔ گزرے تھے۔ ان کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ ہے جو سادگی کے باوجود گہری معنویّت کی حامل ہے۔ اُن کے اسلوب کی خوبیوں نے ان کی شاعری کو سہل ممتنع بنا دیا ہے۔ انھوں نے بظاہر معمولی الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن جب دوسرا ایسے الفاظ استعمال کر کے وہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرؔ کے ہاں معمولی الفاظ کے باوجود گہری ایمائیت اور معنی کی وسعت پائی جاتی ہے۔

؎ کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

یہ وہ عناصر ہیں جن سے میرؔ کی شاعری کا مجموعی مزاج تشکیل پاتا ہے۔ ان کی شاعری میں تصوّف صرف اور صرف اس عہد کے عام رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے لیکن ان کی شاعری کا وہ حصہ جو نفسی کیفیات اور شخصی تجربات کی تصویر کشی کرتا ہے، قابلِ اعتبار ہے۔

''مطالعۂ میرؔ کے امکانات'' کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے میرؔ کے حوالے سے ان پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے:

۱۔ سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب "Fall of The Mughal Empire" اور

''ذکرِ میرؔ'' کا تقابلی مطالعہ۔ کیونکہ دونوں کتابیں ایک ہی زمانے کے تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔

۲۔ کلامِ میرؔ کی تاریخی ترتیب تا کہ ان کے شعوری ارتقاء کا پتہ چل سکے۔

۳۔ میرؔ کا غیر مطبوعہ کلام

۴۔ جامع فرہنگِ میرؔ

۵۔ ''ذکرِ میرؔ'' بہ حیثیت سوانح عمری یا معاصر تاریخ

ان پہلوؤں کے علاوہ میرؔ کے سیّد یا غیر سیّد ہونے کے بارے میں حتمی فیصلہ ''ذکرِ میرؔ'' کے تاریخی واقعات معلومات عامہ سے حاصل کردہ ہیں یا ان کا کوئی تحریری مآخذ بھی ہے اور ان تاریخی مآخذ کا درجہ استناد کیا ہے۔

میرؔ کے بارے میں تحقیق اور حقائق کی تاویلات میں ابھی تک بحث ونظر کی بہت گنجائش ہے اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھنا بھی ضروری ہے۔

''میرؔ اور یقینؔ'' کے زیرِ عنوان مصنف لکھتے ہیں کہ رعایت خان کی سرکار سے میرؔ کا تعلق اواخر ۱۷۴۷ء سے اواخر ۱۷۴۸ء تک تقریباً ایک سال رہا۔ رعایت خان کے ساتھ میرؔ بھی اس جنگ میں شریک تھے جو احمد شاہ ابدالی کے ساتھ لڑی گئی۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب رعایت خان نے میرؔ سے اپنی غزل کے اشعار ڈوم کے لڑکے کو یاد کرا کے گانے کو کہا۔ میرؔ کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے رعایت خان کے دربار میں جانا بند کر دیا لیکن رعایت خان نے میرؔ کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازم رکھ لیا۔ کچھ زمانے کے بعد میرؔ، جاوید خان خواجہ سرا کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ سفرِ ہند کے دوران میرؔ نے یقینؔ کے دادا سے ملاقات کی اور شیخ عبدالاحد وحدتؔ یقینؔ کے دادا نہیں، پردادا تھے۔ ان کے دادا کا نام محمد تقی تھا اور میرؔ نے ان سے ہی ملاقات کرنے کا حال ''نکات الشعراء'' میں لکھا ہے۔

''میرؔ اور سعادت علی'' کے زیرِ عنوان مصنف بیان کرتے ہیں کہ میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں آرزوؔ کے سخت رویے اور ناپسندیدہ برتاؤ کا ذکر کیا ہے لیکن ''نکات الشعراء'' میں انھیں ''استاد و پیر مرشد بندہ''

لکھا ہے جس سے یہ بات بعید نہیں کہ انھوں نے آرزوؔ سے پڑھا ہوگا۔ ''ذکر میرؔ'' میں انھوں نے جس شخصیت سے علمی استفادے کا ذکر کیا ہے وہ میرؔ جعفر عظیم آبادی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے جو ان کی سیّد سعادت علی سعادتؔ سے ہوئی جس میں انھوں نے میرؔ کو ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ مصنّف نے قرائن سے اندازہ لگاتے ہوئے میرؔ اور سعادتؔ کی ملاقات کا زمانہ ۱۱۵۳ھ کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔

''میرؔ کی مثنوی شعلۂ شوق کا مآخذ'' کے زیر عنوان مصنّف نے میرؔ کی مثنوی ''شعلۂ شوق'' کے واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس سے ملتے جلتے واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شمس الدّین فقیرؔ کی ایک فارسی مثنوی ''تصویرِ محبت'' ۱۱۵۶ھ کی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے واقعات اور ''شعلۂ شوق'' کے واقعات ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے اس مثنوی کو صرف اور صرف فقیرؔ کی مثنوی ''تصویرِ محبت'' کا ترجمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ دونوں کی مثنویوں میں جزوی اختلافات بہت زیادہ ہیں اور:

> ''قصے کی ساخت میں یہ جزوی اختلافات معمولی نہیں ہیں۔
> ان سے مجموعی ہیئت اور تاثر میں بھی کافی فرق پیدا ہو گیا ہے
> اور ان کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ قیاس کرنے
> کے قرائن تو موجود ہیں کہ ''تصویرِ محبت'' میرؔ کی نظر سے گزری
> ہوگی لیکن انھوں نے اگر اسے اپنا مآخذ بنایا بھی ہے تو اچھی خاصی
> تبدیلی اس میں پیدا کر دی ہے۔'' [۱۵]

مصنّف کے خیال کے مطابق اس قصّے کے واقعات میں اگر کوئی صداقت کا عنصر تھا بھی تو اس کی اصلی صورت اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ یہ اب اختراعی معلوم ہوتا ہے۔

''مثنوی دریائے عشق'' کے زیر عنوان مصنّف ''میرؔ شناسی'' کے مرحلے کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرؔ بنیادی طور پر غزل گو ہیں لیکن ان کی مثنویاں بھی ربط و تسلسل، صفائی، سلاست اور پاکیزگی میں غزلوں سے کم نہیں۔ ان کی عشقیہ مثنویوں میں ''دریائے عشق'' کو سب سے زیادہ مقبولیت

نصیب ہوئی۔ یہ میرؔ کی نمائندہ مثنوی ہے۔ ایک لحاظ سے ان کو شمالی ہندوستان کا اوّلین مثنوی نگار کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی روشِ مثنوی نگاری نے بعد میں لکھی جانے والی مثنویوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر ڈالا۔ ان کی مثنویوں میں عشق کا دوگونہ تصوّر ملتا ہے:

۱۔ فلسفیانہ یا روحانی تصوّر

۲۔ مادی اور مجازی تصوّر

ان کی سب عشقیہ مثنویاں المیہ ہیں جو عاشق اور معشوق دونوں کی زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوتی ہیں۔ ''دریائے عشق'' کی ابتداء عشق کی تعریف سے ہوتی ہے اور میرؔ کا تصوّرِ عشق عالم گیر ہے۔ اسی سے کارخانۂ عالم چل رہا ہے، اس مثنوی میں عشق کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اصل قِصّہ شروع ہوتا ہے جس کا ہیرو اچھے ناک نقشے کا قبول صورت نوجوان تھا لیکن عشق کی نظرِ بد اسے کھا گئی۔ جب محبت کی رسوائی ہونے لگی تو ہیروئن کے عزیز و اقرباء، ہیرو کی جان کے لاگو ہو گئے لیکن ہیرو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنے محبوب کی یاد میں سرشار رہتا ہے۔ جب حسن و عشق کا یہ افسانہ خاص و عام کی زبان تک پہنچا اور ہیروئن کے گھر والے فکرمند ہوئے تو لڑکی کو ایک عزیز کے گھر بھیج دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے اس لڑکی کو ایک پالکی میں بٹھایا اور دریا کے پار روانہ کر دیا۔ جب لڑکی گھر سے جانے لگی تو ہیرو کو بھی پتا چل گیا اور وہ علمِ آہ بلند کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ بھیجی گئی نوکرانی نے وصال کا جھوٹا وعدہ کیا جب کشتی دریا کے بیچ پہنچی تو اس نوکرانی نے لڑکی کی جوتی دریا میں پھینک کر عاشق کو نکالنے کے لیے کہا تا کہ یہ ڈوب جائے۔ ایسا ہی ہوا اور عاشق جوتی نکالتے ہوئے دریا میں غرق ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد لڑکی واپس آتی ہے۔ جب واپس آتے ہوئے اس دریا میں سے گزرتی ہے تو دایہ سے پوچھتی ہے کہ وہ جوان دریا میں کس جگہ ڈوبا تھا۔ دایہ نے نشان دہی کی تو وہ لڑکی بھی دریا میں چھلانگ لگا کر ڈوب گئی۔

میرؔ کی مثنویوں کے اوصاف وہی ہیں جو اچھی غزل کے عناصرِ ترکیبی ہو سکتے ہیں جیسے اختصار، جامعیت، داخلی فضا، اشاریّت اور سوز و گداز۔ مصحفیؔ نے میرؔ کی پیروی کرتے ہوئے اسی مثنوی کو ''بحرالمحبّت'' کے نام سے لکھا ہے۔ قصہ گوئی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مصحفیؔ، میرؔ سے زیادہ کامیاب ہیں کیونکہ مثنوی کی شاعری بیانیہ ہوتی ہے جو میرؔ سے زیادہ سوداؔ کے مزاج کو راس تھی اور مصحفیؔ بھی اپنے شعری مزاج

کے اعتبار سے سودا کے مقلد ہیں۔ مصحفی نے میر کی مثنوی کے فنی خلا اپنی نظر میں رکھے اور اسے دوبارہ لکھتے ہوئے چابک دستی کا ثبوت دیا لیکن مصنف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ''بحر المحبت'' اور ''دریائے عشق'' میں سے مجھے انتخاب کرنا ہوتو میں ''دریائے عشق'' کو ترجیح دوں گا۔

غزل میں بلند مقام ہونے کی وجہ سے ناقدوں نے میر کی دیگر اصنافِ شاعری پر توجہ نہیں دی جب کہ مثنوی کے میدان میں بھی میر کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان مثنویوں میں ان کے سوانح نگار اور ناقد کے لیے بہت سے مفید مطلب اشارات موجود ہیں مثلاً ''خواب و خیال'' میں انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور آگرہ سے ہجرت کا بیان نظم کیا ہے۔ سوانحی اہمیت کی دوسری مثنوی ''معاملاتِ عشق'' ہے جس میں انھوں نے اپنی حیاتِ معاشقہ کے کچھ گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ میر نے کسی شادی شدہ خاتون سے عشق کیا تھا اور اس سے خوب کھل کھیلے تھے۔ کیونکہ:

> ''اس مثنوی کے گہرے مطالعے سے میر کی جنسی اور رومانی زندگی
> کے کچھ خاص پہلو سامنے آتے ہیں۔'' [۱۶]

میر کی مثنویاں عام طور پر غزل کے رنگ کی حامل ہیں۔ اپنی مثنویوں میں وہ جہاں پر بہاریہ مضامین، روایتی انداز کا ساقی نامہ یا عشق و محبت کی فلسفیانہ اور مابعدالطبیعاتی وضاحت کرتے ہیں وہاں پر وہ غزل کے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ان کی مثنویوں کی مدد سے اس زمانے کی سماجی حالت اور تہذیبی شعور کا مطالعہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں خالص عشقیہ مثنویوں کی بنیاد لوک داستانوں پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے ان کے اصل مآخذ کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن میر نے جتنی عشقیہ داستانیں لکھی ہیں، المیہ انجام ہی رکھتی ہیں۔ اس میں فوق الفطری عنصر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہ مثنویاں بظاہر ٹریجڈی پر ختم ہوتی ہیں لیکن فوق الفطرت عنصر انھیں کم سے کم تصوراتی حد تک طربیہ بنا دیتا ہے۔

منظر نگاری، تمثیل نگاری، مکالمہ نگاری اور پلاٹ کی تنظیم کے اعتبار سے اگر میر کی مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے داستان کے ابتدائی منظوم نمونے ہونے کی وجہ سے زیادہ فنی نزاکتوں کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میر حسن نے خاص طور سے کردار نگاری، تمثیل نگاری اور مکالمہ نگاری کو زیادہ ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا ہے لیکن ان کے پیش رو شاعروں میں سے زیادہ کامیاب میر ہی ہیں۔

''نکات الشعراء کی ایک اور روایت'' کے زیرِعنوان مصنف آزاد لائبریری علی گڑھ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں ذخیرہ سر سلیمان میں کشکول متفرقات فارسی کے تحت ایک بیاض ہے جس میں ایک تذکرے کے کچھ متفرق اوراق بھی ہیں جو دراصل میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ہے۔ اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ متداول تذکرہ بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے، اس لیے میر نے ''نکات الشعراء'' کی تالیف کا آغاز خواہ ۱۱۶۵ھ ہی میں کیا ہو لیکن اس میں اضافے اور ترامیم بعد تک بھی ہوتی رہی ہیں۔

اگر میر کا تذکرہ سب سے پہلا ہے تو خاکسار نے ''معشوقِ چہل سالہ'' کے نام سے جو تذکرہ لکھا تھا، اس کا حوالہ ''نکات الشعراء'' میں کیسے آ گیا؟ قائم چاند پوری نے بھی اپنے تذکرے ''مخزنِ نکات'' میں اولیّت کا دعویٰ کیا ہے اور تذکرے کے داخلی قرائن بھی ان کے خلاف نہیں ہیں۔ مصنف ''مخزنِ نکات'' اور ''نکات الشعراء'' کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قائم کا تذکرہ یقیناً ''نکات الشعراء'' سے پہلے مدوّن ہو چکا تھا۔ اگرچہ اُس کی اشاعت ۱۱۶۸ھ سے پہلے نہیں ہو سکی۔

''تذکرہ معشوقِ چہل سالہ'' کے زیرِعنوان مصنف لکھتے ہیں کہ مجھے ''نکات الشعراء'' کو اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ماننے میں ہمیشہ تامّل رہا ہے لیکن قوی دلائل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تردید مشکل عمل تھا۔ ''نکات الشعراء'' اور ''مخزنِ نکات'' دونوں کی بنیاد میر عبدالولی عزلت کی بیاض ہے۔ دونوں نے اس سے استفادہ کیا اور میر و قائم دونوں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اوّلیت کا شرف اسے حاصل ہے۔ مصنف نے ''مخزنِ نکات'' اور ''نکات الشعراء'' کی متعدد داخلی شہادتوں کو بنیاد بناتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قائم چاند پوری کا ''مخزنِ نکات'' ترتیب و تالیف کے اعتبار سے ''نکات الشعراء'' سے زماناً مقدّم ہے یا کم از کم دونوں ایک ہی زمانے میں اس طرح مرتب ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جہاں پر میر کی زندگی اور فن کے حوالے سے مروّجہ تصوّرات کو بیان کیا ہے وہاں پر ان کی زندگی اور فن کے حوالے سے متعدد نئے گوشوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ میر کی تلاش کی یہ کوشش ''میر شناسی'' کی روایت میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

''میر تقی میر'' نثار احمد فاروقی کی تعارفی نوعیت کی کتاب ہے جس میں میر کے حالاتِ زندگی اختصار اور زمانی تسلسل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جب کہ تنقیدی حصہ اس میں جان بوجھ کر ہلکا رکھا گیا ہے۔

''سوانح حیات'' کے زیرِعنوان مصنف بیان کرتے ہیں کہ غالب اور ذوق جیسے بڑے شعراء نے میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصنافِ شاعری میں لکھا ہے لیکن:

''ان کی شہرت کا ایوانِ بلند غزل کے ان وجد آفریں،
شورانگیز اور کیف آور اشعار پر قائم ہے جنھیں تیر ونشتر سے
تعبیر کیا جاتا ہے۔'' ۱۷

میر نے ''ذکرِ میر'' میں اپنے حالاتِ زندگی کم لکھے ہیں جبکہ جدید فارسی کے محاورات باندھنے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اپنے نسب کے سلسلے میں وہ ''فاطمی سیادت'' کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے بعض معاصرین کے ہجویہ اشعار سے لگتا ہے کہ لوگ ان کی سیادت پر شک کرتے تھے۔ بہرحال اپنے خاندان کے بارے میں میر کا بیان ہے کہ ان کے بزرگ حجاز سے ہندوستان آئے۔ میر کے والد کا نام محمد علی تھا اور لوگ انھیں علی متقی کے نام سے پکارتے تھے۔ محمد علی کی پہلی شادی آرزو کی بہن سے ہوئی جن کے بطن سے حافظ محمد حسن پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی کس خاندان میں ہوئی اس کا کوئی علم نہیں۔ اس کے بطن سے میر تقی میر، محمد رضی اور ان کی ایک بہن پیدا ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد کے بارے میں ''ذکرِ میر'' میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت رقیق القلب سوختہ جان اور درویش دل ریش تھے۔ دلّی کے قیام کے دوران میں جب امراء نے میر کے والد سے ملاقات کی کوشش کی تو انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا اور ایک رات خاموشی سے دلّی کو چھوڑ دیا اور بیانہ آ گئے۔ وہاں پر آپ کی ملاقات سیّد امان اللہ سے ہوئی جو اپنے گھر کو چھوڑ کر میر کے والد کے تکیے پر آ گئے اور ساری زندگی یہاں بسر کی۔ میر نے ان سے قرآنِ پاک ناظرہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میر امان اللہ آگرہ میں گوشہ نشین درویش احسان اللہ سے ملنے جاتے تو میر بھی ساتھ ہوتے۔ اس درویش نے میر کے بارے میں پیشین گوئی کی کہ اگر اس کی تربیت ڈھنگ سے ہوگئی تو یہ ایک ہی

جست میں آسمان سے بھی پرے پہنچے گا۔ میرؔ نے احسان اللہ کے جن ملفوظات کا ذکر کیا ہے، اُن کی تعلیمات ونظریات کو دیکھا جائے تو:

> ''میرؔ کے نظریاتِ تصوف، مشرب و مسلک اور انسان دوستی کا سرچشمہ اِنھیں باتوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔'' ۱۸

''ذکرِ میرؔ'' میں درویشوں کی حکایات اور ملفوظات کا تاریخی معیار خواہ کچھ بھی ہو، ان کے بین السطور میرؔ کے ذہن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ''ذکرِ میرؔ'' میں صوبے دار نصرت یار خاں کی احسان اللہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جن کی دی گئی پانچ اشرفیاں اُن کی موت کا سبب بنیں لیکن مصنف کی تحقیق کے مطابق نصرت یار خاں کی وفات میرؔ کی پیدائش سے چند سال پہلے ہو چکی تھی شاید میرؔ سے نام لکھتے وقت غلطی ہوئی ہے یا شاید انھیں صوبے دار کا صحیح نام یاد نہیں رہا۔ آگرہ کے ایک اور مجذوب صفت فقیر بایزید سے بھی میرؔ کی ملاقات رہی۔ ان کا بھی مسلک، مسلکِ عشق تھا جو احسان اللہ اور میرؔ کے والد کا تھا۔ میرؔ کے والد جب ساٹھ سال کے ہوئے تو حفظ شروع کیا اور ڈیڑھ سال کے عرصے میں حافظ ہو گئے۔ میرؔ کے والد نے ۱۷۳۳ء میں وفات پائی۔ میرؔ کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے بے مروّتی کی اور میرؔ والد کی تجہیز و تکفین کے بعد دلّی آ گئے۔ یہاں سے اُن کی زندگی میں آزمائشیں شروع ہوئیں اور جو لوگ انھیں والد کی زندگی میں آنکھوں پر بٹھاتے تھے انھوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ خواجہ محمد باسط کے توسّط سے صمصام الدّولہ نے ایک روپیہ روز کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ دُرّانی نے دلّی پر حملہ کیا تو صمصام الدّولہ لڑائی میں مارے گئے اور میرؔ کا وظیفہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ آگرہ آ گئے۔ جہاں پر ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوبارہ دلّی آ گئے جہاں پر وہ سوتیلے ماموں آرزوؔ کے پاس رہے اور ان سے فارسی سیکھی۔ کچھ عرصہ بعد میرؔ کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے ماموں کو خط لکھا کہ میرؔ فتنۂ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہرگز نہ کی جائے، آرزوؔ اپنے بھانجے کی باتوں میں آ گئے اور میرؔ کو ہر وقت ڈانٹنا، پھٹکارنا اور کڑی نگرانی شروع کر دی۔ اسی زمانے میں وہ شدید گھٹن کا شکار ہوئے اور ذہنی پریشانی کے باعث نوبت جنون تک پہنچ گئی جس کے بعد انھیں چاند میں ایک حسین پیکر نظر آنے لگا۔ فخر الدّین خاں کی بیوی جو علی متقی کی مرید تھیں، نے علاج کرایا اور کچھ دنوں بعد آپ

ٹھیک ہو گئے۔ ان کی جنونی کیفیت کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''یہ جنونی کیفیت کسی عشق کا ثمرہ تھی اور جس شکلِ ماہتابی کا میر نے تذکرہ کیا ہے وہ خان آرزو کے خاندان کی کوئی لڑکی رہی ہوگی، جس کا نام چاندنی، مہتاب یا قمر ہو سکتا ہے۔'' ۱۹

صحت یابی کے بعد میر نے فارسی انشاء پردازی کی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور اسی دوران میں میر جعفر عظیم آبادی سے کچھ عرصے کے لیے پڑھا۔ اس کے بعد ان کو فارسی زبان میں لکھنے کی قدرت حاصل ہو گئی اور انھوں نے فارسی میں شاعری شروع کر دی۔ اسی دوران میں ان کی ملاقات سعادت علی سعادت امروہوی سے ہوئی جنھوں نے ان کو فارسی کے بجائے اُردو میں شاعری کا مشورہ دیا۔ میر نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُردو میں شاعری شروع کر دی اور تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے۔ ۱۷۴۷ء میں آرزو نے میر کو کھانے پر بلایا اور ڈانٹا۔ یہ کھانا کھائے بغیر گھر سے چلے گئے اور علیم اللہ نامی شخص کے توسّط سے نواب رعایت علی خاں کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ ۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ درانی نے لاہور پر حملہ کیا تو جو لشکر احمد شاہ درانی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ان میں نواب رعایت خاں بھی شامل تھے اور میر بھی نواب رعایت خاں کے ساتھ تھے۔ اسی زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت علی خاں اپنی ڈیوڑھی میں ڈوم لڑکے سے گانا سن رہے تھے۔ رعایت علی خاں نے میر سے کہا کہ اپنی غزل کے چند اشعار اسے یاد کرا دو، یہ گا لے گا۔ میر نے شعر تو یاد کرائے لیکن یہ بات انھیں اس حد تک ناگوار گزری کہ رعایت علی خاں کی ملازمت ترک کر دی۔ تھوڑا عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد انھوں نے اسد یار خاں کی سفارش پر جاوید خاں خواجہ سرا کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۷۵۲ء میں جب صفدر جنگ نے جاوید خاں خواجہ سرا کو مروا ڈالا تو میر نے دیوان مہانرائن کی ملازمت کر لی۔ میر عمادالملک کے اس لشکر کے ساتھ تھے جو سورج مل جاٹ پر چڑھائی کے لیے گیا لیکن ناکام واپس آ گیا۔ اس لشکر کے ساتھ میر سکندر آباد تک گئے اور وہاں سے بھاگ کر آنے کے بعد شرم کے مارے کچھ دنوں تک دلّی میں گوشہ نشین رہے۔ اس کے بعد راجا ناگرمل کی ملازمت انھیں مل گئی جس کی سفارش راجا جگل کشور ثروت نے کی تھی۔

۱۷۵۹ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے دلّی میں ایک بار پھر قتل و غارت اور لوٹ مار کی تو میرؔ کا مکان بھی لٹ گیا۔ اس کے بعد دلّی کے حالات خراب ہوتے گئے اور میرؔ کے لیے یہاں پر رہنا مشکل ہو گیا۔ پھر میرؔ اس وقت تک در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے جب تک نواب آصف الدّولہ نے انھیں لکھنؤ نہ بلا لیا۔ وہ جب لکھنؤ پہنچے تو نواب آصف الدّولہ نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور انھیں اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ بقول مصنّف:

"آصف الدّولہ، میرؔ کی خاطرداری میں کمی نہ کرتے تھے مگر ان کے مزاج میں غرورِ کمال اور استغنا تھا۔ اس کا اظہار عوام سے تو ہوتا ہی تھا، امراء کے سامنے بھی نہ چوکتے تھے۔" [۲۰]

آصف الدّولہ کے بعد سعادت علی خاں نے بھی میرؔ کی سرپرستی جاری رکھی۔ وہ لکھنؤ کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی آواز پاٹ دار اور لہجے میں سوز و اثر تھا۔ آخری زمانہ ان کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا، کیونکہ چند سالوں میں بیٹا، بیٹی اور بیوی فوت ہو گئے۔ انھیں قولنج کا عارضہ جو بہت دنوں سے تھا، اس نے زور پکڑا۔ طبیبوں نے مسہل دیا اور ایک دن میں ڈیڑھ سو اسہال کے سبب ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کو شام کے وقت انھوں نے وفات پائی۔ وہ بیوی، بیٹی اور بیٹے کی قبروں کے پاس دفن کیے گئے۔ وہ جگہ اب ریلوے لائن کے نیچے آ گئی ہے اور اس کا نشان قطعاً محو ہو گیا ہے۔

میرؔ کی پہلی شادی دلّی ہی میں ہوئی جن سے ایک بیٹے فیض علی تھے۔ دوسری شادی لکھنؤ میں ہوئی۔ دوسرے بیٹے حسن عسکری عرف کلو عرش اور ایک بیٹی جو شاعرہ تھی اور بیگمؔ تخلص کرتی تھی، دوسری بیوی سے تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد دیگر شعراء کے مقابلے میں کم ہی رہی، کیونکہ فنِ شاعری اور محاورۂ زبان کے بارے میں ان کے اپنے معیار تھے، وہ نازک دماغ انسان تھے اور ان کے مزاج میں استغنا تھا لیکن پھر بھی مختلف اوقات میں ان سے اصلاح لینے والوں کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہے۔

میرؔ کی تصانیف میں چھے دیوان اُردو شاعری کے، تذکرہ "نکات الشعراء"، آپ بیتی "ذکرِ میرؔ" فارسی نثر کا رسالہ "فیضِ میرؔ"، قصہ دریائے عشق (نثر) اور ایک دیوان فارسی شامل ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب "میرؔ کے فن" پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ میرؔ

نے ایہام سے ہٹ کر نیا طرز اختیار کیا جسے انھوں نے ''انداز'' کا نام دیا۔ انھوں نے قدیم روایات کی پاسداری کی، لیکن اجتہادی شان کو غالب رکھا ہے۔ میرؔ لفظوں کے مزاج سے واقف اور معانی کے نہایت نازک فرق کو سمجھتے تھے۔ زبان کے بازاری پن یا لب و لہجہ کے ابتذال کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ وہ ہے جس میں لفظی رعایت بھی ہے اور تشبیہات کی ندرت بھی، لیکن ان کا لب و لہجہ پاکیزہ اور زبان شائستہ ہے۔ میرؔ ایسے شاعر ہیں جو خودکلامی کے ساتھ ساتھ کبھی ماحول سے خطاب کرتے ہیں تو کبھی کائنات سے سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی اجمال میں تفصیل اور کبھی تفصیل میں اجمال کا رنگ بھرتے ہیں، کیونکہ:

> ''جتنی رنگارنگ، متحرک اور مختلف جہات والی امیجری ہمیں میرؔ کی شاعری میں ملتی ہے وہ متقدمین و متاخرین شعراء میں سے اور کسی کے ہاں نظر نہیں آتی۔ یہ اس امیجری کے زور و قوت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ وہ مجرد Abstract اشیاء کو بھی آنکھوں سے دکھا سکتا ہے۔'' [۱۱]

میرؔ نے بحروں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ وہ مختصر بحروں میں وسیع جذبات کو سمو دیتے ہیں، جب کہ طویل بحروں میں اتنا Rhythm ہے کہ تمام الفاظ یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ انھیں لفظوں پر اس حد تک قدرت حاصل ہے کہ وہ معمولی الفاظ کے وسیع امکانات واضح کر دیتے ہیں۔ جو الفاظ امدادی طور پر آتے ہیں یا بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں، ان میں کتنے وسیع امکانات پوشیدہ ہیں ہم نے اس سے پہلے اس پر کبھی غور نہیں کیا ہوگا لیکن میرؔ نے ان الفاظ کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ یہ الفاظ بنیادی اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں۔

؎ وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

وہ لفظوں کے مصوّر ہیں۔ مصوّر بصارت کے ساتھ سماعت کو شریک نہیں کر سکتا لیکن شاعر میں اگر غیر معمولی سلیقہ ہو تو وہ بصارت و سماعت دونوں سے کام لے سکتا ہے اور میرؔ نے اپنی شاعری میں ایسا کر کے

دکھا دیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں رعایتِ لفظی سے کام لینے کے باوجود جذبے کی صداقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی قوتِ مشاہدہ زبردست ہے۔ وہ مظاہر جو ہماری نظر میں معمولی ہیں ان کے اشعار میں غیر معمولی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ اپنے ماحول کے علاوہ وہ انسان کی نفسی کیفیات کا بھی گہرا احساس رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شخصی کیفیتوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ کیفیتیں ماحول کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اجمال میں تفصیل ان کا خاص ہنر ہے۔ اسی لیے ''ایجاز'' کا بھرپور قوت کے ساتھ اظہار جیسا ان کے ہاں ہوا ہے، اردو کے دیگر شاعروں کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

شعرائے متقدمین کے ہاں شعر کی ہیئت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اس لیے معانی ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے تھے لیکن میؔر نے اپنی توجہ شعر کے قالب سے زیادہ اس کے فن پر دی۔ انھوں نے الفاظ کو ایسے تناسب سے جمع کیا کہ یہ الفاظ وسیع کینوس کی تخلیق کرتے ہوئے ایک دوسرے کی قوت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ میؔر کا فن عالمی ادب کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیونکہ:

> ''میؔر کے فن نے اُردو شاعری میں ان بلندیوں کو چھو لیا ہے
> جہاں تک کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔ اپنی شخصیت کے اظہار
> میں وہ عالمی ادب کے کسی بھی معیار سے پرکھے جا سکتے ہیں
> اور اس پر پورے اُتریں گے۔'' ۲۲

اس کتاب میں مصنف نے میؔر کی زندگی اور فن پر بڑی جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے اور بڑی حد تک ان کی ذات اور فن کے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب نے جہاں پر ''میؔر شناسی'' کی روایت میں بہت سے قابلِ قدر اضافے کیے ہیں وہاں پر سب سے اہم اضافہ میؔر کی وفات کی تاریخ اور مہینے کا تعین ہے۔

''میؔر تقی میؔر'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصنیف ہے جس میں دس عنوانات کے تحت میؔر کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔

''میؔر تقی میؔر'' میں مصنف لکھتے ہیں کہ میؔر اُردو کے نامور شاعر اس لیے ہیں کہ انھوں نے درد کو

شاعری اور شاعری کو درد بنا دیا ہے۔ بظاہر جہاں پر شگفتگی اور مسرت کی جھلک نظر آتی ہے وہاں بھی ان کے ہاں کسی نہ کسی گوشے میں غم چھپا ہوتا ہے، کیونکہ:

> ''میرؔ سرتا پا درد وغم اور رنج والم ہیں، ان کی شاعری بھی شروع سے آخر تک اسی درد وغم اور رنج والم کی تصویر ہے۔'' ۲۳

میرؔ کے غم کا براہ راست اظہار ناممکن تھا۔ اس لیے انھوں نے اس غم کے بیان کے لیے شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری خلوص، صداقت، سادگی، برجستگی اور بے ساختگی پر مشتمل ہے۔ ان کے ہاں شعر میں ایسی بے ساختگی ہے جیسے کوئی سیّال چیز ظرف کے لبریز ہو جانے پر کسی طرف بہہ نکلتی ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری میں بھی دکھ کی ایک توانا لہر موجیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ شاعری اُداس ضرور کرتی ہے لیکن گھٹن کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ اس میں اعلیٰ معیارِ زندگی کی ارفع قدریں موجود ہیں جنھوں نے اس شاعری کے اندر ساحری کی سی کیفیّت پیدا کر دی ہے۔ نشیب وفراز میرؔ کی زندگی کا حصہ رہے اور انھیں کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے واردات وکیفیّات کو شعر میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے والد درویش تھے اور میرؔ کی شخصیت پر ان کے والد کا اثر زندگی بھر رہا۔ وہ اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور دس سال کی عمر میں والد اور چچا کا انتقال ہونے کے بعد بھائی کے ناروا سلوک کی وجہ سے دلّی چلے گئے۔ ان پر وہاں بھی افلاس کا عالم رہا۔ جب دلّی پر تباہی آئی تو وہ آگرہ واپس آ گئے لیکن سوائے پریشانیوں کے کچھ حاصل نہ ہوا، اس لیے انھوں نے دوبارہ دلّی کا رُخ کیا اور سوتیلے ماموں کے پاس رہنے لگے۔ جب اس نے بھی اچھا سلوک نہ کیا تو نوبت دیوانگی تک پہنچ گئی۔ نواب آصف الدّولہ نے آپ کو لکھنؤ بلا بھیجا جو انھوں نے غنیمت جانا۔ وہاں پر آپ کی بڑی قدردانی ہوئی۔ عمر کے آخری سال قدرے خوش حالی میں گزرے۔ آپ کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا اور اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن کیے گئے لیکن قبر کا نام ونشان اس صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔

میرؔ نے جس وقت آنکھ کھولی اس وقت مغلیہ سلطنت زوال کا شکار تھی جس کے نتیجے میں ہر طرف افراتفری اور طوائف الملوکی تھی۔ جب وہ دلّی آئے تو نادرشاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے ساتھ ساتھ مرہٹوں اور روہیلوں کی تباہی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی جس کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ وہ انھیں

حالات کے سائے میں زندگی بسر کر رہے تھے اور ان حالات سے انھیں بھی گزرنا پڑا۔ چونکہ وہ ان حالات کی پیداوار تھے اس لیے یہ حالات مختلف زاویوں سے ان کے ہاں اپنے آپ کو رونما کرتے رہے۔ وہ نسلاً ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے مزاج میں گرمی، طبیعت میں شدّت، انتہا پسندی، حمیّت، غیرت، استواری، ثابت قدمی، بلند آہنگی، ایثار وقربانی، وقار اور سپردگی بڑی حد تک ان کی نسلی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ انھیں نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے انھیں ہر چیز پر اداسی اور سوگواری نظر آتی۔ اُن کی شخصیت میں شگفتگی کا فقدان ہے جو بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے خاندانی حالات کی زبوں حالی کی وجہ سے ہے۔ ان نامساعد حالات میں زندگی بسر کرنا مشکل تھا لیکن انھوں نے اور ان کے خاندان نے درویشی کا سہارا لے کر توکّل اور قناعت پر عمل کیا۔ تصوّف کے گہرے اثرات کی وجہ سے انھوں نے زندگی کے اعلیٰ معیار پائے۔ تصوّف نے ان میں احساس کی شدّت، حیات وکائنات کے بنیادی معاملات ومسائل سے دل چسپی، شخصیت میں رکھ رکھاؤ، وقار اور انسانی قدروں کا احساس جیسی صفات کو پیدا کیا۔ ان کی شخصیت میں انسانی زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں المنا کی کا احساس زیادہ ہے لیکن وہ مسرتوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔

میؔر کو فقیروں اور درویشوں کے ساتھ رہنے کا بھی موقع ملا۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں مادی زندگی سے بے نیازی اور اس کے نتیجے میں بے دماغی پائی جاتی ہے۔ طبیعت میں چبھن، خلش کا احساس، زندگی سے فرار، جذباتی انداز اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسائل بنانا اسی خودداری اور بے دماغی کی وجہ سے ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں جس سانحہ سے سب سے پہلے دوچار ہونا پڑا وہ ان کے والد کا انتقال تھا۔ اس منبع سے ان کی ساری الجھنوں اور پریشانیوں کا آغاز ہوا اور پھر ان کی ساری زندگی ان پریشانیوں میں بیت گئی۔ انھیں والد کی وفات کے بعد غمِ روزگار اور غمِ جاناں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس عشق سے میؔر کی زمانے میں رسوائی تو ہوئی لیکن اس نے ان کی زندگی میں مثبت پہلو بھی نمایاں کیے، کیونکہ:

> ’’اُن کی شخصیت میں صداقت اور خلوص، پاکیزگی اور سپردگی،
> ایثار اور قربانی، درد اور خستگی کے جو عناصر ہیں، ان کو اسی
> نظامِ عشق نے پیدا کیا۔‘‘ ۲۴

میرؔ کی شخصیت میں جذبہ عقل پر غالب نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ابتداء ہی سے ایسا ماحول ملا جس میں جذبے کی اہمیت عقل سے زیادہ تھی۔ تصوّف سے قربت نے ان کی شخصیت میں شاعرانہ مزاج کو اُبھارا اور چھوٹی ہی عمر میں ان کی شاعرانہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ دلّی کے حالات نے میرؔ کی جذباتی زندگی کو ٹھیس پہنچائی۔ یہ تباہی ان کی ذاتی تباہی کے ساتھ ساتھ وطن اور علوم وفنون کی بھی تباہی تھی۔ اس تباہی کا غم صرف میرؔ کا انفرادی غم نہیں تھا بلکہ اس کی نوعیت اجتماعی، معاشرتی اور تہذیبی تھی۔ زمانے کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرؔ درباروں میں گئے ضرور لیکن وہ درباری نہ بن سکے اور بنیادی انسانی قدروں کے پامال ہونے کا احساس انھیں عمر بھر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں پناہ لی اور ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں نے مل کر انھیں شاعری کی طرف راغب کیا۔ شاعری ان کے لیے ایک جائے پناہ تھی اس لیے وہ اوّل و آخر ایک شاعر ہی رہے۔ انھوں نے زندگی میں شعر و شاعری کا سہارا لیا اور خود شعر و ادب کے لیے ایک سہارا بن گئے۔

میرؔ کی تصانیف کے حوالے سے مصنّف لکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بڑا سرمایہ اشعار ہیں۔ انھوں نے شاعری کے چھے دیوان چھوڑے جن میں غزلیں بالترتیب حروفِ تہجی جمع ہیں۔ میرؔ کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمّس اور مسدّس ہیں۔ کلیات کے علاوہ ان کے مراثی کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دیوان فارسی میں ہے۔ نثری تصانیف میں نکات الشعراء، ذکرِ میرؔ اور فیضِ میرؔ شامل ہیں۔

میرؔ فنِ شعر کا گہرا شعور رکھتے تھے اور:

> ''میر کی شاعری میں جو عظمت، بلندی اور ترفّع ہے وہ ان کے اس گہرے فنّی شعور کی پیداوار ہے۔'' [۲۵]

میرؔ نے فنّی شعور کا اظہار اس وقت کیا جب اس کے بارے میں عام توجہ نہ تھی۔ انھوں نے فن کے بارے میں جو کچھ سوچا اس کا اپنی شاعری میں مکمل اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے فنّی شعور میں خلوص صداقت، حقیقت اور واقعیّت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ درد و غم کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت مانتے ہوئے وہ فن میں دردمندی کے عنصر کو بھی لازمی خیال کرتے ہیں۔ ان کے سامنے شعر جذبے کی زبان

ہے۔ معنوی اعتبار سے احساس کی شدّت، جذبے کے خلوص اور صوری اعتبار سے محنت اور جگر کاوی کو میرؔ فنِ شعر کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فکر بلند کے بغیر شعر میں گہرائی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوتی۔ میرؔ فکرِ بلند کو احساس، جذبے اور شعور تینوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ صنّاعی ان کے ہاں اہم ہے اور اس کا مفہوم بھی محدود نہیں۔ اسلوب ان کے ہاں شاعری ایک طرزِ اظہار اور حُسنِ ادا کا نام ہے، وہ اسلوب کے تمام پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس کی عظمت کے لیے جدّت اور اچھوتے پن کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

میرؔ کا اصل میدان غزل ہے جس کی رمزیت، ایمائیت، تہ داری اور پیچ داری پر انھوں نے زور دیا ہے لیکن ان سب میں گہری معنویت کا ہونا لازمی ہے۔ انھوں نے غزل کو صرف اور صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ بنانے کے بجائے اس کی عمومیت پر زور دیا ہے۔ غزل میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کے ہاں عشق، داخلیّت، دروں بینی، بے ربطی اور انتشار تھا اور غزل بھی ان باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کی غزل کا سب سے اہم پہلو عشق ہے۔ احساسِ حُسن اور ذوقِ جمال کی ان کے ہاں فراوانی ہے۔ اصل میں ان کی ناکامیاں اور محرومیاں حُسن سے علیحدگی اور لذّت سے دُوری کی وجہ سے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں پر حسن کا بیان ملتا ہے وہاں پر اس سے دُوری کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری کے محبوب کی شخصیت اور سیرت کی پوری تصویر اُبھرنے کے باوجود اس کے لیے بے نقاب ہونے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ ان کے ہاں جو کچھ ہے اس میں محبوب کا ہاتھ تو ضرور ہے لیکن اس سے جسمانی قربت کا احساس نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ محبوب کے عشق کی تفصیل پر مبنی ہے جس میں انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بقول مصنّف:

> ''انھوں نے حسن کی پرستش کی ہے اور اس حسن کو انھوں نے اپنے محبوب میں دیکھا ہے۔ انھوں نے اس سے ملنے اور اس سے قریب جانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس کے قریب پہنچ نہیں سکے ہیں۔'' ۲۶

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ ایک سچے عاشق تھے اور ایک مقام پر عشق اور وہ آپس میں گھل مل

جاتے ہیں۔ میرؔ کے نزدیک عشق کی راہ پُر خطر ہے لیکن عشق کے مسلک میں یہ خطرات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود عشق کی وجہ سے انسان کی ساری زندگی آزمائشوں میں گزرتی ہے اس لیے یہ اسے ایک بلا بھی سمجھتے ہیں۔ تصوّف کی وجہ سے اُن کے ہاں کہیں کہیں عشقِ حقیقی کی جھلک بھی نظر آتی ہے لیکن وہ زیادہ تر مجازی عشق کی بات کرتے ہیں اور اسی عشق میں ناکامیوں کا سامنا کرتے ہوئے انھیں غم سہنے پڑے۔ میرؔ نے عشق کی ناکامی اور غم کو سماجی اور تہذیبی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تغزل میرؔ کا خاص میدان ہے لیکن ان کی غزلیں صرف یہاں تک محدود نہیں بلکہ ان میں فکری پہلو بھی پایا جاتا ہے اور اس فکری پہلو کا منبع تصوّف ہے جس کے توسّط سے ان کے ہاں حیات و کائنات کے مسائل ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے وہ محض انفرادی اور ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی اور انسانی ہے۔ اس نقطۂ نظر کو پیش کرتے وقت ان کے ہاں جذبے کی شدّت ہے۔ اس لیے فکر کا عنصر کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس میں حقیقتوں کے پیکر اُبھرتے ہیں۔ ان کے ہاں کائنات کا تغیّر جاری ہے، ہر گھڑی ایک نیا سانحہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہانِ وقت فقیر ہو جاتے ہیں یہاں انسان کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ ان کے خیال میں انسان یہاں پر مجبورِ محض ہے اور اسے دنیا کے کسی کام سے دل چسپی نہیں لینی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ موت ان کے لیے زندگی اور زندگی موت بن جاتی ہے۔ غرض میرؔ کے ہاں زندگی ایک سراب ہے۔

میرؔ کے ہاں انسان کی عظمت کا تصور بہت نمایاں ہے، کیونکہ انسان مشتِ خاک ہونے کے باوجود آسمان سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور انسان کے سامنے فرشتے کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مصنّف لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی غزلوں میں حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے ان سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ مابعد الطّبیعاتی، عمرانی معاملات، اخلاقی مسائل غرض زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی ان کے یہاں ملتی ہے۔'' ۴۷

انھوں نے ریختہ کے عیب کو ہنر میں بدل دیا ہے۔ اس طرح وہ ایک اعلیٰ درجے کے فن کار

اور بہت بڑے خالقِ جمال ہیں۔ ان کے تغزل اور تفکّر میں بڑی کشش ہے۔ اس کا راز فن کاری اور صناعی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو بڑی رفعت سے نوازا ہے۔ انھوں نے غزل کی روایت کو صحیح طور پر سمجھ کر برتا ہے۔ ان کی شاعری میں سب سے پہلا احساس بے ساختگی اور برجستگی کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں سادگی اور سلاست کا حُسن ہے۔ میؔر کے ہاں تصنع نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ حسن و عشق کے معاملات میں بھی ان کے ہاں رنگینی نہیں آئی۔ ان کے خیالات غم سے واسطہ رکھتے ہیں اور وہ ان کے مکمل اظہار و ابلاغ کے قائل ہیں۔ اگر چہ ان پر فارسی کی شعری روایت کے گہرے اثرات ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس روایت کا غلام نہیں بننے دیا۔ تشبیہہ اور استعارہ ان کے ہاں تخلیقی عمل کا فطری نتیجہ بن کر سامنے آیا ہے۔ وہ یگانۂ روزگار تھے۔ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسانیت کے نغمے گائے۔ انسانی اقدار کے فروغ کا درس دیا۔ ناسازگار حالات سے نپٹنا سکھایا۔ غم کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور خودی کو بیدار کیا۔

"کارگہہ شیشہ گری۔۔۔میر تقی میؔر کا مطالعہ" ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کتاب ہے جس میں میؔر کا مطالعہ چار عنوانات کے تحت کیا گیا ہے:

۱۔ دریائے سخن

۲۔ عالمِ دیگر

۳۔ اقسامِ جواہر

۴۔ ابرِ تر

جب کوئی بڑا شاعر پیدا ہوتا ہے تو شعری قدروں کو تولدِ دیگری سے گزرنا پڑتا ہے لیکن روایت پرستی کی وجہ سے تحسین ناشناسی کا رویّہ اس بڑے شاعر کو اپنے دور میں پہچاننے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہی کچھ میؔر کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ پیدائشی فن کار ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے شعری کمالات وہبی ہیں، اکتسابی نہیں۔ شاعر کی شخصیت پر خارجی حالات کا اثر ضرور ہوتا ہے لیکن داخلی مؤثرات زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میؔر کی شاعری بھی زیادہ تر داخلی مؤثرات کی حامل ہے۔ اس لیے

شاعری کو محض شخصی، سماجی، نفسیاتی دستاویز یا تاریخی وعصری معلومات کی ترسیل کا وسیلہ قرار دینا غیر متعلقہ امر بن کر رہ جاتا ہے۔ شاعری اپنا تعلق حقیقت سے قائم کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ مجموعی طور پر شاعری خارجی حقیقت نگاری ہی کا فریضہ سرانجام دیتی رہی ہے۔ حقیقت نگاری کا یہ رجحان شاعری کو زیادہ سے زیادہ خشک منطقیات کا شکار کرتا رہا ہے۔ غزل ایک داخلی صنف ہے اگر اس کا دائرہ عمومی احساسات کی ترجمانی تک محدود کر دیا جائے تو اس میں انفرادیت نہیں رہتی۔ میرؔ کی غزل داخل کے تمام تقاضے پورے کرتی ہے۔ نقادوں نے اس کو ہر سطح پر حقیقت سے ہم رشتہ قرار دیا ہے۔ اصل میں وہ اس کی اہمیّت کو منوانا چاہتے تھے لیکن اس جوش میں انھوں نے میرؔ کے شعری وجود کو معرضِ ہلاکت میں ڈال دیا۔ ان کی شاعری میں ان کی نجی، سماجی اور سیاسی زندگی کی حقیقتوں کی نشان دہی کی جانب ہی ساری توجہ صرف کی گئی ہے۔ جب کہ شاعری خالصتاً تخلیقی عمل ہے۔ یہ دیگر شعبہ ہائے فکر کی طرح واضح اور فوری نوعیت کی مقصدیّت کو اپنا نصب العین نہیں بناتی بلکہ نورِ بصیرت کو عام کرتی ہے اور نادیدہ سچائیوں کا عرفان عطا کر کے ذہن کو شاداب رکھتی ہے۔ میرؔ خالصتاً تخلیقی فن کار ہیں۔ ان کی تخلیقی بصیرت کے نفسیاتی پہلوؤں کو دیکھا جائے تو وہ بچپن سے لے کر تادمِ مرگ مشکلات میں گھرے رہے۔ ان مشکلات نے ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیا لیکن وہ پیدائشی طور پر خلاق ذہن لے کر آئے تھے جس کے سہارے انھوں نے اپنی شخصیت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا۔ ان کے ہاں عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میرؔ کے ہاں قنوطیّت نہیں کیونکہ یاسیّت ان کا مستقل ذہنی رجحان نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں جنون ایک روایتی جنون نہیں بلکہ بعض اوقات یہ ایک شدید جنونِ جستجو میں بدل جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے مخصوص جذباتی روابط، ذہنی میلانات اور فکری توسیعات کا تجزیہ ان کے تخلیقی ذہن کی سچائی یا قوت اور انفرادیّت کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ شاعر محسوسات کا اظہار الفاظ کے ذریعے کرتا ہے۔ اسے خودشناسی کے کرب انگیز عمل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ لسانی شعور کے جانکاہ مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور اپنے جذبات کو ایسے الفاظ میں ڈھالنا ہوتا ہے جو سماجی منظوری کی سند رکھتے ہوں۔ میرؔ کو

ایک ایسے شاعر کا درجہ حاصل ہے جس نے آفاقی نوعیّت کی شعریات کی داغ بیل ڈالی، کیونکہ وہ فناہ فی الشعر ہو گئے تھے۔ ان کا شعری شعور ارادی منصوبہ بندی کا حامل نہیں ہے بلکہ یہ فطری اور جبلی ہے۔ ان کے ہاں تجربے لفظ و پیکر کا روپ دھار کر ایک مکمل اکائی کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو ایک فطری نموپذیر وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ انھوں نے پوری قوت اور توانائی کے ساتھ زبان کو شعری ضروریات کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ فن میں ابہام کے قائل ہیں اور تجربے کو بے حجاب نہیں کرتے۔ ایسے شعروں میں پیکریت، علامتی معنویّت سے بھر جاتی ہے۔

میؔر کے ہاں ایسے اشعار بھی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں جو لفظی آرائش، خارجیّت اور سطحیت کا شکار ہیں۔ ایسی شاعری ان کا عمومی بیان بن کر رہ جاتی ہے اور یہ کلام پستی کی آخری حدوں کو چھو لیتا ہے لیکن بلند پایہ اشعار تجربے اور فن کے مکمل امتزاج کے مظہر ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار کی تخلیق میں بڑی محنت کی ہے۔ ان کے ہاں جو خون کی علامت ہے وہ ان کے تخلیقِ فن میں جگرکاوی پر دلالت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار لعل و گہر کی آب و تاب کے حامل ہیں۔ نقادوں کی کم توجہ کے باوجود ان اشعار کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ:

> ''ان کے یہاں لسانی سطح پر غزل کی ہیئت کا واحد رنگ نہیں ملتا۔
> کہیں ان کا لہجہ سنجیدہ اور فارسیت آمیز ہے۔ کہیں سادہ اور برجستہ،
> تاہم مجموعی طور پر ان کی غزل نفاست، پاکیزگی اور توازن کا تاثر
> پیدا کرتی ہے لیکن یہی ایک تاثر مرتب نہیں ہوتا بلکہ حزنیہ، نشاطیہ،
> طنزیہ، مکالماتی، سرگوشیانہ، فکاہیہ اور بزرگانہ لہجوں کا احساس بھی
> ہوتا ہے۔'' ۲۸

مصنّف نے اس کتاب میں اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ میؔر کی شاعری صرف اور صرف حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری تخلیقی شان کی حامل ہے کیونکہ وہ پیدائشی شاعر تھے۔ لیکن اُن کی شاعری کی قدر اتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ میؔر نے چونکہ شاعری کو تولّدِ دیگری سے گزارا اس لیے انھیں قدر ناشناسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ روایت پرست ہوتے تو انھیں اس قسم کی صورتِ حال

کا سامنا نہ کرنا پڑتا بلکہ وہ بہت زیادہ سراہے جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرؔ کی قدر شناسی نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ رہی ہے کیونکہ ان کی شاعری کی خوبیاں نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جا رہی ہیں۔

''میر تقی میرؔ ۔۔۔ حیات اور شاعری'' خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ہے جس میں میرؔ کی شاعری کو تاریخی پس منظر کے حوالے سے دیکھتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ جب دلّی اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال سے گزر رہی تھی تب بھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ عام مایوسیوں کے باوجود شاعری محبت ایثار اور غیرت و شجاعت سے بھرپور تھی۔ میرؔ نے ایسے حالات میں مخصوص علامتی انداز میں عوام کے دل کی دھڑکنوں اور رمزیّت میں خارجی حقیقتوں کو سمو کر رکھ دیا۔ انھوں نے ایہام کی مذمّت کی جب کہ فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ اس طرح غزل کو ایک نیا مزاج دیا گیا جو بلند معنویت اور اعلیٰ سنجیدگی کا حامل تھا۔ ان کی غزل میں اختصار، نغمگی اور رمزیّت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔

میرؔ کے اسلاف کے بارے میں ''ذکرِ میرؔ'' کی بات ہی کو مستند سمجھا گیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی تباہی و بربادی کو بہت قریب سے دیکھا اور نامساعد حالات میں زندگی گزاری۔ یہی حالات تھے جن میں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ اگرچہ وہ قلزمِ خوں کے شناور تھے لیکن غمِ عشق اور غمِ آفاق کو انھوں نے مردانہ وار اُٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں آگ کی سی لپیٹ اور قیامت کا سا ہنگامہ نظر آتا ہے۔ اس جگر چاکی کے باوجود وہ ساری زندگی باوقار رہے۔ ان کے کلام میں سماجی شعور اور تاریخی سچائیاں بڑی واضح ہیں۔ ان کی سیرت اور کلام دونوں میں تناقصات ہیں اور یہ تناقصات اس حد تک ہیں کہ ہمارے سامنے دو میرؔ کھڑے رہتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرؔ کے انداز اور شاعری کے بارے میں مصنّف لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے انداز میں اگر غور کیا جائے تو تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، یہ تمام خصوصیات پورے طور پر موجود ہیں۔ وہ شاعری کو ''فنِ شریف'' سمجھتے تھے اور اس کے لیے علمی قابلیت اور سلیقۂ شاعرانہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔'' ۲۹

میرؔ کی غزل تمام خوبیوں کی حامل ہے جب کہ قصیدہ کسی حد تک بلند پایہ نہیں ہے، کیونکہ قصیدے کے لیے جس حد تک الفاظ کا شکوہ، طبیعت کی بلند پروازی، مضامین کی طُرفگی، جوش، زور اور مبالغے کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان کے ہاں نہیں تھے لیکن:

''میرؔ کی شاعری بڑی شاعری ہے، وہ ہمیں ''من و تو'' کی محدود فضا سے نکال کر کبھی کبھی کائنات کی وسعتوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ان کے یہاں حیات و کائنات کا شعور و احساس موجود ہے اور انھوں نے ان بلندیوں تک اپنی خلاّقانہ سادگی و پرکاری اور غم انگیز وجدان کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ان کے یہاں جو معصوم اُداسی، نرمی، گھلاہٹ، ضبط اور پندار ہے وہ اُردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہے۔ ان کا غمِ عشق، غمِ آفاق سے گزرتا ہوا بلند ترین المیہ کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ اس میں وہ گہرائی، سنجیدگی اور خیر و برکت ہے جو بغیر آگ کو گلزار بنائے ہوئے پیدا نہیں ہوتی۔'' ۳۰

محمد شاہی دور میں ریختہ اتنا عالی درجہ نہیں تھا جتنا میرؔ نے اسے بنا دیا۔ انھوں نے اسے صرف پاکیزہ اسلوب ہی نہیں بخشا بلکہ ذوق و سلیقہ اور خونِ جگر کی آمیزش سے اس قابل بنا دیا کہ وہ مہذب محفلوں میں جگہ پا گیا۔

مصنف نے اس کتاب میں جہاں پر میرؔ کے حالاتِ زندگی کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہاں پر اُن کی شاعری پر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ انھوں نے میرؔ کی شاعری کو تاثراتی انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کو بڑی حد تک نمایاں کیا ہے۔

''اسلوبیاتِ میرؔ'' پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کر کے میرؔ کے اسلوب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ حصہ اوّل میں مصنف لکھتے ہیں کہ ایک دن آرزوؔ نے سوداؔ کا یہ مطلع پڑھا:

ع چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

اس پر میرؔ نے فی البدیہہ یہ مطلع پڑھا:

ع ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

اس پر خان آرزوؔ بڑے خوش ہوئے۔ مصنف نے یہ واقعہ ناصرؔ لکھنوی سے روایت کیا ہے۔ اس شعر پر حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں سب سے پہلے بحث کی ہے۔ مصنف نے اس واقعہ اور مقدمہ شعر و شاعری کے حوالے سے میرؔ کی شاعری کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔ میرؔ کے بارے میں عام نقادوں کی رائے کہ وہ بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں، غلط ہے کیونکہ:

"میرؔ کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اُردو کا ہے لیکن لفظوں کے سُر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میرؔ کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میرؔ کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے۔" ۳۱

میرؔ کی سادگی، پرکاری کے ساتھ اتنی تہ نشین ہے کہ بظاہر سادہ ہی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے "نکات الشعراء" میں ریختہ کی جو چھے قسمیں گنوائی ہیں ان میں سے چوتھی اور چھٹی قسم کی مدد سے ہم میرؔ کے انداز کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ان فارسی ترکیبوں کا صرف جائز سمجھتے تھے جو زبانِ ریختہ کے موافق ہوں۔ اُن کے بنیادی اسلوبیاتی امتیازات یہ ہیں:

۱۔ ان کی زبان میں اسماء یا اسمائے صفت کی بھرمار نہیں۔
۲۔ طویل بحروں میں بھی چھوٹے چھوٹے نحوی واحدے موجود ہیں۔
۳۔ اسماء کی قلت و کثرت سے مضاف اور مضاف الیہ کا رشتہ اور اضافت کا کردار بھی متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ ان کی زبان اپنی طاقت دھرتی کی گہرائیوں میں پیوست پراکرتوں سے حاصل کرتی ہے جسے اُردو پن یا ٹھیٹھ پن کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ ان کے ہاں مصوّتوں کا استعمال دیگر صاحبِ اسلوب شعراء کی نسبت زیادہ ہے۔

میؔر Oral روایت کے آخری شاعر ہیں۔ اس کے بعد چھاپہ خانہ آ گیا جس نے علمی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس لیے ان کا عام انداز یہ ہے کہ گویا باتیں کر رہے ہوں۔ ان کے ہاں سہل ممتنع کا ذکر سب نے کیا ہے لیکن اس کا اسلوبیاتی پہلو یہ ہے کہ ان کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے اور:

> ''میؔر کی شاعری کی نحوی ساختیں غیر معمولی موزونیٔ طبیعت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ زبان کی عام ساختوں سے بے حد قریب ہیں۔ جملوں اور لفظوں کی ترتیب، گفتگو کی ترتیب سے دور نہیں۔'' ۳۲

دوسرے حصے کی ابتداء میں میؔر کی سادگی کو محض نظر کا دھوکہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ ان کے ہاں صرف نحوی سادگی ہے، معنوی سادگی ہرگز نہیں ہے۔ ان کی زبان صرف بول چال کی زبان نہیں، کیونکہ بول چال کی زبان کے صرف ظاہری معنی ہوتے ہیں اور شاعری کی زبان اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہوتی ہے اور:

> ''میؔر کی زبان اندر کی آگ میں تپتی ہوئی زبان ہے۔ میؔر کی باتیں عام باتیں نہیں۔ میؔر کا لہجۂ عام محض لہجۂ عام نہیں۔ میؔر کی شاعری کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں۔ یہ بول چال کی زبان سے یعنی دھرتی سے اپنا رس ضرور لیتی ہے لیکن یہ اعلیٰ درجے کی شعری زبان ہے۔'' ۳۳

میؔر نے فارسی تراکیب بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ انھیں جہاں ٹھیس لگی ہے وہاں سادہ ایمائی لہجہ اختیار کیا گیا ہے لیکن انھوں نے جہاں انکشافِ ذات، ماہیّتِ عالم یا ذات و کائنات کے فشار کی بات ہوئی ہے یا حیرت و استعجاب کے عالم میں کھوئے ہیں وہاں پر اکثر و بیشتر فارسی آمیز پراکرتی

امتزاجی پیرائے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے لہجے کی خوش آہنگی اور شیرینی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زبان کے تمام روپ اور پرتیں جیسی میرؔ نے کھنگالی ہیں اور زبان کے آئندہ امکانات کی جو بشارت انھوں نے دی ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ پوری اُردو زبان کے پورے شاعر کہلا سکتے ہیں۔

میرؔ کی زبان صدیاں گزرنے کے باوجود بھی تازہ ہے کیونکہ اس کا رشتہ بولیوں سے ہے۔ ہندی گیت کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ان کی گیت نما غزلیں اتنی مترنّم ہیں کہ ان کی پوری کیفیتوں کا بیان نہیں ہوسکتا۔ ان کی نغمگی میں غنائیت اور طویل مصوتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ریختہ جس رتبے پر پہنچا ہوا ہے اس میں ان کا کردار بہت اہم ہے، کیونکہ:

> ''میرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری اُردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔ ٹھیٹھ بول چال کی زبان سے انھوں نے شاعری کی زبان وضع کی اور فارسی زبان کی خوش آہنگ آمیزش سے ایمائی اظہار کی ایسی ایسی رفعتوں تک اک نوزائیدہ زبان کو پہنچا دیا کہ باید و شاید۔ میرؔ کے یہاں حسن کاری اور تہ داری کی بنیادیں دراصل زبان کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ ان کی سلاست، صفائی، لطافت اگرچہ بے ارادہ اور بے کاوش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پیچھے جو زبردست تخلیقی جوہر ہے وہ ایسا بھید بھرا معنیاتی زیروبم پیدا کرتا ہے کہ وجود کے بہت سے سُر اس کی زد میں آجاتے ہیں۔'' [۳۴]

میرؔ کے اسلوبیاتی پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر اشعار بھی درج کیے ہیں۔ ایک زمانے تک تنقید سوانحی عناصر کو سامنے لاتی رہی ہے یا شاعر کے سماجی ماحول کا زیادہ ذکر ہوتا رہا یا اس پر تاثراتی اور جمالیاتی انداز میں اظہارِ خیال ہوتا رہا ہے مگر تنقید کے جو نئے رُخ ہمارے سامنے آرہے ہیں ان میں اسلوبیات کو بہت زیادہ اہمیت دی جارہی ہے، کیونکہ کسی شاعر کا اصل کمال اس کی اسلوبیات ہی میں ہوتا ہے۔ ''اسلوبیاتِ میرؔ'' اس نئے تنقیدی انداز کے حوالے سے عملی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ اس کتاب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ میرؔ کی شاعری کی زبان صرف

اور صرف بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ اس زبان کی نحوی ساختیں بڑی حد تک بول چال کی زبان کی نحوی ساختوں کے قریب ہیں اور یہی بات ان کی طبیعت کی غیر معمولی موزونیت کا ثبوت ہے۔ میرؔ کا اسلوب ہی ایسی بنیاد ہے جس نے پوری اُردو شاعری کے حسن کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

''میرؔ کی شعری لسانیات'' قاضی افضال حسین کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں شعری اظہار کی حیثیت سے زبان کے اوصاف اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعری کی زبان پر بحث کرتے ہوئے غزل کی مخصوص زبان کے اوصاف بھی واضح کیے گئے ہیں کیونکہ یہ صنف غنائی مزاج کے سبب دیگر اصناف سے قدرے مختلف طرزِ اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔ اس باب میں مصنف نے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، علامت اور قافیہ پر بحث کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ میرؔ نے انھیں کس طرح استعمال کیا ہے۔ یہ تمام حربے شاعر اپنے باطن کے بے کم و کاست اظہار کے لیے کرتا ہے اور انھوں نے یہ تمام حربے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ کیونکہ:

> ''اپنی منفرد جذباتی کیفیات اور اپنے نادر تجربات کے بے کم وکاست
> اظہار کے لیے شاعر اس مادی دنیا سے ان اشیاء کا انتخاب کرتا ہے
> جو خود میں جاذب توجہ ہونے کے ساتھ ہی شاعر کے منفرد تجربات
> کے بھر پور اظہار کی بھی صلاحیت رکھتی ہوں۔'' ۳۵

''شعرِ میرؔ کے تعبیری و دلالتی پہلو'' کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ شاعر الفاظ کو عام گفتگو کے ذخیرے سے منتخب کرتا ہے لیکن اسے بے نام و سیال جذبات اور منفرد تجربات کے اظہار کی سطح تک بلند کرنے کے لیے ان کی تعبیرات کے مختلف پہلو سامنے لاتا ہے۔ غزل الفاظ پر پابندیاں عائد کر کے انھیں خاص طرح استعمال کرنے کا تقاضا کرتی ہے اور:

> ''میرؔ کی غزل الفاظ کے تخلیقی استعمال کی اعلیٰ ترین مثالوں میں سے
> ایک ہے۔ خصوصاً لفظ کی تعبیرات کو بروئے کار لانے اور انھیں اپنے
> تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنانے کا جو سلیقہ میرؔ کے اشعار میں نمایاں
> ہے۔ وہ اُردو کے دوسرے شعراء کے یہاں کم دکھائی دیتا ہے۔'' ۳۶

میؔر ان روایتی علامتوں کو جن کی شدّت کثرتِ استعمال سے تقریباً ختم ہو چکی ہوتی ہے، انوکھی معنوی جہتوں سے آشنا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے معمولی الفاظ میں بھی تعبیرات کے وہ پہلو روشن کیے ہیں جنھیں صرف میؔر کی دریافت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں تشبیہ کا دائرۂ کار عام طور پر محدود ہوتا ہے لیکن انھوں نے اس کی تلافی مشابہت میں ندرت پیدا کر کے کی ہے۔ استعاروں نے ان کے اشعار کے ظاہری حسن و لطف کو تو بڑھا دیا ہے لیکن معنویت کی سطح پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ کیونکہ:

''میؔر کے استعارے احساس و جذبے کا اظہار ہونے کے سبب قدرے
ساکن ڈوبے ہوئے مقابلتاً عام اور مانوس لگتے ہیں۔'' ۳۷

علامت استعارے سے ایک قدم آگے ہے۔ یہ مماثلت اور تخالف کی قدرے سطحی تفریق سے اوپر اُٹھ کر اس پورے تصوّر کا ایک جزو بن جاتی ہے جو شاعر کا مقصود ہو۔ میؔر نے اپنی شاعری میں شہر، گل اور لہو جیسی علامتوں کا اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف مظاہرِ کائنات کا پیکروں کی حیثیت سے استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مظاہر سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔

؎ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

''ترتیبِ نغمہ'' میں مصنف نے آہنگ، قافیہ، ردیف، صوت، مطابقت، تکرار، سہ حرفی، تضاد، تجنیس، اشتقاق، تنسیق الصفات، جمع اور ایہام پر بحث کی ہے۔ تخلیقِ شعر کے جس مرحلہ پر جذبہ لفظ کی شکل اختیار کرتا ہے وہاں پر الفاظ کی مخصوص ترتیب کے ساتھ ہی اس کے پڑھنے کے دوران میں مختلف الفاظ پر زور، ان کے درمیان وقفہ اور زیر و بم کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ یہ سب اجزاء مل کر شعر کا مخصوص آہنگ پیدا کرتے ہیں اور:

''میؔر کے شعر میں آہنگ کا دھیماپن جذبے کی ایک خاص نوعیت
سے تطابق کے ساتھ ہی ان کی شخصیت کا بھی اظہار ہے۔'' ۳۸

اس کتاب میں شعری لسانیات کے اصولوں کی مدد سے میؔر کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ نئی مغربی تنقید میں ایک رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ شاعری میں موضوعات اور سماجی ماحول وغیرہ کی اتنی

اہمیت نہیں ہوتی جتنی دکھائی جاتی ہے۔ جب فن پارہ کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو وہ بنیادی طور پر لفظوں کی ایک خاص ترتیب پیش کرتا ہے، چنانچہ اس کا مطالعہ یا اس کا تجزیہ استعارات، تشبیہات، تماثیل اور مختلف لسانی پیرایہ ہائے اظہار کو سمجھ کر ہی ممکن ہے۔ اس نئے نقطۂ نظر کے حوالے سے قاضی افضال حسین کا تجزیہ ''میرؔ شناسی'' میں اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں میرؔ کے بارے میں عام طور پر کہی گئی باتیں دہرانے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں میرؔ کی شاعری پر علمِ بدیع اور علمِ بیان کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے ان کے کلام کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ علمِ بیان اور علمِ بدیع کے ان حربوں کا استعمال جو کسی کلام کو خوبصورت بنا سکتے ہیں، ان کا میرؔ کے کلام میں استعمال تلاش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ بات بڑی واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ میرؔ نے علمِ بدیع و بیان کے کن کن حربوں کو کس کس طرح اپنے کلام کو خوبصورت بنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' مصطفیٰ کمال فاطمی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی پیدائش کا سال ۱۱۳۷ھ، ان کے والد کا نام محمد علی اور خطاب علی متقی لکھا ہے جو کہ صوفی اور درویش منش انسان تھے۔ میرؔ کی زندگی کے ابتدائی حالات و واقعات کے متعلق مصنف نے ''ذکرِ میرؔ'' کی روایات سے اتفاق کیا ہے۔ میرؔ کا زمانہ انتشار کا زمانہ تھا۔ انحطاط نے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا لیکن ابھی تک انفرادی انحطاط اور زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ دلّی مٹ رہی تھی لیکن ہر انسان کے دل میں اس کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

میرؔ سے پہلے کی شعری روایات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف بیان کرتے ہیں کہ دکن میں اگر چہ اُردو شاعری کی ابتداء نہیں ہوئی لیکن دکن نے اسے نکھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ دلّی میں اگر چہ اُردو شاعری ولیؔ دکنی سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن غالب رجحان فارسی شاعری کی طرف تھا۔ ولیؔ دکنی کی شاعری جب دلّی میں متعارف ہوئی تو دلّی کے شعراء نے بھی اُردو میں شاعری کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

تذکرہ نگاری کے بارے میں مصنّف کا خیال ہے کہ جب اُردو میں لوگوں نے شعر کہنے شروع کر دیے تو فارسی شاعروں کے تذکروں کی تقلید میں اُردو شاعروں کے تذکرے بھی لکھے جانے لگے، لیکن:

''یہ بات نہایت حیرت انگیز بھی ہے اور افسوس ناک بھی کہ اُردو شاعروں کے تمام اہم پرانے تذکرے اور بالخصوص ۱۲ویں صدی ہجری کے تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے۔'' ۳۹؎

تذکروں میں درج ذیل چار خصوصیات مشترک ہوتی تھیں:

۱۔ شاعر کے حالاتِ زندگی

۲۔ شاعر کی شخصیت اور اس کے ماحول کا بیان

۳۔ کلام پر رائے اور تنقید

۴۔ آخر میں انتخابِ کلام

ان تذکروں میں ہمیں اس دور کے تنقیدی معیار کی جھلک ضرور مل جاتی ہے۔ اس لیے انھیں ردی کاغذوں کا ڈھیر ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ''نکات الشعراء'' ہی کو اب تک اُردو شاعروں کے دستیاب تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ''نکات الشعراء کی خصوصیات'' کا بیان کرتے ہوئے مصنّف نے اس تذکرے کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ شاعر کی شخصیت، سیرت اور ماحول کا بیان

۲۔ واقعہ نگاری

۳۔ میرؔ کا نظریۂ شاعری

۴۔ کلام پر رائے اور تبصرے

۵۔ میرؔ کی اصلاحیں

۶۔ انتخابِ کلام

شاعر کی شخصیت، سیرت اور ماحول کے بیان میں میرؔ نے اختصار سے کام لیا ہے لیکن:

"میرؔ کے بیان میں اتنی جامعیت ہے کہ ہم آسانی سے اس شاعر کی شخصیت، اس کی افتادِ طبع اور اس کے ماحول کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر سکتے ہیں۔" ۳۹

"نکات الشعراء" میں میرؔ نے ایک اچھا نقاد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ سوداؔ ان کے حریف تھے لیکن انھوں نے بڑی خوبصورتی سے ان کی ساری شاعرانہ صلاحیتوں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کسی شاعر کی سیرت اور شخصیت کا بیان کرتے وقت ماحول کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ میرؔ اپنے تذکرے میں اختصار کے باوجود حالاتِ زندگی، سیرت، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ کلیم الدّین نے اردو شاعروں کے تذکروں میں اختصار کو ان کی خامی قرار دیا ہے لیکن میرؔ کے تذکرے کے بارے میں مصنّف اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے اس اختصار کے باوجود شاعر کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات، اس کی سیرت، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

"نکات الشعراء" میرؔ کے نظریاتِ شعری کے بارے میں بھی بڑی حد تک معلومات فراہم کرتا ہے جب کہ اس میں انھوں نے شاعری پر کوئی تنقیدی مقالہ تحریر نہیں کیا ہے۔ اُن کے خیال میں شاعری "فنِ شریف" ہے جس کے لیے "لیاقت" اور "سلیقۂ شاعری" کی ضرورت ہوتی ہے۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائیِ گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی اور خیال کے التزام کی حامل ریختہ گوئی کی طرز انھیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ صرف ان فارسی تراکیب کا استعمال جائز سمجھتے ہیں جو ریختہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ زبردست تنقیدی شعور کے حامل تھے۔ انھوں نے شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی تنقیدی اشارے کیے ہیں جن کے مطابق:

۱۔ شاعر سخن پر قدرت رکھتا ہو

۲۔ شعر میں ربط اور تاثیر ہو

۳۔ شاعر خوش فکر ہو

۴۔ شعر میں سادگی اور صفائی ہو

۵۔ ایہام نہ ہو

۶۔ توارد نہ ہو

۷۔ شاعر سخن فہم ہو

''نکات الشعراء'' میں کلام پر رائے اور تبصرے اس وقت کے تنقیدی مزاج کے مطابق ہیں جن میں رنگین بیانی کو کافی دخل ہے لیکن پھر بھی ہمیں میؔر کے ہاں ایک بلند معیار نظر آتا ہے۔ وہ گروہی تنقید سے آزاد نپی تلی آراء دیتے ہیں۔ ان کے ہاں اعلیٰ قسم کی تنقیدی صلاحیت اور صاف گوئی موجود تھی جس نے ان کے لہجے میں کہیں کہیں تلخی پیدا کر کے ان کی تنقید کو نقصان پہنچایا۔ وہ اپنی تنقیدی رائے دیتے وقت ذاتی تعلّقات یا اختلافات کو مدِّ نظر نہیں رکھتے۔ ''نکات الشعراء'' میں انھوں نے شعراء کے اشعار پر اصلاحیں دی ہیں جن سے ان کے تنقیدی شعور، مذاقِ شعری اور تنقیدی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ ''نکات الشعراء'' میں انتخابِ کلام کے وقت میؔر نے اپنے ذوقِ شعری کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے ہر شاعر کے صرف اچھے اشعار ہی شامل نہیں کیے بلکہ کم تر درجے کے اشعار کو انتخاب میں شامل کر کے اس انتخاب کو جامع بنا دیا ہے۔

''نکات کی تنقیدی اہمیت'' کو واضح کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ یہ تاریخی حیثیت سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ انھوں نے کلیم الدّین احمد کی اس رائے کو ردّ کر دیا ہے کہ تذکرہ نگار تنقید سے آگاہ نہیں تھے۔ کلیم الدّین احمد کے ساتھ ساتھ پرنسپل عبدالشکور کی اس رائے سے بھی اختلاف کیا ہے کہ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے دیکھیں تو میؔر میں تنقیدی صلاحیت نہیں تھی۔ اس دور کی تنقید کو موجودہ دور کی تنقید کے ہم پلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی اس میں تنقیدی عناصر غیر نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ''نکات الشعراء'' کی تنقیدی اہمیت سے انکار کرنے والوں سے مدلّل بحث کے بعد مصنّف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُردو تنقید کی ارتقائی تاریخ میں اس تذکرے کا اہم کردار ہے۔

''نکات الشعراء'' ہمارے لیے نئی اور مفید معلومات کا ذریعہ بھی ہے۔ اس سے جو نئی معلومات

ہمارے سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلے دکن کی ادبی خدمات کا اعتراف۔

۲۔ تذکرہ نگاروں میں ولیؔ کے اصل وطن اورنگ آباد کا اظہار۔

۳۔ اس زمانے میں دلی ہی کو عام طور پر ہندوستان سمجھا جاتا تھا۔

۴۔ ریختہ کے کچھ اشعار جو شیخ سعدیؔ سے منسوب تھے، اصل میں سعدیؔ دکھنی کے تھے۔

۵۔ مرزا مظہر کا اصل نام ''جانِ جاں'' ہے۔

''نکات کی سماجی اور معاشرتی اہمیّت'' واضح کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں:

''نکات الشعراء سے اس زمانے کی طرزِ معاشرت، زبان، گفتگو، اخلاق و عادات اور رسم و رواج وغیرہ کے بارے میں بہت سی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں اور سیاسی اور معاشی حالات اور ادبی ماحول کا بھی بہت کچھ اندازہ ''نکات'' سے کیا جا سکتا ہے۔'' [۴۱]

''نکات الشعراء'' کی مدد سے اس زمانے کی ادبی تحریکات اور رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُردو ادب کی خدمت میں مسلمان اور ہندو دونوں برابر کے شریک تھے۔ میرؔ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ یاس و حرمان میں گھرے ہوئے شخص تھے لیکن ''نکات الشعراء'' پڑھنے کے بعد یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ ''نکات الشعراء'' کا مطالعہ کرنے کے بعد، میرؔ بچپن ہی سے تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنے کے باوجود یار باش اور ہنس مکھ انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ناکامیوں، محرومیوں اور نااُمیدیوں کے ساتھ ساتھ مزاح اور شوخی بھی ہے۔

''نکات کی زبان اور اندازِ بیان'' کے زیرِ عنوان مصنّف لکھتے ہیں کہ:

''میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں اپنی نہایت صاف ستھری، پاکیزہ، لطیف، رنگین اور بامحاورہ زبان کا ثبوت دیا ہے۔'' [۴۲]

میرؔ پر اعتراضات کرنے والوں کی تعداد کافی ہے لیکن آزادؔ کے اعتراضات اور الزامات غلط بیانیوں اور زیادتیوں پر مبنی ہیں۔ غلط الزامات، جانبداری اور تاریخی غلطیاں ''آبِ حیات'' کی خامیاں

ہیں۔ مسعود حسن رضوی نے آزآد کی حمایت میں میؔر کے مخالفین کے جو بیانات درج کیے ہیں ان کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

"ان لوگوں کو برا لگتا ہے کہ میؔر میں وہ سب کچھ کیوں تھا جو ان میں نہ تھا۔ ان لوگوں کو میؔر کے اس ماحول اور اس معاشرت کی گندی فضا سے جس میں وہ ابھی تک محصور تھے، نکل جانا اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگے رہنا، اچھا نہیں لگتا۔" ۴۳

میؔر کو معترضین نے عام انسانی اقدار کی سطح پر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے وہ ان کی صحیح تصویر پیش نہیں کر سکے۔ آزآد کا میؔر کے حوالے سے ولؔی کے بارے میں یہ بیان کہ "وے شاعریت از شیطان مشہور تر" سے اختلاف کرتے ہوئے مصنف نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق "نکات الشعراء" میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ میؔر نے تو ولؔی کی تعریف کی ہے۔ مسعود حسن رضوی کے ان تمام دلائل کو جو انھوں نے آزآد کی آراء کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دیے تھے مصنف نے انھیں بھی ردّ کر دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آزآد نے قاسم دہلوی کے تذکرہ "مجموعۂ نغز" کو بطور حوالہ پیش کیا ہے جب کہ اصل "نکات الشعراء" ان کی نظر سے گزرا ہی نہیں ہے۔

"ماحصل" کے عنوان کے تحت مصنف نے اپنی تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کے مطابق "نکات الشعراء" تذکرہ نگاری کے دبستان کی بنیاد ہے۔ اس میں جو تنقید پائی جاتی ہے، وہ غیر جانبدار، بے باک اور بے لاگ ہے۔ نکات پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود نکات کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، کیونکہ:

"نکات الشعراء" اُردو تذکرہ نگاری کا سنگ میل ہے۔ تذکرہ نگاری کا پہلا دور اسی سے شروع ہوتا ہے اور میؔر اس دبستان کے بانی ہیں۔" ۴۴

مصنف نے میؔر کے تذکرہ "نکات الشعراء" پر بھرپور بحث کرتے ہوئے ان کے تذکرے کی خوبیوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ "نکات الشعراء" پر مختلف نقادوں نے جو الزامات عائد

کیے ہیں مصنف نے ان الزامات کا مدلّل انداز میں جواب دیتے ہوئے ''نکات الشعراء'' کی اہمیت کو تذکرہ نگاری کی روایت میں بھرپور طریقے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

''تذکرۂ میرؔ'' کے نام سے ایم۔ کے فاطمی نے میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعراء'' کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ مقدّمے میں مصنف نے میرؔ کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ان کی نثری تخلیقات بھی کم اہم نہیں ہیں۔ ''نکات الشعراء'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں دیگر تذکروں کی طرح اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس اختصار کے باوجود ان کے ہاں کافی جامعیّت ہے جس کی وجہ سے کسی شاعر کی شخصیت، افتادِ طبع اور ماحول کا ایک نقشہ مرتب ہو جاتا ہے، کیونکہ:

> ''میرؔ نے شاعروں کی جو تصویریں کھینچی ہیں، وہ نہایت جاندار ہیں اور ان کے بنائے ہوئے خاکے مختصر سہی لیکن مکمل نظر آتے ہیں۔'' ۴۵

میرؔ کے تذکرے میں حالات، سیرت و شخصیت اور ماحول کے بیان کے بعد متعلقہ بیان پر رائے اور تنقید ملتی ہے۔ یہ تنقید آج کی تنقید سے یقیناً مختلف ہے لیکن ان کی یہ تنقید ذوقی اور وجدانی ہونے کے باوجود اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔ اس تنقید میں نہ تو بے جا تعریف ہے اور نہ ہی جان بوجھ کر کسی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ''نکات الشعراء'' اُردو تنقید کی ارتقائی تاریخ میں ایک اہم اور بلند مقام کا حامل تذکرہ ہے۔ میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں شاعری کے معیار اور اصول مقرّر کر لیے تھے لیکن یہ اصول اور معیار خودساختہ تھے جنھیں انھوں نے ''نکات الشعراء'' میں ''خاتمہ'' میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے جو اصول بنائے، ان پر کاربند بھی رہے اور ان کے یہ شعری اور تنقیدی نظریات ان کے پختہ تنقیدی شعور کے عکاس ہیں۔

میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں شاعری کا جو انتخاب شامل کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر کیا ہے جس سے متعلقہ شاعر کی شاعری کی تمام خوبیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ ''نکات الشعراء'' اس لیے بھی اہمیت کا حامل

تذکرہ ہے کہ اس میں ہمیں چند مفید اور نئی معلومات بھی ملتی ہیں اور چند اہم اور الجھے ہوئے مسائل کا حتمی حل بھی اس میں موجود ہے۔

۱۔ میرؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دکن کے تقدم کو تسلیم کیا۔

۲۔ ولیؔ کے وطن کے سلسلے میں اختلاف کو ختم کرتے ہوئے انھوں نے انھیں اورنگ آبادی لکھا ہے۔

۳۔ سعدیؔ دکھنی کو غلطی سے سعدیؔ شیرازی سمجھ لیا گیا تھا۔ اس بات کی میرؔ نے وضاحت کی۔

۴۔ مرزا مظہر کا صحیح نام ''جانِ جاں'' واضح کیا۔

جہاں پر ''نکات الشعراء'' کی ادبی، تنقیدی اور تاریخی اہمیت ہے، وہاں پر یہ تذکرہ سماجی اور معاشرتی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ ''نکات الشعراء'' میں اس زمانے کی سماجی اور معاشرتی اقدار کی جھلک بڑی حد تک نمایاں ہے۔ میرؔ کی ذات میں کئی لوگوں نے مایوسی اور غرور پر بڑا زور دیا۔ ان کو غمزدہ، مایوس اور دنیا سے بیزار ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ مغرور سمجھا گیا لیکن ''نکات الشعراء'' پڑھنے کے بعد ان کے بارے میں ان نظریات کے حوالے سے نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ:

> ''نکات میں قدم قدم پر ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کی زندہ دلی، شگفتگی، خوش اختلاطی، گرم جوشی، یار باشی اور پاک مشربی کا مکمل اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع ہے۔ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد کافی ہے۔ وہ دوسروں کی عزت کرتے ہیں اور دوسرے ان سے نہایت عزت و احترام اور گرم جوشی سے پیش آتے ہیں۔'' ۴۶

''نکات الشعراء'' اگرچہ فارسی زبان میں ہے لیکن اس کی عبارت صاف و پاکیزہ، شیریں اور پرلطف ہے جو ان کی زبان دانی پر دلالت کرتی ہے۔ ''نکات الشعراء'' پر مختلف مقاصد کے تحت سینکڑوں اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن جن دو معترضین نے ''نکات الشعراء'' کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا

ہے، ان میں قدرت اللہ قاسؔم اور آزاؔد شامل ہیں۔ آزاؔد کے اعتراضات، قدرت اللہ قاسؔم کے چبائے ہوئے اور اُگلے ہوئے نوالے ہیں۔ مصنف کو جس تیسرے محقق پر اعتراض ہے وہ مسعود حسن رضوی ادیب ہیں جنھوں نے قاسؔم اور آزاؔد کی روایت کو برقرار رکھا۔ قاسؔم اور آزاؔد کا ''نکات الشعراء'' اور میرؔ کے بارے میں غلط بیانی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ''نکات الشعراء'' کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں بھی ''نکات الشعراء'' کے بارے میں انھیں باتوں کو بیان کیا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' میں بیان کی ہیں۔ مصنف نے ''نکات الشعراء'' کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر ہونے والے اعتراضات کا بھی بھرپور طریقے سے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

''میرؔ کی غزل گوئی۔۔۔ ایک جائزہ'' راشد آذر کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے فن کا جائزہ مختلف عنوانات کے تحت لیا گیا ہے۔ مصنف کے خیال کے مطابق میرؔ کے ہاں متضاد رویّے پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ ساری زندگی صرف ایک ہی راستے پر نہیں چلے بلکہ مختلف راستوں پر چل کر انھوں نے زندگی کے تجربات حاصل کیے۔ اس لیے:

> ''میرؔ عاشق بھی ہے، عاشق مزاج بھی ہے، حسن پرست بھی ہے، حسن فریفتہ بھی ہے، چومنے کے ذائقے اور بدن چھونے کی لذّت سے آشنا بھی ہے، اس کا دلدادہ بھی ہے۔ وہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ ظالم کو متنبّہ بھی کرتا ہے۔ حالات کا شکوہ سنج بھی ہے۔ اپنی خودی پر نازاں بھی ہے، اپنی سپردگی سے مسرور بھی ہے۔ محبوب کی پرستش بھی کرتا ہے، خود کو معبود بھی جانتا ہے۔ وہ مفکّر بھی ہے، مست و بے خود بھی ہے۔ غم سے نڈھال بھی ہے، مسّرت سے سرشار بھی ہے لیکن میرؔ وحشت میں بھی بے ادبی کا مرتکب نہیں ہوتا۔'' ۴۷

میرؔ صرف غم کے شاعر نہیں بلکہ ان کی طبیعت کے متضاد اور مختلف پہلو ہیں جنھوں نے ان

کے کلام میں تنوع پیدا کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر جذبے کو شخصی دائرے سے نکال کر کائناتی وسعت دے دیتے ہیں۔ بقول مصنف:

''میرؔ کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ غم ہو یا خوشی، عشق آسودگی اور حُسن فریفتگی ہو یا محرومی اور ناکامی وہ اپنے ہر جذبے کو اپنے شخصی دائرے سے پھیلا کر کائناتی وسعت دے دیتا ہے۔ اپنے نجی تجربے اور جذبے میں وہ دوسروں کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کی ہر شے کو شامل کر لیتا ہے۔'' ۴۸؎

ان کے کلام میں شوخی بھی ہے جب کہ عام طور پر نقادوں نے ان کے ہاں طنز کا ذکر کیا ہے۔ لوگ جب ان کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو عام طور پر ان کے فن کے اوصاف بیان کر دیتے ہیں لیکن فن کی باریکیوں کی تفصیل مثالوں سے واضح نہیں کرتے۔ ان کے کلام میں فکر اور جذبہ، اظہارِ فن کی حسن کاری کی وجہ سے باہم گھل مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نئی تراکیب بکثرت پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو شعوری کاوشوں سے نکھارا ہے اور اکثر اشعار میں اس طرح کا لہجہ اختیار کیا ہے کہ شعر رُک رُک کر پڑھنے سے اُن کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ بقول مصنف:

''میرؔ کی صناعی صرف الفاظ اور صوتی آہنگ کے ذریعے مصرعوں کو ترازو کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ وہ کئی صنعتوں کے ذریعے اپنے فن کا کمال دکھاتا ہے۔'' ۴۹؎

انھوں نے اپنی شخصیت کا مکمل اظہار اپنے فن کے ذریعے مختلف انداز سے کیا ہے۔ وہ اپنے تجربات کو بلا جھجک بیان کر دیتے ہیں۔ اس لیے نرگسیت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی خوبصورت تراکیب اور خیالات کے ساتھ ساتھ کئی رنگ بعد میں آنے والے شعراء نے استعمال کیے ہیں۔ یہ تقلید اچھے یا اچھوتے خیال کو اپنے ڈھنگ میں پیش کرنے کی شعوری کوشش ہے جس سے میرؔ کی شاعرانہ عظمت واضح ہوتی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جہاں پر کلامِ میرؔ کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کیا ہے، وہاں پر

ان کے کلام میں تنافرِ لفظی کی نشان دہی کر کے بہترین نقاد ہونے کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ ایک اچھا نقاد کسی فن پارے کی صرف اور صرف خوبیاں ہی سامنے نہیں لاتا بلکہ اس کی خامیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے تاکہ اس فن پارے کی قدر کا صحیح تعیّن ہو سکے۔

''میؔر کا تغزّل'' عبدالمغنی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے درج ذیل آٹھ عنوانات کے تحت ''میؔر شناسی'' کی کوشش کی ہے:

۱۔ میؔر کا تغزّل

۲۔ دورِ میؔر اور شاعر کا ردِّ عمل

۳۔ میؔر کی رومانیت

۴۔ میؔر کی قنوطیّت

۵۔ اسلوبِ میؔر

۶۔ میؔر کا عصری و تہذیبی احساس

۷۔ طرزِ میؔر کی خصوصیات

۸۔ مقامِ میؔر

مصنّف کے خیال کے مطابق میؔر، غالبؔ اور اقبالؔ ان تینوں شعراء کو نظم کی ہر ہیئت پر قدرت حاصل ہے لیکن میؔر و غالبؔ کی شہرت و مقبولیت کا مدار ان کی اُردو غزلوں پر ہے۔ میؔر کے فن کو ان کی تہذیبی قدروں کے تناظر میں کم ہی نمایاں کیا گیا ہے بلکہ رومانی اور تاثراتی تنقید کے زیرِ اثر ان کی رومانیت یا قنوطیّت اور کسی حد تک صوفیت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا، جب کہ کوئی شاعر حقیقی طور پر سب سے پہلے اپنے ماحول اور دور کا ترجمان ہوتا ہے۔ میؔر کو سمجھنے کے لیے اس دور کا تناظر مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے جس دور میں زندگی گزاری، وہ انتشار کا دور تھا، ان کی پوری زندگی ناموافق حالات میں گزری۔ وہ ذاتی اور اجتماعی زخموں سے چُور تھے جس کی وجہ سے ان کے دل میں سوز و گداز کی کیفیت حد سے بڑھ گئی۔ دراصل ان کا حزن و الم پورے معاشرے کا حزن و الم ہے۔ جہاں پر ان کے اشعار میں

دردناک حالات کی تصویر کشی ہے، وہاں پر ان کے حوصلے کا اظہار بھی ہے۔ ان کے بعض اشعار دورِ زوال میں لازوال مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

؎ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میرؔ کی رومانیت کو ہمارے ناقدین اور بالخصوص فراقؔ نے ان کی عشقیہ شاعری بنا دیا اور اس سلسلے میں انحرافِ نفسی (Perversion) تک کو زیرِ بحث لائے۔ رومانیت کا اصل مفہوم فطرت کا تجسس اور اس سے الفت بلکہ کائنات کے اسرار و رموز کی جستجو، حیات کی گہرائیوں کی تلاش اور زندگی میں مہم جوئی ہے۔ میرؔ جنس زدہ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ:

''میرؔ کی شاعری میں مجازی سے زیادہ حقیقی عشق کے اشارے
اس حد تک ہیں کہ انھوں نے گویا ایک فلسفے کے طور پر محبت ہی
کو ہستی کے ظہور کا منبع ومحرّک قرار دیا ہے۔'' ؁۵۰

میرؔ کے حالات یقیناً دردانگیز تھے لیکن انھوں نے ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود ادب و آداب اور پاسِ اخلاق کو مدِّنظر رکھا۔ اسی وجہ سے انھیں اپنی ذات کا حد سے بڑھا ہوا احساس ہے۔ ان کی دھیمی لے اور لہجے کی گھلاوٹ ان کے تغزّل کا مخصوص انداز ہے۔ ان کی الم پسندی واضح اور ثابت شدہ ہے، کیونکہ غم اور خوشی، زندگی کے دو رُخ ہیں۔ ان کی الم پسندی ان کے تجربات و روایات اور تخیلات و تصوّرات پر مبنی ہے۔ میرؔ کی قنوطیّت و یاسیّت، الم پسندی و دردانگیزی، ہستی کے صوفیانہ یا فلسفیانہ تصورِ فناہ کی تخلیق ہے، اس لیے ان کے ذہنی رویّے کو منفی کے بجائے مثبت تسلیم کرنا ہوگا۔

میرؔ کا اسلوب ہموار اور یکساں نہیں۔ جہاں پر اس میں سادگی اور نرمی ہے، وہاں پر شوکت وصلابت بھی ہے جو دیوان کے ضخیم ہونے کی وجہ سے ہے، ان کا عصری اور تہذیبی احساس زیادہ تر ان کے نفسی کوائف پر مشتمل ہے لیکن وہ سب سے پہلے اپنے معاشرے کے ترجمان ہیں۔ وہ جس معاشرے میں رہ رہے تھے، اس پر یاس و انتشار کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے حقیقتِ حال کو شدّت سے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذاتی غم ایک کائناتی الم بن گیا ہے۔

وہ باشعور، صاحبِ کردار اور ولی اللہ کے فرزند تھے۔ امیر، رئیس، بادشاہ سب کو ان کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ انھوں نے غریبی میں بھی خودی کی نگہبانی کی۔ اس کے باوجود انھیں اپنی ناتوانی اور بے مائیگی کا بھی کم احساس نہ تھا۔ وہ اپنا مطمعِ نظر رکھتے تھے جو ان کے ہم عصروں اور ہم مشربوں سے بلند تھا۔ اُن کا دردِ دل صرف ایک فرد کا معمولی سا دردِ دل نہیں تھا بلکہ ان کا نوحہ پوری قوم کا نوحہ تھا۔ محبت کا وسیع تصور ان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اسی لیے:

> ''بے تہ لوگوں کو، میرؔ کی اس عظیم الشان عشقیہ شاعری کی تہ نہیں ملتی۔ لہٰذا وہ محض سطح پر تیر کر یا ساحل سے سرسری مشاہدہ کر کے رہ جاتے ہیں، ورنہ تہ میں پرورش پانے والے میرؔ کے تغزّل کے تاب دار موتیوں کا ان کو اچھی طرح پتہ چلتا۔'' [۵۱]

میرؔ کے کلام میں ابتذال اور ارتفاع کو برابر برابر سمجھ لینا مبصروں کی ذہنی پستی ہے۔ ان کی شاعری میں مذکّر کا صیغہ فارسی روایت کا عکاس ہے۔ ان کے کلام میں سراسر خونِ جگر ہے۔ ان کا تغزّل دلوں میں ایک محشر بپا کرتا ہے اور ہر دل، حالات کی اس دردنا کی کو محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے شاعر کے دل سے ایک پرتاثیر آہ نکلتی ہے۔ یہ تاثیر تطہیر کا باعث بنتی ہے جو ایک مثبت اور تعمیری عمل ہے۔ ان کے کلام میں اصلیت سے زیادہ عصریت ہے، کیونکہ وہ اپنے دور اور معاشرے کے تصوّرات کی عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو اپنے ذہن و کردار میں جذب کیا۔ ان کے اسلوبِ تغزّل کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ طرزِ میرؔ عام فہم ہے۔ اس لیے کہ بالعموم سادہ و بے ساختہ ہے۔ انھوں نے زبان کو پہلے سے زیادہ صاف ستھرا کیا۔

۲۔ متروکاتِ میرؔ، طرزِ میرؔ کا معیار نہیں۔ تاریخِ ادب ان کا شمار عجائباتِ میرؔ میں کرے گی خواہ وہ نوادرات ہوں۔

۳۔ طرزِ میرؔ کی اصل خوبی ان کے رنگ میں نہیں، آہنگ میں ہے۔

۴۔ میرؔ کا کمال میرؔ کا ہے اور ان کے دور ہی کی حد تک مثالی ہے۔ آفاقیت ان

کے موضوع میں ہو سکتی ہے، نہ کہ اسلوب میں، جس کی تقلید بعد والوں کے لیے نہ پسندیدہ ہے، نہ معقول و ممکن۔

۵۔ طرزِ میرؔ کا احیاء موجودہ زمانے میں اگر ہے تو وہ عام رجحان نہیں بلکہ چند طبیعتوں کا ذاتی میلان ہے۔ میرؔ کا اسلوبِ سخن ایک ادبی تبرّک ہے جس سے ہم محظوظ ہو سکتے ہیں، مستفید نہیں۔

۶۔ میرؔ کے انتخاب کلام کی نرمی و سادگی اور روانی و بے ساختگی ایک معقول و مقبول طرزِ تغزّل ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری کا ایک پختہ و اعلیٰ نمونہ ہے۔

۷۔ اسلوبِ میرؔ کی خصوصیّت و انفرادیت ایسے صاف، فصیح اور بلیغ شعروں تک محدود ہے جن میں انھوں نے اپنے اور اپنے ماحول کے دردِ جگر کو آئینہ دکھایا ہے۔

اسلوب و آہنگ میں تغزّل، غالبؔ اور میرؔ دونوں کے ہاں ہے لیکن غالبؔ کے اشعار پڑھ کر دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے جو میرؔ کے اشعار میں رکتی سی محسوس ہوتی ہے۔ کیف کے اس فرق نے غالبؔ کی غزل زیادہ جاندار اور شاندار بنا دی ہے۔ غزل گوئی اور تغزّل میں میرؔ پر غالبؔ اور غالبؔ پر اقبالؔ کو برتری حاصل ہے لیکن اس کے باوجود میرؔ کے دریائے سخن کے کچھ موتی اقبالؔ کے بحرِ ذخّار میں بھی شامل ہیں۔ اقبالؔ نے مجموعی اور عمومی طور پر پوری اُردو شاعری کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان میں میرؔ کی روایتِ تغزّل بھی ہے اور غالبؔ کی بھی، کیونکہ:

> ''یہ تینوں اُردو شاعری اور تغزّل کے ارتقاء میں، عصری حسیات اور اسلوب و طرز کے اختلاف کے باوجود، اپنی اپنی جگہ سنگِ میل ہیں اور عظمتِ فن کا ایک مثلث بناتے ہیں۔ اس میں ترجیح اور تفوق کے اعتبار سے پہلا زاویہ اقبالؔ کا ہے، دوسرا غالبؔ کا اور تیسرا میرؔ کا۔'' ۵۲

اس تقابلی مطالعے کے باوجود میرؔ کے کلام کی ایک تاریخی اہمیت ہے اور کلامِ میرؔ کے کیف میں سب سے بڑا اور بنیادی حصہ ان کی غزل اور اندازِ تغزّل کا ہے۔ تغزّل میرؔ پر ختم نہیں ہوا بلکہ

اس کا ارتقاء جاری رہا۔ میرؔ کا تجربہ بعد کے ترقی پذیر اسالیب کے لیے ایک مستند کلاسیکی روایت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ان کا تاریخی مقام ان کے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ کے علاوہ تصورات کی حسین پیش کش سے بنتا ہے۔ یہ تصورات ان کی میراث تھی جسے انھوں نے اپنے اشعار میں آنے والی نسلوں کے لیے جمالیاتی طور پر منتقل کیا اور یہ میرؔ کے تغزل کا کارنامہ ہے جو انھیں غالبؔ اور اقبالؔ کا پیش رو بناتا ہے۔ اقبالؔ، غالبؔ اور میرؔ تینوں کے ہاں ''تماشائے حیات'' اس کے عناصر کے رنگوں کی ترکیب میں اختلاف کے ساتھ رونما ہوتا ہے جو ایک حوصلہ شکن ماحول میں بھی جینے کا حوصلہ بڑھا دیتا ہے۔ اُردو شاعری میں معیارِ نظر کی یہ وحدت عہدِ میرؔ سے عصرِ اقبالؔ تک قائم رہی۔ بقول مصنف:

> ''ترقی پذیر روایتِ تغزل میں میرؔ کا تاریخی تقدم، غالبؔ کی
> پیش قدمی اور اقبالؔ کا نقطۂ عروج واضح ہے۔ اُردو تغزل میں
> یہی مقامِ میر ہے۔'' ۵۳

اس کتاب میں مصنف نے میرؔ کے ہاں تغزل کی تلاش کے بعد اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ تاریخی اعتبار سے تغزل کے حوالے سے غالبؔ اور اقبالؔ پر میرؔ کو زمانی اعتبار سے برتری حاصل ہے لیکن تغزل کا یہ ارتقاء غالبؔ کے دور میں جاری رہا اور غالبؔ نے تغزل کی وہ صورت جو میرؔ کے ہاں تھی اس کو مزید بہتر صورت میں پیش کیا اور اقبالؔ کے ہاں تغزل کا عروج پایا جاتا ہے۔ تغزل کے اصل رنگ کے حوالے سے غالب کو میرؔ پر برتری حاصل ہے اور اقبالؔ کا مقام ان دونوں شعراء سے بلند ہے۔

''خدائے سخن، میر تقی میرؔ'' ادریس صدیقی کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ تمام سخن فہم، تذکرہ نگار اور جدید نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کی خود بھی تعریف کی ہے جسے سرسری نظر سے دیکھا جائے تو شاعرانہ تعلّی کا احساس ہوتا ہے لیکن جب ہم ان کی زندگی اور شخصیت کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں تو اسے خودشناسی کا نام دینا زیادہ مناسب لگتا ہے۔

میرؔ کا عہد تباہ کاریوں کا عہد تھا۔ اس کے اثرات ان کی شاعری پر بھی پڑے۔ اورنگ زیب

عالمگیر کی وفات کے بعد اندرونی سازشوں کے سبب حکمرانوں کی آئے دن تبدیلی نے سیاسی ناپائیداری پیدا کر دی۔ نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کی تباہ کاریوں نے دلّی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور:

> ''میرؔ کی غزلوں میں بھی ان المناک حالات کا درد و اثر موجود ہے مگر یہ فن کے پردے میں، سیاسی تاریخ کے یہ المیہ ڈرامے میرؔ کی آنکھوں کے سامنے کھیلے گئے۔ انھوں نے کسی محفوظ ساحل سے اس طوفان کا نظارہ نہیں کیا بلکہ یہ موجِ خون ان کے سر سے گزری ہے اور وہ خود بھی گردابِ بلا میں گرفتار رہے۔'' ۵۴

انگریزوں سے لے کر مرہٹوں تک سب نے دلّی کو لوٹا۔ اس تباہی کے سبب اہلِ فن گوشۂ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ چلے گئے۔ وہ بھی ان میں شامل تھے لیکن دیگر شعراء سے وہ اس لیے منفرد ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ میں بھی اپنا مخصوص رنگ قائم رکھا۔ لکھنؤ میں آصف الدّولہ نے انھیں خوب عزت دی۔ اس کے باوجود وہ اپنی نازک طبع کو نوابی مزاج سے ہم آہنگ نہ کر سکے اور اس سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔

اس کتاب کے مطابق میرؔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد علی متقی درویش منش انسان تھے۔ انھیں والد کی صحبت کے ساتھ ساتھ میر امان اللہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی جن کی عاشقانہ طبیعت نے ان پر بہت زیادہ اثر کیا۔ دس سال کی عمر میں والد اور چچا دونوں کا انتقال ہو گیا جس کے بعد وہ مصائب کا شکار ہوئے۔ غمِ روزگار تو تھا ہی، غمِ عشق نے بھی انھیں نہ چھوڑا۔ ان کی سخن دانی میں خان آرزؔو کا بڑا ہاتھ ہے لیکن بعد میں ان کے خان آرزؔو کے ساتھ تعلّقات خراب ہو گئے۔ زمانے کے خراب حالات کی وجہ سے ان کے لیے شریفانہ زندگی گزارنے کے تمام ذرائع محدود ہو کر رہ گئے جس کی وجہ سے انھوں نے کئی نوابوں کے احسانات اُٹھائے اور اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا۔ انھوں نے اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ انھیں مالی مشکلات کا سامنا تو ساری عمر رہا لیکن زندگی کے آخری حصے میں یہ مشکل کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ اگر چہ انھوں نے کئی تبدیلیاں دیکھیں لیکن خود تبدیل نہ ہوئے۔ وہ بیرونی تبدیلیوں کو جذب کر کے انھیں شعر کی صورت دیتے رہے۔ ان کے نزدیک شاعری کے کچھ اصول اور لوازم تھے جن کی پابندی لازمی تھی۔ اُن کے نظریۂ شاعری کے بارے میں مصنّف کا خیال ہے کہ وہ

میرؔ کو غزل، مثنوی اور واسوخت پر جو قدرت حاصل ہے وہ دیگر اصنافِ شاعری پر نہیں۔ وہ غزل کے شہنشاہ ہیں لیکن اس کے باوجود غزل بھی نشیب و فراز سے خالی نہیں۔ واسوخت انھوں نے بڑے اہتمام سے لکھے ہیں۔ قصائد میں تخیل سے زیادہ محاکات کا رنگ ہے اس لیے قصائد میں سوداؔ کو میرؔ پر برتری حاصل ہے۔

''کلاسکی ادب'' خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ہے جس میں میرؔ کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے ان کے کلام میں تاریخی حالات کے شعور کا جائزہ لیا گیا ہے جہاں پر ایک طرف اُن کے ذاتی غم والم کا ذکر ہے وہاں پر سلطنتِ مغلیہ کی تباہی و بربادی کی داستان کا بھی بیان ہے جس نے ان کے غم میں اضافہ کیا۔ دلّی پر مختلف حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے سلطنتِ مغلیہ کی اقتصادی حالت بھی تباہ ہو گئی۔ ایک طویل مدت تک قتل و غارت کا یہ بازار گرم رہا۔ میرؔ نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے اس لیے ان کے کلام میں ان واقعات و حالات کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں سارا ماحول سمو گیا ہے۔

میرؔ کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں سماجی شعور اور تاریخی سچائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں محض ذاتی غم نہیں بلکہ سماجی حقائق بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں بجھتے ہوئے دلوں اور لٹے ہوئے نگر کا ذکر محض رسمی نہیں، کیونکہ:

> ''میرؔ کے کلام میں سماجی شعور اور غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی اتنی صحیح آمیزش ہے کہ ان کے اشعار میں واقعی ایک ''آگ کی سی لپیٹ'' اور ''قیامت کا سا ہنگامہ'' ہے۔ یہ اشعار صرف شاعر کے انفرادی تجربہ ہی کے ترجمان نہیں بلکہ عوام کی دکھی ہوئی زندگی کی فریاد بھی ہیں۔'' ۴۳

''ذکرِ میرؔ'' میں جہاں پر انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو قلم بند کیا ہے، وہاں پر اجتماعی حالات کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس میں محمد شاہ کے انتقال سے لے کر غلام قادر روہیلہ کے ظلم و ستم کے واقعات، مغلوں، مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور انگریزوں کے متعلق ایسی معلومات درج ہیں جو عام تاریخی کتابوں

میں موجود نہیں ہیں۔ مؤرخین نے اس کتاب کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر وہ اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کرتے تو انھیں اس وقت کے تاریخی حقائق بڑی مقدار میں مل جاتے۔

مصنف نے اس کتاب میں میرؔ کی سیرت کا جائزہ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے لیا ہے۔ عام طور پر میرؔ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ بہت ہی کم اختلاط اور خلوت پسند آدمی تھے لیکن ''نکات الشعراء'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرسوں اور میلوں میں شرکت کرتے۔ اپنے گھر مشاعرے کرواتے، دوستوں سے باہم مل بیٹھتے اور ہنسی کی باتیں کرتے تھے۔ وہ عاشق مزاج اور حسن پرست بھی واقع ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے بعض شاعروں کا جمالی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں میرؔ کو سماجی پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے اور ان کی اہمیت عمرانی تنقید کے حوالے سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

''مقدمہ شعر و شاعری'' الطاف حسین حالیؔ کی تصنیف ہے جس میں ادب اور زندگی کے تعلق کو زیرِ بحث لاتے ہوئے شاعری کی اصلاح کے لیے اصول بنائے گئے ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے دلائل کی وضاحت کے لیے مختلف شعراء کے کلام سے مثالیں بھی دی ہیں۔ ''جوش'' پر بحث کے بعد ''میرؔ'' کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

ے ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یہ شعر لکھنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

''ایسے دھیمے لہجے میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چُھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں۔'' ۴۴

حالیؔ کے خیال کے مطابق میرؔ نے معمولی خیالات کو جو صدیوں سے شاعری میں آ رہے تھے اس سادگی اور صفائی کے ساتھ نرالے اسلوب میں بیان کیا ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے جیسے:

ے اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میرؔ کے ہاں الفاظ کے استعمال میں بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسے اس شعر میں ''ایک'' کا لفظ ہے:

ع یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

میرؔ کی مثنویوں کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''اگرچہ میرؔ کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے، انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایت کے سیدھے سادے طور پر بیان کر دیے ہیں، نہ ان میں کسی شادی یا تقریب یا وقت کا، موسم کا سماں بیان کیا گیا ہے، نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے مگر جتنی میرؔ کی عشقیہ مثنویات ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے مبرّا ہیں۔'' ۴۵

''کاشف الحقائق'' امداد امام اثرؔ کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کو ''سلطان المتغزلین'' لکھا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ میرؔ کا بہت سا کلام ترک کر دینے کے قابل ہے لیکن اگر انتخاب کیا جائے تو ایک اچھا خاصا دیوان مرتب ہو سکتا ہے جس سے خوبصورت کلام اُردو میں دستیاب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل لکھتے وقت کبھی بھی وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

میرؔ کی غزلیں داخلیّت کی حامل ہیں اس وجہ سے ان میں سوز و گداز، خستگی، نشتریّت، رنگینی، ملاحت، شیرینی اور شوخی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے حسنِ کلام تک کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا۔

ع اپنی ہستی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

''وقت کی راگنی'' محمد حسن عسکری کی تصنیف ہے جس میں وہ میرؔ کو زیر بحث لاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ کائنات کے سامنے ہیچ مقداری کا احساس ہر ایک کو ہے۔ میرؔ بھی اس احساس سے نہیں بچ سکے۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں اس احساس کا بیان ہوا ہے لیکن وہ اپنی بے چارگی تسلیم کرنے کے بعد اپنی ذات کا مقابلہ دوسرے انسانوں سے بڑی جرأت کے ساتھ کرتے ہیں۔ بقول مصنّف:

''میرؔ قدم قدم پر اپنا دوسرے انسانوں سے مقابلہ کرتے ہیں، ان کے معیار سے اپنے آپ کو جانچتے ہیں اور اس معیار کے مطابق ان کی انفرادیّت میں جو خامیاں نکلتی ہیں انھیں بڑی جرأت سے تسلیم کر لیتے ہیں۔'' ۴۶

میرؔ کے خیال کے مطابق کوئی ایسی دنیا آباد نہیں کی جاسکتی جس میں وہ اکیلے رہیں۔ اس لیے وہ انسانوں میں رہ کر اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات سے پیار ضرور ہے لیکن وہ اپنی خامیوں کو بھی مان لیتے ہیں۔ اکثر وہ اپنے اوپر ہنستے ہوئے اور طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا طنز ایسا طنز نہیں ہے جس میں تلخی اور بیزاری ہو۔ اس میں اپنے آپ سے نفرت اور مایوسی نہیں ملتی بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیّت ہے۔ ان کے ہاں تخیّل اور شعریّت کی انتہائی بلندی پائی جاتی ہے۔ ان کا عشق صرف اپنا طرزِ زندگی نہیں بلکہ وہ طرزِ زندگی ہے جسے انھوں نے اختیار کر لیا ہے اور دوسرے انسان بھی اس طرزِ زندگی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

؎ سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

وہ عاشق سے زیادہ انسان ہیں اور اپنے ساتھ کسی ایسی رعایت کا تقاضا ہی نہیں کرتے جو دیگر انسانوں کے ساتھ نہ کی جاسکتی ہو۔ وہ غم کے شاعر ضرور ہیں لیکن وہ پوری دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے، وہ زندگی سے مایوسی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ جینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کیونکہ:

''میرؔ زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں ہوتے بلکہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قرار کی تلقین کرتے ہیں۔'' ۴۷

میؔر وہ شاعر ہیں جو اپنی خودی کو کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دیتے ہیں اور وہ اس خودی سے مایوس یا بیزار نہیں۔ ایسا شخص یاس پرست اور قنوطیت پسند نہیں ہوسکتا۔

اس کتاب میں محمد حسن عسکری نے میؔر کے تصوّرِ غم، تصوّرِ محبوب اور تصوّرِ خودی کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے تصوّرات ایک نظر دیکھنے سے عام سے لگتے ہیں لیکن جب ذرا غور کیا جائے تو یہ بڑی انفرادیت کے حامل ہیں۔

''خشک چشمے کے کنارے'' میں ناصؔر کاظمی نے چار مضامین کی مدد سے ''میؔر شناسی'' کی کوشش کی ہے۔ ایک مضمون ''میؔر کے زمانے کی عورت'' کے عنوان سے ہے جس میں میؔر کے زمانے اور آج کے زمانے کی عورت کی مماثلت اور فرق کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نئی عورت کو لوگ لباس کے حوالے سے نئی عورت جانتے ہیں جب کہ مصنف کو یہی لباس میؔر کے زمانے کی عورت کا نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''نئی عورت کو لوگ لباس کے واسطے سے نئی عورت جانتے ہیں
> مگر میں یہ کہتا ہوں کہ چست لباس تو میؔر کے زمانے کا ہے۔
> نئی عورت کے اگر بال کٹے ہوئے نہ ہوں تو عین مین میؔر کے
> زمانے کی عورت ہے۔'' ۴۸

دوسرا مضمون ''میؔر ہمارے عہد میں'' ہے جس میں مصنف نے میؔر کی شاعری کے مختلف عناصر کو یکجا کر کے پڑھنے پر زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں ان نامساعد حالات کا جاننا بھی ضروری ہے جن کا میؔر نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔

؎ معرکہ گرم تو ہو لینے دو خونریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے

اُن کے ہاں غم اور خوشی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ان کی شاعری میں عاشق اور معشوق کے تعلقات انسانی سطح پر ہیں۔ وہ زندگی

میں مختلف حوادث کا شکار رہے لیکن معاشرتی سطح پر بھی نمایاں رہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو معاشرے سے علیحدہ نہیں کیا اور زندگی بھرپور انداز میں بسر کی۔ وہ اپنی شاعری میں ''میرؔ'' کو سارے معاشرے کا استعارہ بنا کر پیش کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے عشق کے ذاتی تجربے کو بھی انھوں نے وسعت دے کر کائناتی رنگ دے دیا ہے۔ مذہب کے حوالے سے اگر انھیں دیکھا جائے تو ان کا تصوّرِ مذہب محدود نہیں بلکہ وہ دردمندی، آدمیت اور انسانی محبت کے متلاشی تھے۔

میرؔ کی شاعری کے چند اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرّکات میں چند باتیں مشترک ہیں۔ میرؔ جس ہجرت اور مصائب کے تجربے سے گزرے تھے، اِس عہد کے لوگ بھی اسی تجربے سے گزرے ہیں۔ اب اس جاں گداز تجربے کو ہر کسی نے روحانی سطح پر محسوس کیا۔ ان کی ہجرت اور ہماری ہجرت میں اگرچہ فرق ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے ہجرت کو قبول نہ کیا اور ہم نے ارادتاً اس ہجرت کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں رات کا استعارہ مایوسی اور نااُمیدی کا استعارہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس رات میں بھی زندگی بسر کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ نااُمیدیوں، مایوسیوں اور پریشانیوں کی یہ رات اقبالؔ تک آتے آتے ختم ہو رہی تھی۔ ویسے تو اقبالؔ اور میرؔ میں کسی قسم کی مماثلت کا تلاش کرنا بے کار ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبالؔ کے کئی تصوّرات میرؔ کے ہاں بھی موجود ہیں۔

''دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف'' ناصرؔ کاظمی اور انتظار حسین کے مابین ایک گفتگو ہے جس میں میرؔ کی عظمت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس مکالمے میں سب سے پہلے میرؔ کے ''امیج'' پر بحث ہے اور دونوں نقادوں نے میرؔ کے امیج کو تخلیقی امیج قرار دیا ہے کیونکہ انھوں نے جو بات ان کے ذہن میں تھی اسے باہر کے Landscape پر دکھایا ہے اور دنیا کے مناظر کو دل میں تلاش کیا ہے۔

؎ محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

میرؔ کی شاعری میں استعمال ہونے والی علامتیت ارادی اور شعوری نہیں کیونکہ ان کے انفرادی اور اجتماعی شعور میں حدِ فاصل نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے دل اور دلّی یعنی احساس اور احساس کا منبع دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔

میرؔ کی شاعری کے بارے میں یہ رائے کہ یہ صرف احساس کی شاعری ہے، صحیح نہیں، کیونکہ احساس فکر کی پہلی صورت ہے اور ان کی شاعری میں احساس و فکر، شیر وشکر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا کلام مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ اس لیے اس میں حشو و زوائد بھی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری خوبصورت ہے۔ اس شاعری میں جلال و جمال ہے۔ اسی وجہ سے ان کی پیروی کرنے والے برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان کی شاعری کی تقلید کرنا اور نہ کرنا دونوں مشکل ہیں، کیونکہ ان کی تقلید کرنے والا، مکمل تقلید نہیں کر سکتا اور روگردانی کرنے والا شاعری سے انصاف نہیں کر سکتا۔ ان کی شاعری ایک ایسا دھواں ہے جسے وہی تخلیق کر سکتا ہے جس کے اپنے سینے میں الاؤ ہو۔

''خوشبو کی ہجرت'' بھی ایک مکالمہ ہے جو ناصرؔ کاظمی، انتظار حسین، حنیف رامے اور شیخ صلاح الدّین کے مابین ہوا۔ اس مکالمے میں میرؔ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے تمام امکانات کو اُردو شاعری میں اظہار بخشنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شاعر اور ایک عالم کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سماج سے اپنے حقوق ادا کروانے کے بھی خواہش مند ہیں۔ جب سماج ان کی شاعرانہ اور انسانی حیثیت ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ انسانی تجربات کو قلبِ ہیئت کے بعد احیاء بخشتے ہیں۔ انھوں نے زبان کو شاعری بنا دیا اور اپنے ادب کی روایتوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے رشتہ بھی برقرار رکھا ہے لیکن ان کی شاعری پر ہندی زبان کے علاوہ فارسی اور عربی کے اثرات کو بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ناصرؔ کاظمی ایسے شاعر ہیں جن پر میرؔ کے بہت زیادہ اثرات ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دونوں کو ایک جیسا ماحول ملنا بھی ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے میرؔ کی شاعری کو سیاسی اور سماجی حوالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی شاعری میں ہجرت کے تجربے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ انھوں نے شاعرانہ تخیل کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی لفظی خوبیوں کو بھی بڑی کامیابی سے واضح کیا ہے۔

''اُردو شاعری کا فنّی ارتقاء'' ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب ہے جس میں سیّد ولی الرّحمٰن ولؔی کا تحقیقی مضمون ''اُردو کا پہلا واسوخت'' شامل ہے۔ جس میں شاہ مبارک کو اُردو کا پہلا واسوخت لکھنے والا

ثابت کرتے ہوئے میرؔ کی واسوخت نگاری میں اوّلیت کے نظریے کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ہے جس میں مصنف ''نکات الشعراء'' پر بحث کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ''نکات الشعراء'' کا سنۂ تصنیف مصنف نے اس تذکرے میں کہیں نہیں لکھا لیکن آنندرام مخلصؔ کی وفات کے حوالے سے لکھا گیا جملہ داخلی شہادت تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کا سنۂ تصنیف ۱۱۶۵ھ بنتا ہے لیکن اس تذکرے کا آغاز انھوں نے ۱۱۶۱ھ میں کر دیا تھا۔ میرؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں، کیونکہ ''نکات الشعراء'' کے مکمل ہونے تک کوئی تذکرہ بھی مکمل صورت میں ان کے سامنے نہیں تھا، وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے ''نکات الشعراء'' کے آخر میں ریختہ اور اس کی اقسام کی تعریف کرتے ہوئے فنِ شعر کے معیار کا تعیّن کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس سے ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے:

> ''میرؔ اُردو شاعری کے پہلے ناقد ہیں جن کے یہاں عملی تنقید سے الگ، نظری تنقید کے سلسلے میں بھی بعض اصولوں اور آراء کی نشان دہی ملتی ہے۔'' ۴۹

آج بھی جزوی طور پر ان اصولوں کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض نقاد ان کے اندازِ تنقید کو متوازن نہیں سمجھتے کیونکہ انھوں نے بعض شعراء کی بے جا تعریف اور بعض کو بے سبب تنقیص کا نشانہ بنایا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ''نکات الشعراء'' کی تاریخی اور سوانحی حیثیت مسلّم ہے۔

میرؔ کے بارے میں بعض ناقدین کا یہ خیال کہ وہ افسردہ طبیعت، خشک مزاج، مردم بیزار اور خلوت پسند آدمی تھے، ''نکات الشعراء'' پڑھنے کے بعد غلط ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ اس تذکرے کی مدد سے ان کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک یارباش انسان کی تصویر ہے۔ ''نکات الشعراء'' کی اہمیت واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''''نکات الشعراء'' تنقید اور سوانح دونوں لحاظ سے اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ میرؔ اور ان کے

شاعری کو ''فنِ شریف'' سمجھتے تھے اور فن ہمیشہ فطری صلاحیت، علمی لیاقت اور خلوص و محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اسے جاہل اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اس فن کی نمود کے لیے سخت محنت کو لازمی خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سلیقہ کا دامن نہیں چھوڑا۔ اسی وجہ سے منفرد شیوۂ گفتار پیدا کیا۔ ان کے خیال کے مطابق شاعری ہر ایک کے بس کی بات نہیں، کیونکہ اس کے لیے عشق ضروری ہے اور یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔

میؔر کے شاعری کے بارے میں خیالات میں کہیں کہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مصنف اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''کہیں کہیں ان خیالات میں تضاد بھی محسوس ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ شاعری نائی دھوبی کا کام نہیں، یہ شریفوں کا حصہ ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ میرا روئے سخن عوام کی طرف ہے۔ بہر حال میؔر کو سمجھنا اتنا سہل بھی نہیں کیونکہ وہ ایک خاص سطح یا مقام سے بات کہتے ہیں البتہ اتنی بات تو صاف ہے کہ وہ شاعری کو ایک معزز اور محترم فن جانتے تھے۔'' ۵۵

میؔر زبان اور بیان دونوں کی صحت اور خوبصورتی کے قائل تھے اور وہ لفظ و معنی کی ہم آہنگی کا بھی گہرا احساس رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے کسی لغت کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کی شاعری کے سارے رشتے ناطے زندگی کے ساتھ ہیں۔ وہ ربطِ کلام، جدّتِ بیان، سادگی، تہ داری، دردمندی اور اسلوبِ بیان پر خاص زور دیتے ہیں۔ ان کی غزل میں غم کا عنصر بڑی فن کاری کے ساتھ سمویا گیا ہے اور یہ غم خارجی اور ذاتی خیالات کے آمیزے کی وجہ سے ہے۔ ان کے ہاں اجتماعی شعور کا امتزاج اس قدر فنکارانہ انداز میں ہوا ہے کہ ذات اور کائنات کا فرق باقی نہیں رہا۔ اس وجہ سے ان کی شاعری صرف شاعری نہیں بلکہ معنی آفرینی کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے آپ بیتی کے رنگ میں جگ بیتی ہے۔ ان کی اشاریّت اور ایمائیت کے پیچھے ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے اس شاعری میں نوحہ گری کی کیفیت ہے جو فارسی یا اُردو شاعری کی روایت سے نہیں بلکہ غمِ روزگار اور غمِ جاناں کے سبب سے

ہے۔غم کے بیان میں انھوں نے فنّی لوازمات کا بھی خیال رکھا ہے۔ ان کا کلام سادہ ہے۔ جذبے کا خلوص ان کا اصل سرمایہ ہے۔ وہ انفرادیّت پسندی کی وجہ سے اپنا ہمدم کسی کو نہ بنا سکے اور جب غم کو بیان کیا تو اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ ان کے ہاں والد کی صحبت کے اثرات کی وجہ سے قلندرانہ عناصر تو مل جاتے ہیں لیکن ایک مکمل صوفی کی طرح کے اشعار ان کے ہاں نہیں ہیں۔ بقول مصنّف:

> ”۔۔۔ان کی غزلوں میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو صوفیانہ عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو خالص عشقیہ اشعار میں کروٹیں لیتا ہے، البتہ دنیا کی بے ثباتی اور فقر و قناعت سے متعلق جو اشعار ہیں، ان میں نسبتاً زیادہ صداقت ہے جس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ میؔر نے یہ احساس کسی صوفی کی تعلیم سے نہیں زندگی کے مشاہدے سے پیدا کیا تھا۔“ ۵۶

میؔر، دردؔ کی طرح مکمل صوفی نہیں لیکن ایک دل شکستہ اور دردمند انسان ہیں۔ عام نقادوں نے ان کو صرف قنوطی شاعر کے طور پر پیش کیا ہے جب کہ وہ قنوطی اس لیے نہیں کہ انھوں نے زندگی میں بڑی تگ و دو کی ہے۔ میر کی غزل میں درج ذیل عناصر موجود ہیں:

۱۔ خارجی ماحول کی عکاسی
۲۔ انقلاب کی نیرنگیاں
۳۔ ناکامیٔ عشق
۴۔ ذکرِ غمِ دل و ذکرِ محبوب
۵۔ خودفراموشی و خودکلامی
۶۔ فقر و قناعت
۷۔ فکر و نظر کا عنصر
۸۔ غمِ جاوداں

میؔر کے ہاں خیال کی رعنائی اور جذبے کی صداقت کے ساتھ ساتھ فنّی مہارت بھی موجود

ہے۔ الفاظ کی تکرار کا انداز ان کی شاعری میں ہنر بن کر سامنے آیا ہے۔ ان کی تشبیہات بڑی نازک اور خیال آفرین ہیں۔ انھوں نے ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں جو قدیم ہونے کے باوجود اپنے اندر انفرادیت رکھتے ہیں۔ جنگِ آزادی کے بعد جب غزل کا مزاج بدلنے لگا اور اس میں مقصدیّت آنے لگی تو پھر بھی اس پر میرؔ کا رنگ نمایاں رہا، کیونکہ:

> ''میرؔ کی شاعری کے پیچھے ان کا طویل تجربہ اور گہرا مشاہدہ اور ان کی گمبھیر شخصیت ہے۔ اس کے علاوہ وہ علمی قابلیت، فنی ریاضت اور سلیقۂ شاعرانہ کو بھی کمالِ فن کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔'' ۵۷

''مثنویاتِ میرؔ (تحقیق وتنقید)'' محمد یار گوندل کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کی مثنوی نگاری کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ان کی لکھی گئی اکتالیس مثنویوں کی روشنی میں مثنوی نگاری کی روایت میں میرؔ کے مقام کا تعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے باب اوّل میں ''مثنوی'' کا ایک تعارف پیش کیا گیا ہے جس میں مثنوی کی ہیئت اور موضوعات کو بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں اردو مثنوی کے ارتقاء کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ اُردو کے ابتدائی ریختوں کے بعد جو نظمیں سب سے پہلے لکھی گئیں وہ مختصر مثنویاں ہی ہیں۔ ان اوّلین مثنویوں میں ادبیّت پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی مقصد اور مافی الضمیر کے بیان پر دی گئی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ کے دور میں سب سے پہلے ٹھیٹ ادبی مثنویاں لکھی گئیں جن کا مصنف مرزا محمد مقیم مقیمیؔ استرآبادی ہے۔ مقیمیؔ کی مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' کو دکن کی سب سے پہلی عشقیہ مثنوی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میرؔ سے پہلے جن لوگوں نے مثنویاں لکھیں ان میں امینؔ، دولتؔ، صنعتیؔ بیجاپوری، کمال خاں رستمیؔ، ملک خوشنود، علی عادل شاہ شاہیؔ، نصرتیؔ، امین الدین اعلیٰؔ، سیّد میراں ہاشمی، ایاغیؔ، قاضی محمود بحریؔ، مختار، شغلیؔ، سیواؔ، مومنؔ، معظمؔ، ملاّ وجہیؔ، احمدؔ، شوقیؔ، محمد افضلؔ، غواصیؔ، جنیدیؔ، طبعیؔ، لطیف گولکنڈی، غلام علی، ولیؔ ویلوری، اشرفؔ، عشرتیؔ، عاجزؔ، شیخ داوٗد ضعیفیؔ، ذوقیؔ، ہنرؔ، محبوب عالم،

مولانا عبدیؔ، ولیؔ، حاتمؔ، آبروؔ، سوداؔ، مرزا جان بیگ ساقیؔ، سیّد محمد میر اثرؔ اور سراج اورنگ آبادی شامل ہیں۔

باب سوم میں میرؔ کے حالاتِ زندگی جامعیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور ان حالات کے لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''اس کے مطالعے سے میرؔ کی شاعری خصوصاً مثنویات کی تفہیم میں مدد ملے گی۔'' ۵۸

میرؔ کی زندگی کے حالات و واقعات کا اثر اُن کی شاعری پر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں بھی روحِ عصر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ان کی مثنویوں میں ہوا ہے۔ ان کی زندگی حسرت کا مجسمہ اور مایوسی کا مرقع تھی اور ان کی شاعری پر داخلی اثرات کی فراوانی کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے۔

مصنف نے میرؔ کی زندگی کے ان حالات و واقعات سے اتفاق کیا ہے جو ''ذکرِ میرؔ'' میں موجود ہیں۔ ان کی زندگی پر ان کے والد کے افکار و خیالات کا گہرا اثر زندگی بھر رہا۔ میرؔ والد کے ساتھ ساتھ چچا سیّد امان اللہ کے ساتھ بھی رہے انھیں کی وجہ سے ان کے ہاں روحانیت سے لگاؤ، رندی سے نسبت، درویشی سے رغبت اور قلندری سے انس پایا جاتا ہے۔ وہ والد اور چچا کی وفات کے بعد سوتیلے بھائی کے ناروا سلوک کی وجہ سے آگرہ میں تلاشِ معاش کے لیے کئی سال ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن زیست کی کوئی صورت نہ نکلی تو دلّی آ گئے جہاں پر انھیں پریشان حالی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ نادر شاہ درّانی کے دلّی پر حملے کے بعد وہ اکبر آباد واپس آئے لیکن وہاں سے دوبارہ دلّی آئے اور سوتیلے ماموں سراج الدّین علی خان آرزوؔ کے ہاں ٹھہرے۔ تلاشِ معاش کی فکر اور آرزوؔ کی بدسلوکی نے انھیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا۔ آرزوؔ نے یہ سب کچھ ان کے سوتیلے بھائی کے خط کی وجہ سے کیا۔ اس طرح وہ جنون میں مبتلا ہو گئے۔ اگرچہ یہ جنون علاج سے کم تو ہو گیا لیکن اپنے اثرات مختلف صورتوں میں ان کے ہاں ظاہر کرتا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اُنھوں نے آرزوؔ کے ہاں رہائش ختم کر دی اور مختلف لوگوں کی ملازمت کے بعد آصف الدّولہ نے جب انھیں زادِ راہ دے کر لکھنؤ بلایا تو وہ لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں پر ان کی بڑی قدردانی ہوئی اور زندگی کے آخری ایّام انھوں نے قدرے اطمینان سے گزارے۔

میرؔ کے زمانے کے سیاسی حالات ابتر تھے، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں میں کوئی بھی حکومت کرنے کے قابل نہ تھا اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بقول مصنّف:

"تیموری تاریخ میں طوائف الملوکی کا یہ سیاہ ترین دور تھا۔" ۵۹

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے سلطنتِ مغلیہ کا رہا سہا وقار بھی مٹی میں ملا دیا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مغلوں کی رہی سہی کسر بھی نکال دی اور بادشاہ کی حیثیت صرف مجاور کی حیثیت بن کر رہ گئی۔

باب چہارم "مثنویاتِ میرؔ" میں مصنف نے میرؔ کی مثنویوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"میرؔ کی عشقیہ مثنویاں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں آمد ہی آمد ہے، آورد کا شائبہ تک نہیں۔" ۶۰

میرؔ کی مثنویوں کو چار مختلف موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ عشقیہ ۲۔ واقعاتی

۳۔ ہجویہ ۴۔ مدحیہ

مثنویوں میں میرؔ کی ذات کا انکشاف زیادہ کھل کر ہوا ہے لیکن یہ مثنویاں دوسری اردو مثنویوں سے مزاج کے لحاظ سے مختلف ہیں کیونکہ ان کی مثنویوں پر بھی غزل کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ اکثر میرؔ شناسوں نے شمالی ہند میں میرؔ کو پہلا مثنوی نگار تسلیم کیا ہے لیکن مصنف نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے فائزؔ، تاباںؔ اور شاہ حاتمؔ وغیرہ کی بحیثیت مثنوی نگار نشاندہی کی ہے لیکن مصنف کی رائے ہے کہ شمالی ہند میں مثنوی کو ترقی میرؔ کی بدولت نصیب ہوئی:

"گو میرؔ سے پہلے دکن اور خود شمالی ہند میں بھی بہت سی واقعاتی یا عشقیہ مثنویاں لکھی گئیں لیکن میرؔ اس حوالے سے پہلا شاعر ہے کہ اس نے مثنوی کا مزاج بنایا۔" ۶۱

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں آورد سے پاک ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر میرؔ کی غزلوں کا گہرا اثر

ہے کیونکہ میرؔ اپنے مزاج کے دائرے سے نہیں نکل سکتے لیکن مثنوی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتیں۔

میرؔ کی مثنویوں کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف پہلی عشقیہ مثنوی ''شعلۂ عشق'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا اصل نام ''شعلۂ شوق'' ہے۔ اس کے شروع کے بتیس اشعار میں عشق کی ماہیت اور اس کے تصوّر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد اس مثنوی کا اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس میں جذبات نگاری اثر انگیز ہے اور یوں لگتا ہے کہ میرؔ کے جذباتِ عشق اس مثنوی کے مزاج میں شامل ہیں۔ اس مثنوی کا کوئی شعر فنی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے اور صرف ایک شعر کے سوا کوئی شعر اخلاق سے عاری نہیں۔

؎ رہیں دونوں دست و بغل روز و شب
کبھو منہ پہ منہ ہو کبھو لب پہ لب

لیکن مصنف کی اس شعر کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی خاص عریانی نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ یہ مثنوی اپنے اسلوبِ بیان اور پر لطف قصّے کی بنا پر زندۂ جاوید رہے گی۔

میرؔ کی دوسری عشقیہ مثنوی ''دریائے عشق'' ہے جس کا اصل ماخذ مثنوی ''قضا و قدر'' ہے۔ اس مثنوی کی ابتداء بھی تصوّرِ عشق کے بیان سے ہوتی ہے۔ شاعری اور فن کے لحاظ سے یہ اُردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ تیسری عشقیہ مثنوی ''معاملاتِ عشق'' میرؔ کی اپنی داستانِ عشق معلوم ہوتی ہے۔ بقول مصنّف:

''اس میں صرف تھوڑا بہت تخیل اور مبالغہ ہو گا لیکن میرؔ کو اپنے عشق میں جو ناکامی ہوئی اس کا صاف اور واضح عکس اس مثنوی میں ملتا ہے۔'' ۶۲

اس مثنوی میں ان سات معاملات کا ذکر ہے جن سے عشق کی تمام منازل سامنے آ جاتی ہیں۔ اس کی فضا میں گھٹن کی بجائے شگفتگی ہے۔ میرؔ کی چوتھی عشقیہ مثنوی ''جوشِ عشق'' میں بھی ان کے اپنے عشق اور دلِ ناصبور کا تذکرہ ہے۔ اس میں سراپا نگاری بہت عمدہ کی گئی ہے۔ بقول مصنّف:

''اس مثنوی میں اضطراب کی ایسی شدّت اور عشق کی بے قراری کا ایسا اظہار ملتا ہے کہ یہ مثنوی ایک مجبور عاشق کے جذبات کی

سچی تصویر بن گئی ہے۔ اس میں گہرے درد، کھوئی کھوئی سی فضا،
دم گھٹنے کی سی کیفیت، حسرت و یاس کا عالم، یادِ محبوب میں عاشق
کی بے قراری اور عشقیہ جذبات کا اظہار ہوا ہے۔" ۶۳؎

پانچویں عشقیہ مثنوی "اعجازِ عشق" واحد مثنوی ہے جس کا آغاز میرؔ نے حمد اور نعت سے کیا ہے۔ اس میں عاشق کی بے قراری اور دردمندی کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ اس میں حسنِ محبوب کے اظہار کا مبالغہ عروج پر ہے اور اس کی داستان "شیریں فرہاد" کی داستان سے ملتی جلتی ہے۔

چھٹی عشقیہ مثنوی "خواب و خیال" میں انھوں نے اپنی زندگی کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے اپنی محبوبہ کو ظاہر نہیں کیا لیکن یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چاند میں میرؔ کو اپنی محبوبہ کی جو تصویر نظر آتی تھی اسی محبوبہ کی تھی جو "خواب و خیال" بن گئی۔ اس مثنوی میں ان کے عشق کا تجربہ پوری شدّت کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھلا ہے۔ اس میں کوئی قصہ نہیں صرف اُن کے حالاتِ جنوں کا ذکر ہے۔

ساتویں عشقیہ مثنوی "عشقیہ" ہے جبکہ اس کا دوسرا نام "عشقیہ افغاں پسر" ہے۔ اس مثنوی کا ہیرو افغان پسر ہے۔ اس مثنوی میں تھوڑا سا مافوق الفطرت عنصر شامل ہے جب معشوقہ کی روح جلے ہوئے عاشق کو اپنے ساتھ بلا لیتی ہے۔ اس مثنوی میں تسلسلِ بیان عمدہ ہے۔

میرؔ کی آٹھویں عشقیہ مثنوی "مثنوی" ہے جس کا کوئی کردار، پلاٹ اور قصہ نہیں بلکہ صرف "عشق" کو بیان کیا گیا ہے۔ نویں عشقیہ مثنوی "حور نامہ" ہے جس میں خوبصورت جذبات نگاری اور جزیات نگاری پائی جاتی ہے۔ کئی مثنویوں میں میرؔ نے ازدواجی زندگی کے وہ معیار نہیں رکھے جس کا تقاضا ہمارا معاشرہ کرتا ہے اور:

"میرؔ نے اپنی مثنویوں میں ازدواج پر وار کر کے سماجی نظام ہی
نہیں، اخلاقی نظام کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔" ۶۴؎

ان کی آخری عشقیہ مثنوی کا نام بھی "مثنوی" ہے جبکہ "مثنوی جوان و عروس" اور "حکایتِ عشق" بھی اسی مثنوی کے نام ہیں۔ اس مثنوی میں بھی جذبات نگاری عمدہ ہونے کے باوجود اخلاقی بے راہ روی موجود ہے۔

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں دو طرح کی ہیں:

۱) طویل مافوق الفطرت منظوم داستانیں

۲) خالص وارداتِ عشق کو پیش کرنے والی مختصر مثنویاں

میرؔ کا تصورِ عشق غزل سے مستعار لیا گیا ہے۔ اُن کی اِن مثنویوں میں وحدتِ اثر کے ساتھ ساتھ ہجر و فراق، درد و کرب اور غم و الم کا نشاط انگیز رنگ پایا جاتا ہے اور یہی رنگ ان کی غزل کا ہے۔ ان مثنویوں میں ان کی شخصیت اور سیرت بڑی حد تک نمایاں ہے۔ میرؔ کو مثنوی کے قصے سے زیادہ تصورِ عشق کے اظہار سے دلچسپی ہے۔ ان کی مثنویوں کے کردار جذبات اور مزاج کی سطح پر بالکل مماثلت رکھتے ہیں اور ان کی مثنویوں کا ہیرو عوام سے ہوتا ہے جو کہ مجنوں صفت، فناہ فی العشق اور کارِدنیا سے بے نیاز ہوتا ہے۔ بقول مصنّف:

> ''مثنویاتِ میرؔ کا ہیرو بڑا مسکین، وفادار، مغموم، بے چارہ، جانباز عاشق ہوتا ہے جس کی زندگی پر رحم آتا ہے اور موت پر افسوس۔'' ۶۵

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں داخلیّت سے بھرپور ہیں۔ ان میں جذبات نگاری، سراپا نگاری اور جزیات نگاری پائی جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارے کے خوبصورت استعمال کے ساتھ ساتھ ان میں صنعتوں کا خوبصورت استعمال بھی موجود ہے۔

میرؔ کی واقعاتی مثنویوں میں ساقی نامہ، جنگ نامہ، کتخدائی آصف الدّولہ، جشنِ ہولی، در بیاں مرغ بازاں، کتخدائی بشن سنگھ، کپی کا بچہ، موہنی بلی، مرثیہ خروش، در بیان ہولی، شکارنامے اور نہنگ نامہ شامل ہیں۔ ان واقعاتی مثنویوں میں اہم اور قابلِ ذکر دونوں شکارنامے ہی ہیں۔ ان مثنویوں میں مکمل خارجیّت پائی جاتی ہے۔ شکارناموں کی زبان سادہ چست اور بحر رواں ہے۔ ان میں کہیں کہیں غزلوں کی پیوندکاری بھی کی گئی ہے جو ان شکارناموں کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ واقعاتی مثنویوں میں ان کی غزلوں اور عشقیہ مثنویوں کے برعکس خارجیّت تو بہت زیادہ ہے لیکن ان میں عشقیہ مثنویوں جتنی چاشنی اور لطف نہیں پایا جاتا۔

مدحیہ مثنویوں میں انھوں نے کتے، بلی، بکری، آصف الدّ ولہ کے گھوڑے اور خطاط رشید کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ کپی کا بچہ، در بیانِ بز، در بیان خروش اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں جزیات نگاری عمدہ کی گئی ہے۔

ہجویہ مثنویاں ہیت کے اعتبار سے مثنویاں اور موضوع کے اعتبار سے ہجویں ہیں۔ ''در ہجو خانۂ خود'' میں انھوں نے اپنے گھر کی خستہ حالت کا بیان کیا ہے۔ ''در مذمّت برشگال'' میں بارش کی مذمّت کی گئی ہے لیکن بارش کی مذمّت کے پس پردہ عام حفظانِ صحت اور شہری صفائی کے ذمہ دار محکموں کی ہجو کی گئی ہے۔ مثنوی ''در ہجو نااہل مسمّی بہ زبان زد عالم'' بقاء اللہ کی ہجو ہے جو شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ مثنوی ''در ہجو شخصے ہیچ مدان کہ دعوے ہمہ دانی داشت'' میں ایک ایسے شخص کی ہجو کی گئی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے سب کچھ آتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مثنوی ''تنبیہ الجہال'' میں کم تر درجے کے شاعروں کی ہجو کی گئی ہے۔ مثنوی ''اژدر نامہ'' میں میر نے دیگر شاعروں کی مذمّت کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر ثابت کیا ہے۔ مثنوی ''در مذمّت آئینہ دار'' میں سودا کے شاگرد عنایت اللہ عرف کلوحجام کی ہجو ہے۔ مثنوی ''در ہجو اکول'' میں ایک پیٹو کی ہجو کی گئی ہے جس میں مزاح برائے نام اور طنز شدید ہے۔ مثنوی ''در مذمّت دنیا'' ایک اخلاقی مثنوی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ جہان فانی ہے۔ اس لیے آئندہ کی فکر کرو۔ مثنوی ''در بیان کذب'' بھی اخلاقی مثنوی ہے جس میں جھوٹ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثنوی ''قصہ در ہجو خواجہ سرائے'' میں ایک خواجہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ایک کثیف اور اخلاق سے انتہائی بعید ہجویہ مثنوی ہے۔ مثنوی ''ہجو عاقل نام ناکسے کہ بہ سگاں انسے تمام داشت'' میں کتوں سے پیار کرنے والوں کی مذمّت ہے۔ یہ سودا کی ہجو معلوم ہوتی ہے کیونکہ سودا کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔

میر کی ہجویہ مثنویاں تین قسم کی ہیں:

۱۔ افراد کے بارے میں

۲۔ حالاتِ زمانہ کے بارے میں

۳۔ موسموں کے بارے میں

میر کی ہجویہ مثنویوں میں بھی سنجیدگی پائی جاتی ہے اور ان کی مثنویوں میں زبان اور موضوع

میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ وہ خوبصورت اور سادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، ان کی مثنویاں جذبات نگاری اور حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

انھوں نے مثنویوں میں ہر قسم کی باتیں لکھی ہیں جیسے عشق و محبت، رزم و بزم، طنز و مزاح، تعریف و تضحیک۔ لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں پر غزل کا رنگ غالب ہے۔ اسی وجہ سے ان میں مناظر اور مکالموں کی کمی ہے۔

میرؔ کے بعد بھی مثنوی کی روایت جاری رہی اور آخری باب میں مختصر طور پر اس روایت کا جائزہ لیا گیا ہے جو میرؔ کے بعد جاری رہی اور اس روایت پر میرؔ کے اثرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ:

> ''میرؔ کی مثنوی اردو مثنوی کا مینارۂ نور ہے اور یہ اتنا بلند ہے کہ دورِ جدید میں بھی صنفِ مثنوی میں دور سے دیکھنے پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔'' ۲۶

''مثنویاتِ میرؔ۔۔۔ تحقیق و تنقید'' میرؔ شناسی میں اس لحاظ سے اہمیت کی حامل کتاب ہے کہ اس میں میرؔ کی شاعری کی اس صنف کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جس پر نقادوں نے اتنی زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کتاب سے میرؔ کے متعلق اس بات کی نشاندہی کہ انھوں نے اکتالیس مثنویاں لکھی ہیں، بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ عام طور پر نقادوں نے میرؔ کی چالیس سے کم مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے جہاں پر میرؔ کی مثنویوں کی ادبی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے مثنوی نگاری کی روایت میں اُن کے مقام کا تعیّن کیا ہے وہاں پر ان مثنویوں کی مدد سے ان کی نجی اور معاشرتی زندگی کو دریافت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

''محمد تقی میرؔ کی خودنوشت، ذکرِ میرؔ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مع ترجمہ)'' محمد بن علی باوہاب کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے ذکرِ میرؔ کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی اور فن پر بہت سے الزامات عائد کیے ہیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق اس میں میرؔ نے اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو

بے نقاب نہیں کیا ہے اور خاص طور پر اپنی عشقیہ داستان کو سامنے لانے سے عملاً گریز کیا ہے۔ ''ذکرِ میرؔ'' تاریخی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے لیکن تاریخی واقعات کا تقدم و تاخر اس میں ایک خامی کے طور پر سامنے آیا ہے۔ وہ میر کو ذاتی حوالے سے اس طرح دیکھتے ہیں کہ:

''یہ نظریہ کہ وہ بالکل قانع اور متوکل انسان تھے۔ ''ذکرِ میرؔ'' پڑھنے کے بعد باطل ہو جاتا ہے۔ وہ راجاؤں کی دربار داری بھی کرتے ہیں۔ ان کے درِ دولت پر راتوں کو حاضری دیتے ہیں۔ لکھنؤ کے دربار میں قصیدہ خوانی، حتیٰ کہ شکارنامے موزوں کرتے ہیں۔'' ۶۷

اس ٹھیٹ دنیاداری کے انداز میں سوچنے اور اس پر عمل کرنے پر انھیں خارجی حالات کے دباؤ اور ماحول کے اثرات کا شکار کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ بنیادی طور پر خوددار تھے۔ مصنف نے میرؔ کی سیرت اور شاعری کو علیحدہ موضوع خیال کرتے ہوئے جب وقعت کے حوالے سے رائے دی ہے تو شاعری کے پلڑے کو بھاری قرار دیا ہے جب کہ ان کی سیرت میں انھیں بہت زیادہ خامیاں نظر آئی ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق میرؔ ابتداء میں Hetro-Sex کے رجحان کے حامل تھے جو کہ ایک صحت مند اور فطری رجحان ہے لیکن بعد میں ان کا میلان Homo-Sex کی طرف ہو گیا اور اسی وجہ سے اُن کی شاعری میں امرد پرستی پائی جاتی ہے۔

میر تقی میرؔ کے بارے میں شمیم رضوی کا خیال بھی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے عشق کا اظہار جان بوجھ کر ''ذکرِ میرؔ'' میں نہیں کیا جب کہ ان کی شاعری کے حوالے سے جو عشق سامنے آتا ہے وہ حسیاتی ہے اور حسیاتی عشق، غیر جنسی ہو ہی نہیں سکتا۔ میرؔ کا عشق ان کے ماموں کی بیٹی سے تھا اور جب ان کے ماموں کی بیٹی دلّی پر نادر شاہ کے حملے کے بعد اکبر آباد آئی تو میرؔ بھی اکبر آباد آ گئے لیکن انھیں اس سے ملنے کے زیادہ مواقع نہ ملے جب کہ دلّی میں ان سے عشق کا راز جب فاش ہوا تو میرؔ اکبر آباد کو چھوڑ کر دوبارہ دلّی ماموں کے گھر آ گئے۔ پھر تیس سال تک اکبر آباد نہ آئے۔ اس عشق کا جوان کی زندگی کے بیشتر حصے پر چھایا رہا۔ انھوں نے ''ذکرِ میرؔ'' میں ذکر نہیں کیا جب کہ ''ذکرِ میرؔ'' میں کئی فحش حکایات درج کر دی ہیں۔

ان کی دیوانگی نفسیاتی اسباب کی بنیاد پر تھی کیونکہ انھیں عشق میں ناکامی کے ساتھ ساتھ رسوائی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کی شاعری میں عشق مجازی ہے نہ کہ عشقِ حقیقی کیونکہ وہ عشقِ مجازی کے مردِ میدان ہیں لیکن کبھی کبھی رسماً عشقِ حقیقی کے رمزوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

میرؔ کے ناآسودہ جذبات کی جب تسکین نہ ہوئی تو وہ ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور اس ہم جنس پرستی سے جب آگے بڑھے تو ان کے ہاں ''ہرجائی'' کا رویّہ پیدا ہو گیا جس کے بعد انھیں ایذا طلبی میں سکون ملنے لگا۔ میرؔ Homo Sex سے Perversion اور Perversion سے Masochism کی طرف مڑ گئے۔

ہماری چاہ نہ یوسف ہی پر ہے موقوف
نہیں ہے وہ تو کوئی اور اس کا بھائی ہو
(Perversion)

اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش
سو تو نے مار مار کے آ کر بچھا دیا
(Masochism)

میرؔ کو اپنی جنسی کج روی کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ جب دلّی سے لکھنؤ آئے تو Hetro Sex کے زیادہ مواقع تھے لیکن وہ Homo Sex کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ Homo Sex کے مواقع زیادہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ Fetishism (اشیاء پرستی) کی طرف مائل ہو گئے۔

وے کپڑے تو بدلے ہوئے میرؔ اس کو کئی دن
تن پر ہیں شکن تنگیٔ پوشاک سے اب تک

میرؔ کے عشق کے بارے میں حتمی رائے دیتے ہوئے شمیم رضوی لکھتے ہیں کہ ان کا عشق سراسر جنسی تھا۔ انھوں نے تمام عمر عشق کیا لیکن پہلے عشق کے علاوہ وہ تمام عمر جنسی کج روی اور گمراہیوں میں گھرے رہے۔

''ذکرِ میرؔ۔۔۔ حقائق کے آئینے میں'' میں مصنف لکھتے ہیں کہ میرؔ نے اس کتاب میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دی ہیں جب کہ کئی فرضی واقعات درج کیے ہیں جیسے

سعادت علی امروہوی کا انھیں ریختہ میں شعر موزوں کرنے کا مشورہ۔ جدِّ امجد کا فوج داری سے سرفراز ہونا، والد اور چچا کے بارے میں میرؔ کا تعارف، میرؔ کے بیان کردہ ایسے واقعات پر یقین کرنا مشکل ہے۔

مصنف نے میرؔ کے شیعت کے برملا اظہار کو اپنی سیادت کے منوانے کا منصوبہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے والد اور چچا امان اللہ کے جو احوال درج کیے ہیں وہ لفظ بہ لفظ اصلی نہیں ہیں۔ میرؔ کے والد اور چچا لڑکوں سے عشق کرتے تھے جو کہ ایک عیب ہے، جب کہ تصوّف کے حوالے سے کی گئی بحث میرؔ کی اپنی اختراع ہے۔ ''ذکرِ میرؔ'' کے حوالے سے میرؔ اپنی اصلی حالت میں سامنے نہیں آتے، جبکہ:

''خود نوشت کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں نجی زندگی کے
حالات بلا کم و کاست بیان کر دیئے جائیں اور اپنی کمزوریوں پر
دبیز پردے ڈالنے کی کوشش سے احتراز کیا جائے۔'' ۶۸

''ذکرِ میرؔ'' لکھتے وقت میرؔ سے سہو بھی ہوا ہے مثلاً احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملے کے سلسلے میں بیان جاری رکھتے ہوئے احمد شاہ کے بجائے نادر شاہ لکھا ہے۔ میرؔ کے خان آرزوؔ کے بارے میں خیالات سے مصنف نے اختلاف کیا ہے اور خان آرزوؔ کو ہی شاعری میں ان کا استاد اور محسن گردانا ہے۔ انھوں نے آرزوؔ کے ساتھ میرؔ کے تعلقات کی کشیدگی ان کی دیوانگی اور عشق کو قرار دیا ہے۔ آرزوؔ نے میرؔ کو شاعری کی طرف راغب کیا جب کہ انھوں نے ان کی بیٹی سے عشق شروع کر دیا۔ آرزوؔ کے بارے میں ''ذکرِ میرؔ'' اور ''نکات الشعراء'' دونوں کے بیانات متضاد ہیں۔

میرؔ کی شاعری صوفیانہ شاعری نہیں ہے بلکہ یہ عشقِ مجازی کی شاعری ہے۔ انھوں نے تو اپنے والد سے منسوب صوفیانہ باتوں کا کبھی خیال ہی نہیں رکھا بلکہ پند و نصائح کو بھی بھلا دیا۔ ان کے ہاں فقر نہیں بلکہ غرور تھا۔ بقول مصنف:

''میرؔ کی شاعری سے وارداتِ قلب کو خارج کر دیا جائے جو
میرؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ ہجو،
فحش کلامی، رطب و یابس۔'' ۶۹

''ذکرِ میرؔ'' کے حوالے سے مصنف کا میرؔ کی زندگی کا تجزیہ کئی پہلوؤں پر سوچنے کی دعوت

ضرور دیتا ہے لیکن کئی ایک مقامات پر ان کا رویہ ''میر شناسی'' کی حدود کو پار کر کے میر شکنی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو کہ ایک محقق اور نقاد کی خامی ہے۔

''میر کے عقیدت مند'' کے عنوان کے تحت مصنف نے پانچ نقادوں:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ ناصر کاظمی

۳۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری

۴۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

۵۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق

کو محض میر کے عقیدت مند قرار دیا ہے۔ مصنف نے میر کے عشق اور ان کی عاشقانہ غزل کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیالات سے جو اختلافات کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ میر کا عشق سچا، کھرا اور کھلا ہوا نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے عشق کی واردات کو کھل کر بیان کیا ہے، کیونکہ انھوں نے کہیں بھی محبوبہ کا حسب نسب نہیں بتایا۔

۲۔ میر کا ماحول متصوّفانہ نہیں تھا کیونکہ ان کے والد نے ایک سیّد زادہ دیکھا اور اس پر عاشق ہو گئے۔ یہ کیسا متصوّفانہ ماحول ہے۔

۳۔ میر کا جنسی شعور صحت مند نہ تھا۔ ان کے ہاں امرد پرستی جس کی دلیل ہے۔

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تضادات سے کام لیا ہے۔ کہیں پر تو وہ کہتے ہیں کہ میر نے عشق کا کھل کر بیان کیا ہے اور کہیں کہتے ہیں کہ اپنے معاشقے پر دبیز پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

۵۔ میر کے پہلے سفر کی تاریخ ۱۷۳۹ء سے اختلاف۔

۶۔ حافظ محمد حسن کے خط کی وجہ سے میر کو آرزو نے گھر سے نہیں نکالا تھا بلکہ ایک دن کھانے پر بیٹھے تھے کہ ماموں نے سخت سست کہا اور میر گھر سے نکل گئے۔

۷۔ میر کے کلام کو پڑھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہے۔ کلیاتِ میر، جو عبدالباری آسی نے مرتب کیا ہے، اس کے آخر پر تیس صفحات پر مشتمل لغت شامل ہے۔

مصنف نے ناصؔر کاظمی کے جن خیالات سے اختلاف کیا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ ناصؔر کاظمی کہتے ہیں کہ میؔر کے بہتر نشتروں کے علاوہ بھی ایسے اشعار اور مصرعے ہیں جو پدم سانپ کی طرح ہیں۔ یہ سانپ انگلی برابر ہوتا ہے، مٹی کے رنگ کا، اس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا، میں نے تو یہ زہر بھی سہا ہے۔ مصنف نے ان کے اشعار کی اس تعریف کے بعد یہ جواب دیا ہے کہ ان کی باتوں میں بھی اسی قسم کا زہر ہوتا ہے۔

۲۔ ناصؔر کاظمی کے اس خیال سے بھی مصنف کو اتفاق نہیں کہ اُردو کا بڑے سے بڑا غزل گو شاعر میؔر کی عمارت کے ملبے سے بنا ہے۔

۳۔ مصنف کو ناصؔر کاظمی کے اس فقرے پر اعتراض ہے ''میں تو میؔر سے وہ اسمِ اعظم سنتا ہوں جس کے پڑھتے ہی جنگل کے شیر سجدہ کریں۔''

۴۔ ناصؔر کاظمی کا بیان ہے کہ:

''میؔر تو ایک بوڑھے برگد کے درخت کی طرح ہے جس کی چھاؤں میں، سفر کرنے والے شب بسری کر سکتے ہیں۔'' ۷ے

اس بیان پر اعتراض کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

ناصؔر کاظمی یہ مثال دیتے وقت بھول گئے ہیں کہ برگد پر زیادہ تر چمگادڑوں کا بسیرا ہوتا ہے اور اس کے تنے کا گھیرا اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بسا اوقات مار و کژدم اس تنے کے اندر اپنا ٹھکانا بنا لیتے ہیں۔

۵۔ ناصؔر کاظمی کے ایک اور مضمون ''میؔر ہمارے عہد میں'' کے مندرجات پر وہ اس طرح اعتراض کرتے ہیں کہ:

ناصؔر کاظمی کا یہ خیال کہ وہ نہ داد چاہتا ہے اور نہ بیداد پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے۔ غلط ہے، کیونکہ جب آصف الدولہ نے سوؔدا کی تعریف کی تو انھوں نے برا منایا اور آزؔاد کے بقول جب نواب مچھلیوں سے کھیل رہے تھے تو انھیں شعر سنانے سے انکار کر دیا۔

۶۔ میؔر کے عشق کے بارے میں مصنف نے ناصؔر کاظمی کے خیال سے اختلاف کیا ہے۔ ناصؔر کاظمی کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی محبوبہ کو سربستہ راز رکھا اور اس عشق کے تجربے کو وسیع انسانی تجربہ بنا دیا۔ وطن اور محبوب کی جدائی میں وہ حضرت یوسفؑ کی پیروی کرتے رہے۔ یہ قصہ میؔر کی شاعری کا احسن القصص ہے۔

اس پر اعتراض کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ میؔر تو امرد پرست تھا اور حضرت یوسفؑ پاک باز، اور حضرت یوسفؑ کبھی زلیخا سے جدا نہیں ہوئے۔

۷۔ ''میؔر زندہ دل آدمی تھے مگر اوباش نہ تھے'' پر اعتراض کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ تو لونڈوں کے پیچھے پھرتے تھے جس کی تائید ان کے اشعار کرتے ہیں۔

۸۔ ناصؔر کاظمی نے جو کہا ہے کہ میؔر کے آباؤ اجداد سپاہی پیشہ عالم اور درویش تھے، مصنف کو اس پر بھی اعتراض ہے۔

میؔر کے بارے میں حامدی کاشمیری کے خیالات کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حامدی کاشمیری کا خیال ہے کہ اُردو کی کلاسیکی شاعری میں میؔر کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حق دار تھے۔ مصنف اس بات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میؔر کو خود ان کے حینِ حیات جو شہرت اور قدر و منزلت نصیب ہوئی وہ شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔ ہاں ان کی بد دماغی، تنک مزاجی اور تلوّن نے البتہ بارہا ایسے حالات سے دوچار کر دیا جو ان کے شایانِ شان نہ تھے۔'' [اے]

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے اس خیال سے بھی انھیں اختلاف ہے کہ میؔر نے صوفیانہ اور درویشانہ ماحول میں پرورش پائی۔ ان کی داخلیت پسندی کے غالب رجحان کا سبب مصنف نے ان کے عشق کی ناکامی کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرؔ کی زندگی میں عشق کی ناکامی کے زخم اتنے گہرے تھے کہ
وہ آخر تک مندمل نہ ہو سکے اور عشق کی ناکامی کو حرزِ جاں بنائے
تادمِ آخر وہ ان زخموں کو چاٹتے رہے۔ اس طرح ان کے
کلام میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں اس طرح شیر و شکر ہو گئے
کہ ان کی شاعری آفاقیت کے اظہار اور اثر آفرینی کی معراج
پر پہنچ گئی۔'' ۲ے

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی تحقیق کو سراہنے کے باوجود وہ ان کی میرؔ سے عقیدت مندی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کے سیّد ہونے کی شہادتوں کو رڈ کرنا مشکل قرار دیا ہے جبکہ مصنف انھیں ہر حال میں غیر سیّد کہتے ہیں۔ مصنف کو خواجہ احمد فاروقی کے اس رویّے سے بھی شدید اختلاف ہے کہ انھوں نے میرؔ کے عشق کے حوالے سے کھل کر کیوں نہیں لکھا کہ یہ آرزوؔ کی بیٹی سے تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کی دیوانگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے آرزوؔ کی خصومت اور دل آزار سلوک کا نتیجہ قرار دیا ہے جبکہ مصنف کے خیال میں ایسا بالکل نہیں ہے۔

میرؔ کے مذہب کے بارے میں خواجہ احمد فاروقی کے اس جملے کو کہ ''حقیقت یہ ہے کہ میرؔ وسیع المشرب، صلح کل اور فقیر دوست تھے اور ان کی شیعت اور صوفیت میں تضاد نہیں، لطیف ہم آہنگی ہے'' کی مخالفت کرتے ہوئے مصنف میرؔ کو متعصب، غالی اور شیعہ سمجھتے ہیں اور ان کے والد کو سنی العقیدہ۔ میرؔ کے مذہب کی تبدیلی کی بنیاد ان کی ماں کو قرار دیتے ہیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کے مذہب کے بارے میں کھل کر فیصلہ نہیں دیا اور مصلحت سے کام لیا ہے۔

میرؔ نے عشق کو تہذیب میں داخل کیا ہے۔ اس طرح زندگی اور عشق دونوں کا رتبہ بڑھایا ہے۔ وہ اپنی عزت کرتا ہے اور دوسروں کو انسان کی عزت سکھاتا ہے لیکن مصنف کے خیال میں خواجہ احمد فاروقی کی یہ رائے بھی درست نہیں بلکہ میرؔ دوسروں کی عزت نہیں کرتا۔ میرؔ کے عشق کو بھی مصنف خواجہ احمد فاروقی کے خیال کے برعکس ایسا عشق تصوّر کرتے ہیں جو پستی اور ہوس پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ انھوں نے ان کو ایک ایسے بھکاری کے روپ میں پیش کیا ہے جو راجاؤں اور نوابوں کے ہاں بھیک لینے کے لیے جاتا ہے۔

میرؔ کی سیرت کی عظمت کے عام پہلوؤں سے انکار کے باوجود مصنف میرؔ کی عظمت کے پھر بھی قائل ہیں لیکن صرف شاعری کی بنیاد پر۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر کی جو کچھ بھی قدر و قیمت ہے اور ان کی عظمت کو ہر ایک نے سلام کیا ہے تو محض ان کے کلام کی بنا پر۔ لہٰذا ان کی سیرت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔'' ۳ے

مصنف نے میرؔ کے بارے میں مولوی عبدالحق کے خیالات سے اس طرح کا اختلاف کیا ہے:

۱۔ میرؔ خوددار ہرگز نہیں تھے اگر خوددار ہوتے تو جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاں ملازمت نہ کرتے۔

۲۔ میرؔ کے ہاں دستِ سوال پھیلانا کفر ہرگز نہ تھا۔ وہ ضروریات کے لیے راجاؤں اور شاہی لشکر کے سرکردوں کے ہاں جاتے رہے۔

۳۔ میرؔ کے ہاں انسان دوستی اور قناعت جیسی صفات نہیں تھیں۔ بقول مصنف:

''ہر تذکرہ میں میرؔ کی تعریف ہوتی ہے تو ان کی شاعری کی ہوتی ہے۔ میرؔ کی خودداری یا انسان دوستی اور قناعت پسندی کی طرف بھول کر بھی کسی نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ ان کی بددماغی کا ضرور تذکرہ کیا ہے۔''

۴۔ میرؔ کی عزت کردار کے حوالے سے ہرگز نہیں تھی، کیونکہ ان کے کردار میں سوائے خامیوں کے کچھ نہ تھا۔ انھیں جو عزت ملی وہ صرف شاعری کی وجہ سے ملی۔

''ذکرِ میرؔ'' کے بارے میں مولوی عبدالحق کی یہ رائے کہ اس سے حقائق سے پردہ اٹھتا ہے اور کئی غلط فہمیوں کا سدِّ باب ہوتا ہے، سے اختلاف کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ اس سے میرؔ کی نجی زندگی کے بارے میں بالکل برعکس تاثر ملتا ہے۔

''میرؔ کی تحلیلِ نفسی'' میں میرؔ کو علمِ نفسیات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرائڈ، ایڈلر

اور ژونگ کے نفسیاتی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے میرؔ جس شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہے۔

فرائڈ کے مطابق لاشعور، شعور کے راستے اظہار پاتا ہے لیکن جب اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ ایک متلاطم دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میرؔ کی محبوبہ تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی جنسی خواہشات کی تکمیل نہ ہو سکی اور وہ Sublimation کا روپ اختیار کرنے کے بجائے بے راہ روی کے غیر فطری وسائل کی جانب مڑ گئے۔

اڈلر کے خیال کے مطابق انسان کی دبی ہوئی خواہشات اظہارِ ذات کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ یہ احساسِ کمتری کا جذبہ انتقامی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی کہ انسان کی تمام جدوجہد احساسِ کمتری پر غالب آنے اور اپنی محرومیوں کی تلافی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ میرؔ بچپن کے مسائل کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے جس نے آخرکار احساس برتری کی شکل اختیار کر لی جس کی وجہ سے ان کے لاشعور میں سارے عالم کے خلاف بغاوت اور پورے معاشرے سے پیکار کے جذبات نے گھر کر لیا۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں بددماغی پائی جاتی ہے جسے ان کی انانیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بھی دراصل ان کی کمتری کی تلافی کی کوشش ہے اور اسی سے احساسِ برتری بھی ان کے ہاں پیدا ہوا اور اسی احساسِ برتری کی وجہ سے:

> ''انھوں نے اپنے سوتیلے بھائی اور آرزؔو سے انتقام لینے کی
> خاطر ذکر میرؔ میں جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اور دوسری طرف
> اپنے کلام کے ذریعہ معاصرین کے مرتبہ کو گھٹانے کے درپے
> رہے ہیں۔'' ۴ے

میرؔ Complex کا شکار تھے جسے فرائڈ دلدل اور ایڈلر اثباتِ ذات کا محض غلبہ آمیز تقاضا قرار دیتا ہے۔ ایڈلر کے خیالات کا سہارا لیتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ کمتریاں جتنی زیادہ ہوں گی، ذات کے اظہار کے تقاضے بھی اتنے ہی شدید ہوں گے اور میرؔ کے ہاں یہ رویّہ بڑا واضح ہے۔

''ژونگ'' کے مطابق انسان دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ دروں بیں

۲۔ بیروں بیں

دروں بیں اپنی ذات کے حصار سے باہر بہت کم آتے ہیں۔ میرؔ کا تعلق بھی اسی طبقہ کے افراد سے ہے۔ انانیت ان کے ہاں دروں بینی کی وجہ سے ہے اور جب یہ انانیت، آفاقیت میں ڈھل جاتی ہے تو مریضانہ انانیت کی جگہ ان کے کلام میں عالمگیری آجاتی ہے۔

ے مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میرؔ کے ہاں شرفِ انسانیت، احساسِ برتری ہی کی بدلی ہوئی لیکن اعلیٰ و ارفع شکل ہے۔ اگرچہ میرؔ نے جبلی خواہشات اور ہیجانات کی تکمیل کے لیے بے رہروی اختیار کی لیکن ان کی فاضل توانائی نے ان کی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس سے بڑھ کر وہ مصائب و آلام کے باوجود ناکامیوں اور محرومیوں کے ہوتے ہوئے بھی زندہ رہنے کے عزم کا اظہار کرتے رہے اور زمانے سے ٹکراتے رہے۔

مصنّف فرائڈ، اڈلر اور ژونگ کے نظریات کی روشنی میں میرؔ کا جو نقشہ ہمارے سامنے لاتے ہیں، وہ یہ ہے:

> ''میرؔ شروع ہی سے احساس کمتری کا شکار رہے۔ محرومیوں اور نامرادیوں نے انھیں ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پھر عشق میں ناکامی کا داغ ایسا تھا کہ وہ ایک زمانہ کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہو گئے۔ اس نصب العین نے انھیں زمانہ کے ساتھ معاونت کے بجائے مبارزت کے راستہ پر ڈال دیا۔ اس منفی رویّہ نے احساسِ برتری اور نخوت و بددماغی کو پروان چڑھایا۔ دروں بینی کے رجحان کے باعث انانیت ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی، چنانچہ من چیزے ہستم کے زعم میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ عشق میں ناکامی ایک جانب تو جنسی تقاضوں کی تسکین کے فطری راستوں کے بجائے بے راہ روی پر منتج ہوئی اور دوسری جانب جذبات کی گھٹن نے آسیب میں مبتلا کر دیا لیکن اس عشق کی ناکامی نے ایک اور رخ بھی اختیار کیا اور انتقام کی

آگ کو تیز کر دیا۔ کینہ پروری اس پر مستزاد۔ چنانچہ اپنے سوتیلے بھائی اور ماموں کے خلاف زہر اُگل کر اور دل کی بھڑاس نکال کر اپنے تئیں تسکین کا سامان فراہم کر لیا۔ اس رویّے نے ان کے وجود کے کسی چھپے ہوئے گوشہ میں پشیمانی کے احساسات بھی بیدار کر دیے اور شاید ضمیر کی خلش نے کبھی بھی انھیں ذہنی آسودگی سے ہمکنار ہونے نہ دیا۔ غرضیکہ میرؔ ایک بے چین روح اور مضطرب دل کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر رہ گئے لیکن اس بے چینی و اضطراب نے ان سے وہ کام لیا جس کی بنا پر میرؔ اقلیمِ سخن میں اس بلند مرتبہ پر فائز ہوئے کہ اُردو زبان اور غزل کے حوالہ سے رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔'' ۵ے

''عہدِ میرؔ کا معاشرہ'' میں مصنف نے میرؔ کے زمانے کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ مختلف معاشرتی رویّوں پر بھی بحث کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مغلیہ سلطنت زوال کا شکار تھی۔ بیرونی حملہ آور تباہی و بربادی کیے جا رہے تھے اور یہاں کے بادشاہ ذاتی جھگڑوں، درباری سازشوں، شراب اور عورت میں اُلجھے ہوئے تھے۔ مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس عہد کی تصویر پیش کر کے ساتھ ساتھ اس عہد کی شاعری سے مثالیں بھی دی ہیں جو ان حالات کی تصدیق کرتی ہیں۔

''ذکرِ میرؔ کی شخصیات'' میں مصنف نے ان تمام شخصیات کا مختصر تعارف کرایا ہے جن کا ذکر ''ذکرِ میرؔ'' میں آیا ہے۔ ان کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے، کیونکہ اس طرح ذکرِ میرؔ کی بہتر تفہیم ممکن ہے۔ اس کتاب میں ''فرہنگِ ذکرِ میرؔ'' شامل کر کے ''ذکرِ میرؔ'' کی تفہیم کو عام قاری کے لیے آسان بنا دیا گیا ہے۔

مکمل تصانیف نے ''میرؔ شناسی'' میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کتب سے جہاں پر میرؔ کے حالاتِ زندگی بڑی تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آئے وہاں پر ان کی تصانیف کے حوالے سے بھی کھل کر بحث کی گئی۔ مکمل کتب کو دیکھا جائے تو ''میرؔ شناسی'' کے ساتھ ساتھ میرؔ شکنی کا رویّہ بھی ہمارے سامنے آیا۔ جہاں پر میرؔ کے حوالے سے عقیدت مندانہ اظہار ہوا وہاں پر ان کے حوالے سے

مخاصمانہ روش بھی جاری رہی لیکن یہ مخاصمانہ روش، عقیدت مندانہ روش کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب ''نقدِ میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ کی زندگی کے ابتدائی مؤثرات کا ان کا رنگِ طبیعت تخلیق کرنے میں بڑا ہاتھ ہے۔ خلوص وصداقت، معمولیات سے دل چسپی، لہجۂ عام، بول چال کا انداز، پیرایہ ہائے ادا کی گیرائی اور مانوسیت، صوتی حسن اور کمال کی مصوّری ان کے انداز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے ہاں فکری عناصر منتشر شکل میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مصوّری کا ذکر محض شاعرانہ نہیں بلکہ وہ فنِ تصویر کے رموز سے واقف تھے۔ ان کی خودنگر شخصیت، عجیب وغریب کردار، بلند علمی حیثیت، فنّی قابلیت اور ناقدانہ قوّت نے انھیں قبولِ عام کی بنیادیں فراہم کیں۔ تقلیدِ میرؔ اُردو ادب کی مستقل رسم ہے لیکن میرؔ کے کلام کی مکمل پیروی ممکن نہیں۔ غالبؔ اور میرؔ دونوں کے ہاں فن کے معاملے میں نازک مزاجی پائی جاتی ہے جب کہ فن سے باہر دونوں انسانیت کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ میرؔ، غالبؔ کے لیے ذہنی ارتقاء کے سفر میں فیض و ہدایت کا سرچشمہ تھے۔ میرؔ نے ایک کامیاب مثنوی نگار نہ ہونے کے باوجود مثنوی کو محدود دائرے میں خاصی ترقی دی۔ انھوں نے طویل بحروں کو اُردو کے تمام شاعروں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ آزادؔ نے میرؔ پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے ان کی ذہنی مجبوریوں کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اور ہر گھڑی کے شاعر نہیں ہیں بلکہ نازک لمحات اور سخت احساسات میں وہ ایک بہترین دوست اور رہنما ہیں۔ ان کے ہاں شہری قدروں کا احساس نمایاں ہے۔ اس لیے انھوں نے عشق کے سلجھے ہوئے ماحول کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ ان کے ہاں مئے کدے کی کیفیتوں کا ذکر محض رسمی یا استعاراتی نہیں بلکہ اس میں ''حالیہ'' رنگ پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''میر تقی میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ کے آباؤاجداد حجاز سے ہندوستان آئے۔ ان کے والد زاہد و متقی تھے اور اکبرآباد کی حد تک انھیں ہر کوئی جانتا تھا۔ میرؔ کے ہاں حد سے بڑھی ہوئی انانیت نے انھیں نقطۂ اعتدال سے ہٹائے رکھا۔ وہ غزل کے شاعر ہیں، ان کی شاعری احساس و جذبے کی دنیا میں ہلچل مچا کر گونگے جذبوں کو زبان عطا کرتی ہے۔ اُن کے ہاں عشق ذات اور کائنات دونوں حوالوں سے پایا جاتا ہے جب کہ غم ان کے ہاں انسانی زندگی کا حصہ ہے۔

طرزِ میرؔ سادگی کے باوجود پُر کار ہے۔ ان کے ہاں سہل ممتنع کے ساتھ ساتھ کمال کی معنی خیزی بھی پائی جاتی ہے۔ فصاحت اور بلاغت ان کے ہاں ایک وحدت کے روپ میں موجود ہیں۔ ان کے ہاں طویل بحریں اگرچہ جذبے کی شدت کو پھیلا کر دھیما کر دیتی ہیں لیکن پھر بھی ''نشتریت'' دلوں کو چیر دیتی ہے۔ انھوں نے تخلیقی قوتوں کو شاعری میں سمو دیا ہے جس کی وجہ سے آنے والے وقتوں میں شاعری بدلنے کے باوجود میرؔ کی اہمیت برقرار رہے گی۔ ان کی شاعری میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال اُردو کے مزاج میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔ بول چال کی زبان کو انھوں نے شاعری کی زبان بنا دیا ہے۔ اپنی مثنویات کی واردات کا وہ عملی تجربہ رکھتے تھے اور ہجویات میں انھوں نے کسی کی پگڑی اچھال کر خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

نثار احمد فاروقی کی کتاب ''تلاشِ میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ کے آرٹ میں الفاظ کی بڑی اہمیت ہے جنھیں انھوں نے بنیادی پتھر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ، بلاغت کی تکمیل کرتا ہے۔ جس ذہنی واردات اور ذہنی کرب کا انھوں نے شاعری میں اظہار کیا ہے، اس سے وہ خود گزرے ہیں۔ سہل ممتنع کے باوجود ان کے ہاں گہری ایمائیت اور معنی کی وسعت ہے۔ تصوّف ان کے ہاں اس عہد کے عام رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں جب کہ ان کی مثنویات بھی صفائی، سلاست، پاکیزگی اور ربط وتسلسل کی حامل ہیں۔ ''نکات الشعراء'' کا متداول نسخہ کئی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے اور میرؔ کے حوالے سے کئی پہلوؤں پر تحقیقی اور تنقیدی کام ہونا ابھی تک باقی ہے۔

نثار احمد فاروقی کی کتاب ''میر تقی میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی جنونی کیفیت اُن کے عشق کا حاصل تھی۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں بیٹی، بیٹے اور بیوی کی وفات کے صدمات سہنے پڑے۔ انھوں نے ایہام سے ہٹ کر نیا طرز اختیار کیا اور اسے ''انداز'' کا نام دیا۔ جہاں پر انھوں نے شاعری میں پرانی روایات کی تقلید کی ہے وہاں پر انھوں نے اجتہاد سے بھی کام لیا۔ وہ ابتذال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے ہاں متحرک امیجری ہے۔ انھوں نے مختصر بحروں میں وسیع تجربات اور طویل بحروں میں موسیقی پیدا کی ہے۔ وہ لفظوں کے مصوّر ہیں جنھوں نے رعایتِ لفظی سے بھی کام لیا ہے اور جذبے کی صداقت کو بھی نبھایا ہے۔ ان کے ہاں شخصی کیفیتیں ماحول کا آئینہ بن کر سامنے آئی ہیں۔ ان کا فن شاعری میں اس مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں پر وہ عالمی ادب کے معیار

پر پورا اُتر سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ''میر تقی میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ نے درد کو شاعری اور شاعری کو درد بنا دیا ہے۔ یہ شاعری اداس ضرور کرتی ہے لیکن اس سے گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ اگرچہ ان کے ہاں المناکی کا احساس زیادہ ہے لیکن وہ مسرّتوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔ ان کے فنی شعور میں خلوص، صداقت، حقیقت اور واقعیت ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں رمزیت ایمائیت، تہ داری اور پیچ داری پر زور دیا ہے۔ محبوب ان کی شاعری پر غالب ہے لیکن ان کی اس سے جسمانی قربت نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر عشقِ مجازی کی بات کرتے ہیں جب کہ تصوّف کی وجہ سے ان کے ہاں کہیں کہیں عشقِ حقیقی کی جھلک بھی موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزّل کے ساتھ ساتھ فکری پہلو بھی موجود ہے۔ وہ مکمل طور پر اظہار اور ابلاغ کے قائل ہیں۔ فارسی کی شعری روایت کا ان پر اثر ضرور ہے لیکن وہ اس کے غلام بن کر نہیں رہ گئے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کتاب ''کارگہہ شیشہ گری'' کے مطابق میرؔ کی وجہ سے شعری قدریں تولدِ دیگری سے گزریں، ان کے شعری کمالات وہبی ہیں۔ ان کی شاعری پر خارجیت سے زیادہ داخلیت کا اثر ہے۔ میرؔ کی شاعری کو ہر سطح پر حقیقت سے ہم رشتہ قرار دیا گیا جس کی وجہ سے ان کا شعری وجود معرضِ ہلاکت میں پڑ گیا کیونکہ شاعری خالصتاً تخلیقی عمل ہے جس کا ردّعمل فوری نوعیت کی مقصدیّت نہیں بلکہ نورِ بصیرت کو عام کرنا ہے۔ میرؔ کے ہاں تجربے لفظ و پیکر میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں کیونکہ ان کا شعری شعور ارادی نہیں، وہ ابہام کے قائل ہیں، اس لیے تجربے کو بے حجاب نہیں کرتے۔ انھوں نے اشعار کی تخلیق میں جگرکاوی سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو پستی کی آخری حدوں کو چھو لیتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میر تقی میرؔ۔۔۔ حیات اور شاعری'' کے مطابق میرؔ نے مخصوص علامتی انداز میں عوام کے دل کی دھڑکنوں اور رمزیت میں خارجی حقیقتوں کو سمویا ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی عناصر میں اعتدال پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ غزل کو بلند معنویّت اور اعلیٰ سنجیدگی دی۔ وہ پوری زندگی نامساعد حالات کے باوجود باوقار رہے اور اپنے کلام میں سماجی شعور اور تاریخی سچائیوں کو پیش

کرتے رہے۔ ان کی سیرت اور کلام تناقصات کے حامل ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ دو میرؔ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کی غزل تمام خوبیوں کی حامل ہے جب کہ قصیدہ ایسا نہیں ہے۔

گوپی چند نارنگ کی کتاب ''اسلوبیاتِ میرؔ'' کے مطابق میرؔ کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کی بنا پر ان کا لہجہ شدید انفرادیت کا حامل ہے۔ نثر کی نحوی ترکیب برقرار رہنے کی وجہ سے ان کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک سہل ممتنع کی خوبی پائی جاتی ہے۔ یہ سادگی صرف نحوی ہے، معنوی نہیں، کیونکہ ان کی زبان ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ باطنی معانی کی بھی حامل ہے۔ انھوں نے زبان کے تمام روپ کھنگال کر اس کے آئندہ امکانات کو واضح کیا ہے۔ ان کے ہاں حسن کاری اور تہ داری زبان کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے پوری اُردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں کیا۔

قاضی افضال حسین کی کتاب ''میرؔ کی شعری لسانیات'' کے مطابق میرؔ نے اپنے باطن کے اظہار کے لیے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، علامت اور قافیے کے حربے کامیابی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ وہ لفظ کی تعبیرات کو بروئے کار لا کر اسے اپنے تجربے کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اس طرح ان کی غزل الفاظ کے تخلیقی استعمال کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ وہ روایتی علامتوں کو انوکھی معنوی جہتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ انھوں نے معمولی الفاظ میں بھی تعبیرات کے کئی پہلو روشن کیے ہیں۔ استعارے ان کے ہاں ظاہری حسن و لطف کو تو بڑھا دیتے ہیں لیکن معنویت کی سطح پر کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

مصطفیٰ کمال فاطمی ''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' میں بیان کرتے ہیں کہ ''نکات الشعراء'' اُردو شاعروں کے اب تک دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں شاعر کی شخصیت، سیرت اور ماحول بیان کرتے وقت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس تذکرے سے میرؔ کے نظریاتِ شعری کا پتہ چل جاتا ہے۔ انھوں نے جو اصلاحیں مختلف شاعروں کے کلام پر دی ہیں، اس سے ان کا تنقیدی شعور واضح ہوتا ہے۔ یہی تذکرہ ہے جو ہمیں نئی معلومات دینے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی ادبی تحریکات اور رجحانات کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس تذکرے کے حوالے سے میرؔ کی زندہ دلی اور یارباشی واضح ہوتی ہے جو ان کے تارک الدنیا ہونے کے تصوّر کی نفی کرتی ہے۔ اس کی زبان سادہ و پاکیزہ،

شیریں اور پر لطف ہے۔ ''نکات الشعراء'' تذکرہ نگاری کے دبستان کی بنیاد ہے۔ اس کی تنقید غیر جانب دار، بے باک اور بے لاگ ہے۔ ایم۔ کے۔ فاطمی نے ''تذکرۂ میرؔ'' کے عنوان سے لکھی گئی کتاب میں بھی ان ہی باتوں کو لکھا ہے جو انھوں نے ''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' میں میرؔ کی شخصیت اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے لکھی ہیں۔

راشد آذر ''میرؔ کی غزل گوئی۔۔۔ ایک جائزہ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کے ہاں متضاد رویے ہیں، کیونکہ وہ ساری زندگی کسی ایک ہی راستے پر نہیں چلے اور ان متضاد رویّوں کی وجہ سے ان کے کلام میں تنوع اور حسن ہے۔ وہ جذبے کو شخصی دائرے سے نکال کر کائناتی وسعت دیتے ہیں۔ فکر اور جذبہ ان کے ہاں گھل مل گئے ہیں۔ جہاں پر میرؔ کے کلام میں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں پر تنافرِ لفظی کی خامی بھی پائی جاتی ہے۔

عبدالمغنی ''میرؔ کا تغزل'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ اپنے دور اور ماحول کے ترجمان تھے۔ ذاتی اور اجتماعی صدموں کی وجہ سے ان کے ہاں سوز و گداز کی کیفیت حد سے بڑھ گئی۔ وہ جنس زدہ نہیں تھے، کیونکہ ان کے ہاں عشقِ مجازی سے زیادہ عشقِ حقیقی کے اشارے ہیں۔ دھیمی لَے اور لہجے کی گھلاوٹ ان کے تغزّل کا مخصوص انداز ہے۔ ہستی کے تصوّرِ فناہ کی وجہ سے ان کے ہاں قنوطیّت اور دردانگیزی ہے۔ اس لیے ان کا ذہنی رویّہ مثبت ہے۔ اسلوبِ بیان کے حوالے سے ان کے ہاں سادگی و نرمی بھی ہے اور شوکت و صلابت بھی۔ میرؔ کے ہاں محبت کا وسیع تصور ہے۔ طرزِ میرؔ عام فہم، آہنگ سے بھرپور اور بے ساختہ ہے یہ ان کے اسلوبِ تغزّل کی خصوصیات ہیں۔

ادریس صدیقی کی کتاب ''خدائے سخن۔۔۔ میرتقی میرؔ'' کے مطابق میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں۔ آرزوؔ نے اگرچہ ان کی شاعری میں مدد کی لیکن بعد میں میرؔ اور آرزوؔ کے تعلقات خراب ہو گئے۔ غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ انھیں غمِ عشق کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ ان کے ہاں شاعری کے کچھ اصول تھے جن کی پیروی لازم تھی۔ غم ان کے ہاں ذاتی اور خارجی دونوں حوالوں سے ہے لیکن ان کی شاعری میں ذات اور کائنات کا فرق مٹ گیا ہے۔ ان کے ہاں صوفیانہ عناصر تو ہیں لیکن وہ خود دردؔ کی طرح صوفی ہرگز نہیں ہیں۔

مثنویاتِ میرؔ، تحقیق و تنقید، محمد یار گوندل کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی مثنوی نگار کی حیثیت سے اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ زیادہ تر نقادوں نے میرؔ کی غزل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ان کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کیا ہے جبکہ مصنف نے اس موضوع پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے جس پر عام نقادوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کتاب نے جہاں پر میرؔ کی شاعرانہ عظمت میں اضافہ کیا ہے وہاں پر میرؔ کی نجی اور سماجی زندگی کی تصویر نمایاں کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرؔ کی مثنوی نگاری کے حوالے سے یہ کتاب متعدد نئے پہلو سامنے لانے میں کامیاب رہی ہے۔ میرؔ کی مثنویوں کی تعداد اکثر نقادوں نے چالیس سے کم بیان کی ہے جبکہ مصنف میرؔ کی اکتالیس مثنویوں کو سامنے لانے میں کامیاب رہے ہیں۔

محمد بن علی باوہاب کی کتاب "ذکرِ میرؔ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مع ترجمہ)" "میر شناسی" سے زیادہ میرؔ شکنی کی مظہر ہے۔ اس کتاب میں میرؔ کی ذات اور کلام کے ساتھ ساتھ ان کی آپ بیتی پر بھی شدید نوعیت کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق میرؔ نے "ذکرِ میرؔ" میں اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو بے نقاب نہیں کیا، خاص کر داستانِ عشق کو۔ ان کے ہاں عشقِ مجازی ہے نہ کہ عشقِ حقیقی۔ وہ ناآسودہ جذبات کی تسکین نہ ہونے کی وجہ سے ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ لکھنؤ میں Homo Sex کے مواقع زیادہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ اشیاء پرستی کی طرف آ گئے۔ ذکرِ میرؔ میں والد اور چچا کے متعلق ان کے بیانات سراسر جھوٹ کا پلندہ اور شیعت کا برملا اظہار سیادت کو منوانے کا منصوبہ تھا۔ آرزوؔ نے میرؔ کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن میرؔ نے ان کی عزت پر ڈاکہ ڈالا۔ ان کی شاعری میں وارداتِ قلب کے علاوہ صرف ہجو، رطب و یابس اور فحش کلامی ہے۔ مصنف نے میرؔ سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ناصرؔ کاظمی، حامدی کاشمیری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور مولوی عبدالحق کی آراء کو ردّ کرتے ہوئے انھیں صرف میرؔ کے عقیدت مند قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میرؔ Complex کا شکار تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی ذات کے شدید اظہار کا تقاضا کیا ہے۔ وہ دروں بیں تھے۔ انانیت ان کے ہاں دروں بینی کی وجہ سے تھی اور اسی انانیت نے اپنے آپ کو جب آفاقیت میں ڈھالا تو ان کے ہاں مریضانہ انانیت کی جگہ کلام میں عالم گیری آ گئی۔ وہ مصائب اور نامرادیوں کے باوجود زمانے سے ٹکراتے اور زندہ رہنے کے

عزم کا اظہار کرتے رہے۔

مکمل کتب میں میرؔ کی شخصیت اور فن پر بڑی کھل کر بحث کی گئی اور انھیں ہر حوالے سے قاری کے سامنے لانے کی کوششیں ہوئیں۔ ذات کے حوالے سے متنازع شخصیت ہونے کے باوجود اکثر محققین کی رائے میں وہ ایک خوددار انسان تھے جو ساری زندگی مصائب کو برداشت کرتے رہے لیکن اس کے باوجود زندگی کو باوقار طریقے سے بسر کیا۔

کلامِ میرؔ کے حوالے سے ان کی جو تصویر سامنے آئی، اس میں وہ غزل کے بادشاہ ہیں اور اس صنفِ شاعری میں ان کا مقابل کوئی نہیں ہے۔ ان کی مثنوی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے لیکن وہ مثنوی نگاری کی معراج تک نہ پہنچ سکے۔ قصائد میں بھی وہ سوداؔ کے مقام سے پیچھے ہیں۔ بے شک غزل میں ان کا کوئی مقابل نہیں لیکن ان کی دیگر اصنافِ شاعری بھی نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں بلکہ یہ بھی اُردو ادب میں ایک خاص مقام کی حامل ہیں۔ میرؔ کی نثری تصانیف بھی اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں جن کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مکمل کتب نے ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے قابلِ قدر فریضہ سرانجام دیا اور ان کی ذات اور فن کے حوالے سے متعدد گوشوں کو بے نقاب کیا لیکن اس کے باوجود ابھی تک میرؔ کی ذات اور فن کو سمجھنے کے لیے ''میرؔ شناسی'' کی روایت مزید وسعت کا تقاضا کرتی ہے جہاں پر میرؔ کی نجی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب نہیں ہوئے ہیں وہاں پر ان کی ادبی حیثیت کا تعین بھی کئی حوالوں سے ہونا باقی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، نقدِ میرؔ، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۹۲

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۵۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۳۲۴

۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد تقی میرؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۲۔ نثار احمد فاروقی، تلاشِ میرؔ، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، (ابتدائیہ از خلیق انجم)، ص ۷، ۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۷۔ نثار احمد فاروقی، میر تقی میرؔ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، میر تقی میرؔ، ادارہ ادب وتنقید لاہور، ۱۹۸۰ء، ص۲

۲۴۔ ایضاً، ص۵۱

۲۵۔ ایضاً، ص۶۵

۲۶۔ ایضاً، ص۱۰۹

۲۷۔ ایضاً، ص۱۵۰

۲۸۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، کارگہہ شیشہ گری، میر تقی میرؔ کا مطالعہ، ادارہ ادب سری نگر، ۱۹۸۲ء، ص۲۹

۲۹۔ خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میرؔ، حیات اور شاعری، انجمن ترقیٔ اردو علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص۳۱۸

۳۰۔ ایضاً، ص۵۸۷

۳۱۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیاتِ میرؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۱۰

۳۲۔ ایضاً، ص۲۹

۳۳۔ ایضاً، ص۴۶۔۴۷

۳۴۔ ایضاً، ص۸۴

۳۵۔ قاضی افضال حسین، میر کی شعری لسانیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص۴۰

۳۶۔ ایضاً، ص۶۲

۳۷۔ ایضاً، ص۱۴۷

۳۸۔ ایضاً، ص۲۰۱

۳۹۔ ایم۔ کے۔ فاطمی، اردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۶۲ء، ص۳۱

۴۰۔ ایضاً، ص۴۷

۴۱۔ ایضاً، ص۱۱۲

۴۲۔ ایضاً، ص۱۳۷

۴۳۔ ایضاً، ص۱۵۱۔۱۵۲

۴۴۔ ایضاً، ص۱۸۶

۴۵۔ ایم۔ کے۔ فاطمی، تذکرۂ میرؔ، دانش محل لکھنؤ، بار اوّل ۱۹۶۲ء، ص۳۵

۴۶۔ ایم۔کے۔فاطمی، تذکرۂ میرؔ، دانش محل لکھنؤ، باراوّل ۱۹۶۲ء، ص۴۱

۴۷۔ راشد آذر، میرؔ کی غزل گوئی۔ایک جائزہ، انجمن ترقیِ اردو ہند دہلی، ۱۹۹۱ء، ص۱۱

۴۸۔ ایضاً، ص۲۱

۴۹۔ ایضاً، ص۸۱

۵۰۔ عبدالمغنی، میرؔ کا تغزل، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص۴۔۵

۵۱۔ ایضاً، ص۲۳

۵۲۔ ایضاً، ص۳۷

۵۳۔ ایضاً، ص۴۱

۵۴۔ ادریس صدیقی، خدائے سخن۔میر تقی میرؔ، مکتبہ عزم و عمل کراچی، ۱۹۶۳ء، ص۳۶

۵۵۔ ایضاً، ص۶۳

۵۶۔ ایضاً، ص۸۴

۵۷۔ ایضاً، ص۱۵۱

۵۸۔ محمد یار گوندل، مثنویاتِ میرؔ (تحقیق و تنقید)، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص۱۷

۵۹۔ ایضاً، ص۴۴

۶۰۔ ایضاً، ص۴۷

۶۱۔ ایضاً، ص۵۰

۶۲۔ ایضاً، ص۶۴

۶۳۔ ایضاً، ص۷۱

۶۴۔ ایضاً، ص۸۶

۶۵۔ ایضاً، ص۹۳

۶۶۔ ایضاً، ص۱۲۴

۶۷۔ محمد بن علی باوہاب، ذکرِ میرؔ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مع ترجمہ)، یونائیٹڈ بک کارپوریشن کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۱۲۔۱۳

۶۸۔ ایضاً، ص۲۳۵۔۲۳۶

۶۹۔ محمد بن علی بادہاب، ذکر میر کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (مع ترجمہ)، ص ۲۶۴

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۸۰

۷۱۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۷۲۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۷۳۔ ایضاً، ص ۳۱۴

۷۴۔ ایضاً، ص ۴۱۳

۷۵۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔۴۳۳



باب سوم

میرؔ شناسی: عصرِ حاضر میں

جزوی کتب

میرؔ شناسی، عصرِ حاضر میں: جزوی کتب

''میرؔ شناسی'' کے لیے تذکرہ نگاری کی روایت نے اہم کردار ادا کیا لیکن ''میرؔ شناسی'' کے میدان میں مکمل کتب نے گراں قدر اضافے کیے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مکمل کتاب جتنا مواد فراہم کرنا جزوی کتب کے بس کی بات نہیں لیکن جزوی کتب کا کردار بھی ''میرؔ شناسی'' کی روایت میں ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جزوی کتب میں میرؔ کی زندگی یا شاعری کے کسی پہلو پر جامعیت کے ساتھ لکھا جاتا ہے یا پھر جزوی کتب نے تقابلی انداز اختیار کیا۔ ان میں جہاں پر میرؔ سے شناسائی ہمیں میرؔ تک پہنچاتی ہے وہاں پر دیگر شعراء یا تاریخی اور ادبی رجحانات پر نظر ڈالتے ہوئے تقابلی صورت میں ہم ان کی واضح تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ادبی تاریخ نگاری کے حوالے سے سامنے آنے والی کتب کو بھی میرؔ پر جزوی کتب تصوّر کرتے ہوئے اس ادبی تاریخ نگاری کی روایت کے حوالے سے میرؔ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادبی تاریخ نگاری کی روایت اگرچہ رجحانات پر بحث کرتی ہے لیکن رجحانات بھی شخصیات کے ہی مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ اس لیے ادبی تاریخ کی روایت کو ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے کسی طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

''ولیؔ سے اقبالؔ تک'' ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی تصنیف ہے جس میں شامل مضمون بہ عنوان ''کلامِ میرؔ میں فکر و نظر کا عنصر'' اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ میرؔ کے ہاں فکر کا عنصر کس حد تک اور کس قسم کا موجود ہے جب کہ عام خیال یہ ہے کہ ان کے ہاں فکر کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ شاعری اور فلسفہ دو ایسی الگ الگ چیزیں نہیں کہ ان کا ملاپ نہ ہو سکے۔ شاعر فلسفیانہ خیالات بھی پیش کرتے رہتے ہیں اور فلسفی اپنے نظریات کے پرچار کے لیے شاعری کو استعمال میں لا سکتا ہے۔ میرؔ کے ہاں خالص فکری عناصر کی بظاہر کمی ہے کیونکہ وہ عقلی تجزیے کا شوق نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے ہاں سوچ اور فکر کا عنصر خاصا قابلِ توجہ ہے۔ انھوں نے جہاں پر عقلی تجزیہ کیا بھی ہے وہاں پر بھی ان کا استدلال شاعرانہ تعقل

اور مغالطوں پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں افکار و حقائق کا معقول سرمایہ مل جاتا ہے جس کا معقول حصہ بلند فکری حقائق کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اُردو کے بہت کم شاعروں کے ہاں حقائق کی جستجو کے لیے اتنی تڑپ موجود ہے جتنی میرؔ کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں عقلی تجزیے کی صرف ابتدائی صورتیں موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی عقلیات کا احاطہ محدود ہے لیکن مشاہدات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کے ہاں حیرت کی پراسرار کیفیت چھائی ہوئی ہے اور یہ خوشگوار، سرورانگیز اور لذّت بخش کیفیت ہے۔ یہی حیرت کی کیفیت انھیں استفہام کی لذّت یا کرب ہی میں محو رکھتی ہے اور علل و اسباب تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ان کے ہاں صاحبِ ادراک ہونا بڑی قیمتی چیز ہے لیکن یہ صاحبِ ادراک بڑی مدّت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

؎ برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

انھوں نے ادراک کی منزل تک پہنچنے کے لیے تصفیۂ قلب سے کام لیا ہے۔ اس کے باوجود عقل سے مطلقاً انکار نہیں کیا۔ انھوں نے منطقی انداز سے حقائق کا انکشاف کیا ہے، چاہے ان کی حیثیت سائنسی لحاظ سے ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ:

"میرؔ اصولاً تحیّر اور حیرت کا شاعر ہے مگر اس کی حیرت فکر اور تامل کے کچھ انداز بھی لیے ہوئے ہے۔" [۱]

وحدت الوجود کے حوالے سے وہ بھی عام صوفیوں کی طرح توحیدِ محض کے انتہاپسند معتقد ہیں لیکن کسی کسی جگہ یہ صوفیانہ توحید نرم بھی پڑ جاتی ہے اور وہ وحدت الشہود کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک "ہستی" موہوم اور اعتباری ہے۔ اس لیے اس کی کوئی اصلیت نہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دوسری لہر یہ ہے کہ دنیا ہے تو بڑی دلکش، لیکن یہ فانی ہے اور تیسری لہر ان کے ہاں یہ پائی جاتی ہے کہ دنیا بُری جگہ ہے اور اس میں بدی ہی بدی ہے۔ میرؔ کے بارے میں یہ خیال کہ وہ قنوطی اور تاریک بین شخص تھے، صرف محدود حد تک صحیح ہے۔ ان کا لہجہ اس دنیا کی بے ثباتی کے خلاف یقیناً تلخ ہے اس کے ساتھ ساتھ جب وہ اس نظامِ کائنات میں تضاد دیکھتے ہیں تو بھی ان کے ہاں تلخی کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ

انسان اور سماج کے بعض طریقوں اور عادتوں کے خلاف بیزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان صورتوں کے علاوہ وہ زندگی کے حُسن کے نغمہ خواں ہیں اور اس کی دلکشی کے جادو میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کے حُسن پر فریفتہ تو ہیں لیکن انھیں اس کے فانی ہونے کا گہرا رنج بھی ہے۔ ان کے ہاں جذباتی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ عقلی انداز بھی پایا جاتا ہے جو ان کی فکر اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ ان کے ہاں مشاہداتِ فطرت سے چسپیدگی کے بعد جو تصوّر سب سے زیادہ مثبت اور جاندار ہے وہ موت یا عمرِ ابد کا تصوّر ہے اور یہ تصوّر ان کے ہاں کافی سوچا سمجھا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا تصوّرِ انسان عموماً صوفیوں کے تصوّرِ انسان سے مماثلت رکھتا ہے۔ صوفیوں کا انسان خدا تو ہوسکتا ہے لیکن فرشتہ کبھی نہیں ہوا کیونکہ فرشتہ تو انسان سے کم تر قسم کی نوع ہے اور میؔر کے ہاں بھی:

؎ آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میؔر انساں کا

ان کے ہاں آدمی اور انسان کی اصطلاحیں عموماً مترادف ہیں لیکن کہیں کہیں آدمی اور انسان کے تصوّر میں کچھ فرق ہے۔ کیونکہ:

> ''میؔر کا انسان وہ ہے جو کبریائی کا مدعی ہے اور میؔر کا آدمی وہ ہے جو ایک ناچیز مشتِ خاک سے بنا تھا۔'' ۲؎

میؔر کے ہاں اجتماعی اخلاق اور عملی زندگی سے متعلق تصوّرات بھی موجود ہیں جیسے زندگی میں جگر کاوی کے بغیر ناموری مشکل ہے اور زندگی میں کوئی بڑا کام بے دردِ سر انجام نہیں پا سکتا۔ جستجو اور طلب کامیابی کی دلیل ہے۔ راستہ نہ بھی ہو تو کوشش کرنے والا اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ زندگی مختصر ہے لیکن اس کو عمل سے حسین بنایا جا سکتا ہے۔ بے ہمتی نقصِ الفت ہے۔ محنت میں راحت ہے۔ سربلندی نتیجۂ عجز و نیاز ہے۔ دہر ماتم کدہ سہی لیکن اس کو تجزیے سے عیش گاہ بنایا جا سکتا ہے۔ زندگی ایک نعمت ہے، احسانِ ایزدی ہے، گوہرِ گرامی ہے، اصل شے کردار ہے، صورت ثانوی چیز ہے۔ پختگی کے لیے سفر کی بڑی اہمیت ہے۔ نرمی و ملائمت ضعیف ہونے کی علامت ہے۔ زندگی کے لیے سختی کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں سماجی احوال پر بھی تبصرے ملتے ہیں اور مذہب پر بھی کچھ کچھ غور کیا گیا ہے۔ مذہب کے متعلق

ان کے خیالات کا ایک حصّہ تو روایتی ہے مگر کہیں کہیں ان کے ہاں تجزیہ بھی پایا جاتا ہے۔

میؔر کے بارے میں عام تاثر کہ اُن کے ہاں فکر و نظر کا پہلو بہت کم ہے، غلط ہے، کیونکہ ان کے ضخیم دواوین میں افکار و حقائق کا معقول سرمایہ مل جاتا ہے۔ ان کے ہاں حقائق کی جستجو کے لیے تڑپ ہے۔ اُن کی شاعری میں تجزیہ کی صرف ابتدائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو صرف استفہام تک محدود نہیں رکھا بلکہ بہت سے حقائق کا انکشاف و اثبات بھی کیا ہے، چاہے ان کی حیثیت سائنسی لحاظ سے ناقص ہی کیوں نہ ہو لیکن انداز منطقی ہے۔ ان کے ہاں جذباتی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ عقلی انداز بھی پایا جاتا ہے جو ان کی فکر کا حاصل ہے۔

''مباحث'' ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب ہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ مصنف نے جہاں پر شہرآشوب کا ذکر کیا ہے وہاں پر سوداؔ کے ساتھ میؔر کا بھی ذکر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میؔر کی بہت سی چیزوں کو شہرآشوب کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا باقاعدہ شہرآشوب مخمس کی ہئیت میں ہے اور یہ شاکر ناجیؔ کے تتبع میں معلوم ہوتا ہے کیونکہ شاکر ناجیؔ مخمس کی ہئیت میں شہر آشوب لکھ چکے تھے۔ بقول مصنف:

> ''میؔر کے ہاں بہت سی چیزیں ایسی مل جاتی ہیں جنھیں شہرآشوب کی صف میں لایا جا سکتا ہے لیکن ان کا باقاعدہ شہرآشوب ایک مشہور مخمس ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:
>
> مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
> آئے لشکر میں ہم برائے تلاش'' [۳]

اس کتاب میں میؔر پر کوئی باقاعدہ تفصیلی بحث نہیں لیکن اصناف کے ذکر میں ان کا نام بطور حوالہ شامل کیا گیا ہے۔

''سخن ور (نئے اور پرانے)'' میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''میؔر اور ذہنِ جدید'' کے زیرِ عنوان بیان کرتے ہیں کہ ذہنِ جدید میؔر کے کلام اور شخصیت سے قدماء کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوا ہے

کیونکہ:

''غالبؔ و اقبالؔ کی طرح میرؔ نے بھی اپنے زمانے میں حیات و کائنات کے مسائل پر گہری نظر ڈالی تھی اور انسان اور اس کے مرتبہ و مقام کا جائزہ لیا تھا۔'' ؎

اگرچہ میرؔ کا زمانہ قدیم ہے لیکن ان کے کلام میں ایسی سچائیاں موجود ہیں جن کی حیثیت مستقل اور پائیدار ہے۔ اسی وجہ سے آج کے زمانے میں ان کو زیادہ ناقدانہ اور ہمدردانہ انداز میں پڑھا گیا۔ جدید دور سے پہلے ان کی شخصیت پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ میر کلن خاکسارؔ سے لے کر محمد حسین آزادؔ تک نے میرؔ کے متعلق غیر ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا اور ان کی شاعری کی عظمت کو بے دماغی سے داغ دار بنانے کی کوشش کی۔

نئے زمانے میں میرؔ سے لگاؤ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے دور کو کلامِ میرؔ کے آئینے میں دھندلی سی اپنی تصویر نظر آئی۔ میرؔ نے اپنے عہد کے تمام پہلوؤں پر لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں ان کے افکار کی تشکیل کا باعث ان کا نظریۂ دردمندی بنا۔ انھوں نے نظامِ عالم میں انسان کو مرکزی مقام دیا ہے کیونکہ اپنی زندگی کا بارِگراں انسان کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ فطرت بھی انسان کی دوست نہیں ہے لیکن فطرت کو تسخیر کرنے کی قوّت اس میں موجود ہے۔ ان کے ہاں انسان اور اس کے غموں کی کہانی تلخ ہونے کے باوجود جرأت آموز ہے۔

میرؔ نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اجتماعی زندگی کے متعلق ان کے خیالات محض شاعرانہ ترنگ نہیں بلکہ ان کے ہاں اجتماعیت کی ایک معیّن تصویر ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے سماجی احوال کو غور سے دیکھا ہے اور کھوکھلی زندگی سے بے باکانہ پردہ اٹھایا ہے۔ جدید دور میں ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ تمام احساسات و جذبات کی ترجمانی ہے۔ یہی عمومیت یا معمولیّت کائنات کی معمولی چیزوں کی ہستی کا تعیّن کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی عام ہے جس میں بے تکلفی، سادگی اور شفقت ہے۔ اُردو کی پرانی شاعری میں وہ واحد شخص ہیں جو آزاد تجربوں کے لیے سرگرمِ کار ہوئے، ندرتوں اور وسعتوں کے لیے ان کی یہ بیتابی بھی ذوقِ جدید کے عین مطابق ہے۔ ان کے اجتہادات اور فنّی توسیعات سے دورِ حاضر بجا طور پر متاثر ہوا ہے۔

''شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'' میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''نکات الشعراء'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس تذکرے نے اُردو تذکرہ نویسی پر گہرا اثر ڈالا۔ ''نکات الشعراء'' منظرِ عام پر آنے کے بعد اس کی مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ یہ مخالفت اب بھی جاری ہے۔ میؔر کے اس تذکرے کے حوالے سے، ان کی ذات کو منفی تنقید کا نشانہ بنانے والوں میں سیّد فتح علی حسینی گردیزی میر کلن خاکسارؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ، شفیق اورنگ آبادی، مولوی کریم الدّین اور مولانا محمد حسین آزادؔ شامل ہیں لیکن اس تذکرے کی فنّی اور اندرونی خوبی کی وجہ سے اس کی مخالفت کرنے والوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تنقید میں بے دردی اس تذکرے کا امتیازی وصف ہے۔ کیونکہ:

''بعض شعراء کے ذکر میں میؔر صاحب کا لب و لہجہ طنز آمیز اور تلخ ہے جس سے تنقید میں تلخی ہی نہیں بلکہ شدید 'بے دردی' پیدا ہوگئی ہے۔'' ۵

شاعری پر میؔر صاحب کے اعتراضات کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی وہ شعراء کی سیرت نگاری میں تلخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کی ناقدانہ عظمت کو ان کی سیرت کی اس خامی سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ مصنّف کا خیال ہے کہ آزادؔ نے جو رائے میؔر کی تنقیدوں کے بارے میں دی ہے، ان سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ:

''آزادؔ کی رائے بہت حد تک ناانصافی اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔'' ٦

شعرائے اُردو کا تذکرہ لکھتے وقت میؔر نے دکن کی اوّلیت تسلیم کرنے کے باوجود ان شعراء کو اہمیت نہیں دی کیونکہ دلّی کے عام تذکرہ نگاروں کا دکن کے شعراء (سوائے چند بڑے شاعروں کے) کے بارے میں یہی رجحان تھا۔ ولؔی کے بارے میں ان کی رائے ولؔی کی شان اور بڑائی کے مطابق نہیں۔ انھوں نے جہاں پر شعراء کے کلام کے بارے میں سخت جملے لکھے ہیں وہاں پر ان کی ذات کی تعریف بھی کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقید اور سوانح کو ایک دوسرے کے اثر سے باہر رکھا ہے۔ ''نکات الشعراء'' کی سخت تنقید نے کم پایہ ادب کو بڑھنے سے روک دیا۔ بے شک نکات میں ادبی گروہ بندی اور عصبیّت کے آثار ہیں لیکن اس نے تنقیدی ذوق کی تربیت میں جو نمایاں حصہ لیا ہے، اس سے ادب

اور شاعری کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔

مصنف نے اصلاحِ سخن اور انتخابِ کلام کو نکات کا امتیازی وصف قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری نکات کا شاندار ترین وصف ہے۔ اس کی سیرتوں کے اختصار و ایجاز میں وہ معنویّت اور مصوّرانہ دقتِ نظر ہے جو تفصیل میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس کے باوجود بعض اوقات میرؔ کا یہ ایجاز و اختصار قابلِ اعتراض حد تک کھوکھلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''نکات الشعراء'' نے اپنے دور کے ادبی رجحانات کو بے حد متاثر کیا۔ اس کی تائید اور تردید میں کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن:

> ''نکات نے آنے والے تذکروں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ایک صدی کے بعد تک محمد حسین آزادؔ اور ان کے بعد کے تمام قابلِ ذکر تذکرے اس اہم مآخذ کو نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔'' ۷

اگرچہ ''نکات الشعراء'' نے تذکرہ نگاری کی روایت پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں لیکن اس کی تنقید میں کہیں کہیں تلخی آنے کی وجہ سے بے دردی کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔

''<u>لطیفِ غزل</u>'' مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ولیؔ، میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، اور آتشؔ کے فن پر دیے۔

میرؔ پر دیے گئے لیکچر میں سب سے پہلے ان کی شاعری کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو واضح کیا گیا ہے، جس میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ ان کے ہاں غم کی کیفیت ذاتی حوالے سے تھی لیکن انھوں نے اسے کائناتی رنگ دے دیا۔ جہاں پر میرؔ کی شاعری پر سیاسی اور سماجی حالات کا اثر ہے، وہاں پر ان کی ذاتی زندگی کا بھی بہت زیادہ اثر ہے لیکن اس غم کو انھوں نے رومانی انداز میں بسر کرنے کی کوشش کی۔ بقول مصنف:

> ''بعض لوگ غم کو ایک رومانی شکل دیتے ہیں اور شاید میرؔ بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے غم کو رومانی بنا دیا۔ انھوں نے بھی غم کو خوشی میں تبدیل کر دیا۔ میرؔ نے اس کے

اندر خوشی اور سرور اور بے خودی کا ایک پہلو اپنے لیے پیدا کیا،
حالانکہ میرؔ ایک غم کے شاعر ہیں۔'' ۸

اس لیکچر میں میرؔ کی بددماغی کا دفاع کرتے ہوئے مصنف نے اسے بے خودی کی کیفیت ثابت کیا ہے۔ ان کے تصوّرات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّدعبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا زندگی کے متعلق نظریہ حزنیہ ہے اور انھوں نے اپنے فلسفۂ غم کا نام فلسفۂ دردمندی رکھا ہے۔ ان کے تصوّرات کے تین اہم عناصر یہ ہیں:

۱۔ تصوّف کی روایت یا قدیم روایت کے تصوّرات
۲۔ وہ تصوّرات جو مسلسل جذباتی ریاضت اور فکری تجزیہ کے نتیجہ میں ہیں
۳۔ وہ تصوّرات جو شخصی اور ذاتی حزنیہ نقطۂ نظر سے اُبھرے

نیچر کے متعلق ان کا مشاہدہ محدود نہیں تھا بلکہ وہ تو مشاہدات پر غور کی دعوت دیتے ہیں۔

؎ سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

وہ نیچر کی جامد چیزوں کے مقابلے میں متحرک چیزوں کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ ان کی غزل بہت سی خوبیوں کی حامل ہے جس کا مقابلہ کوئی شاعر نہیں کر سکتا لیکن ان کی مثنویاں اور واسوخت بھی شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

میرؔ کی شاعری کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

''میرؔ نے ایماء اور تفصیل دونوں کا اجتماع پیش کیا ہے اور یہ کمال ہے۔ اشاروں سے سمجھانے کی کوشش بھی گھمبیر معنویّت رکھتی ہے اور تسلسل بھی۔ غالبؔ شاید تفصیل اور بیانیہ انداز میں میرؔ سے بہت پیچھے ہیں۔'' ۹

''اُردو شاعری میں المیہ تصورات'' ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ سے فانیؔ تک کے المیہ تصورات کا جائزہ لیا ہے۔ ''میرتقی میرؔ: اُردو کا عظیم ترین المیہ نگار شاعر''

کے زیرِعنوان انھوں نے میرؔ کی شاعری میں غمِ عشق، غمِ حیات اور غمِ کائنات کے حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق موضوعات اور اسلوبِ شعر کے اعتبار سے وہ اُردو کے سب سے بڑے الم نگار شاعر ہیں۔ ان کی الم نگاری نے اُردو غزل پر گہرے اثرات مرتّب کیے ہیں۔

میرؔ کے مختصر سوانحی خاکے کے مطابق وہ ۱۱۳۵ھ، ۱۱۳۶ھ یا ۱۱۳۷ھ میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ میرؔ کے والد درویش صفت انسان تھے انھیں اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ کسی اور نظامِ اقدار کا حصہ تھے اس لیے میرؔ کا بچپن زندگی کے عمومی الزامات سے یکسر عاری تھا اور ان پر اپنے والد اور چچا کے گہرے اثرات تھے۔ اُن کے والد کی وفات ان کے لیے ایک بہت بڑا جذباتی صدمہ اور عمر بھر کی اداسی کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ والد کی وفات کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی سے اختلافات کا آغاز ہو گیا اور میرؔ ناچار گیارہ بارہ سال کی عمر میں دلّی آ گئے جہاں پر صمصام الدّولہ نے ایک روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ سے جنگ کے دوران جب صمصام الدّولہ زخمی ہو کر انتقال کر گئے تو میرؔ کا وظیفہ بند ہو گیا اور وہ اکبرآباد لوٹ آئے۔ نادر شاہ کے حملے نے دلّی کو تباہ و برباد کر دیا جب حالات قدرے بہتر ہوئے تو میرؔ دوبارہ سترہ سال کی عمر میں دلّی آئے اور سوتیلے ماموں آرزوؔ کے ہاں قیام کیا اور انھیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میرؔ نے آرزوؔ کو ''نکات الشعراء'' میں اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے جبکہ ''ذکرِ میرؔ'' جو آرزوؔ کی وفات کے بعد لکھی گئی اس میں شکوے کا انداز پایا جاتا ہے۔ آرزوؔ سے میرؔ کے تعلقات خراب ہونے کے بعد وہ رعایت خاں، خواجہ سرا جاوید خاں اور راجہ ناگرمل کے ملازم رہے۔ یہ زمانہ دلّی کے لیے آفات و مصائب کا زمانہ تھا۔ اس دور میں میرؔ کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ نواب آصف الدّولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کے کہنے پر آصف الدّولہ نے میرؔ کو لکھنؤ بلایا اور میرؔ نواب آصف الدّولہ کے ملازم ہو گئے۔ وہ اکتیس سال لکھنؤ میں رہے اور ۱۸۱۰ء کو وفات پائی۔ میرؔ کا زمانہ شمالی ہند میں غیرمعمولی انتشار کا زمانہ تھا اور:

> ''دہلی کی تباہی و بربادی نے میرؔ کو شدّت کے ساتھ متأثر کیا،
> اس لیے ان کی شاعری میں شہروں کی بربادی دراصل دہلی ہی کی
> بربادی کی علامت ہے۔'' ؎۱

میؔر نے اپنے عہد کی ساری شکست و ریخت کا اظہار تخلیقی سطح پر کیا ہے کیونکہ ان کی حسِ تاریخیت بہت تیز تھی۔ انھوں نے ذات کے غم کو اپنے عہد کے غم سے ہم آہنگ کر کے اُردو کی عظیم المیہ شاعری کی بنیاد رکھی۔

؎ دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ
اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

لیکن اس کے برعکس انھوں نے ستم گر محبوب کے پردے میں اہلِ زمانہ کے جور و جفا کا ذکر بھی کیا ہے۔

ذاتی زندگی کے المناک تجربات اور زوال آشنا عہد نے ان کی شاعری میں دردمندی پیدا کی جس نے دنیا کے ہر دُکھ میں ان کے لیے ذاتی معنویّت پیدا کی ہے۔ ان کے ہاں یہ دردمندی ایک وسیع تر اور عمیق تر ہمدردی ہے جو ان کے ذاتی الم کو انسان کے آفاقی غم کے ساتھ وابستہ کرتی ہے۔

؎ نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ وفریاد

حیات و کائنات کے المیہ پہلوؤں کے متعلق ان کی گہری حساسیت کا سرچشمہ یہی دردمندی ہے جو انھیں دنیا کے عظیم المیہ مفکروں کے قریب لاتی ہے۔ میؔر کے غم کے متعلق مصنّف لکھتے ہیں:

> ''میؔر کے غم کو قطعی طور پر انفرادی قرار دینا، ان کے تاریخی شعور کے ساتھ اور ان کی وسیع تر انسانی ہمدردی کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے غم کا نقطۂ آغاز ان کی اپنی ''ذات'' ہے جو مختلف اوقات میں مختلف انداز میں موردِ الزام رہی۔'' [۱۱]

انھوں نے ناکامیوں کو قبول کر کے انھیں مثبت انداز دیا۔ انھیں یہ ہمت عشق نے دی جو ان کے درد و الم کا سرچشمہ بھی ہے۔

؎ اعجازِ عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے

میرؔ اپنی ہستی اور اپنی زندگی کو سراپا غم سمجھتے ہیں۔ ان کا اصل آرٹ الم نگاری ہے جس کے اظہار کے لیے انھوں نے متنوع پیرائے استعمال کیے ہیں۔ ان کا غم ذاتی تھا لیکن اس میں اجتماعی احساسات اس طرح شامل ہوئے کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ان کے ہاں ''ہم'' کا لفظ صرف ''میں'' کے معنی نہیں دیتا بلکہ یہ لفظ کسی نہ کسی سطح پر اپنا تعلق معاشرے سے قائم کر لیتا ہے۔

میرؔ کی تمام تر شاعری ان کے ذاتی احوال کا بیان نہیں ہے۔ غزل کا شاعر ہونے کی وجہ سے انھیں تمام تر مشاہدات کو بھی تجربات کی شکل میں پیش کرنا پڑا۔ ان کے ہاں غم پسندی کی یکسانیت کے باوجود تجربات و مشاہدات کا تنوع ہے۔ انھیں تخیل کی سطح پر مختلف کرداروں میں ڈھل جانے کا فن آتا ہے کیونکہ:

> ''میرؔ نے اپنے تخلیقی جذبے کی شدت اور تخلیق کی ہمہ گیری کی
> بدولت اپنے عہد کے مظلوم و مجبور اور بے کس و بے بس اور
> مقہور و مردود انسانوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھا، اور اپنی انا
> کو تقسیم کر کے ڈرامائی فنکار کی طرح کئی کرداروں میں تحلیل کر دیا
> تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔'' ۱۲

میرؔ کے جذبۂ الم کا سب سے زیادہ اظہار گریہ و زاری اور اشک فشانی کے عمل میں ملتا ہے لیکن اس میں بھی اکثر تہذیبی محرکات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ رونے اور آنسو بہانے کے انھوں نے بہت زیادہ پیرائے اختیار کیے ہیں۔ ان کے ہاں افسردگی کی کیفیت شروع سے لے کر آخر تک طاری رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں خارجی لحاظ سے گرم جوشی بہت کم نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو افسردہ دل نہیں مانتے۔ احساسِ محرومی بھی ان کی شاعری میں گہرا ہے۔ بعض اوقات وہ اس محرومی کے احساس کو عقلی توجیہات سے کم کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

؎ بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

میرؔ اپنی ذات کا مکمل طور پر اظہار نہیں کر سکے اور ذات کے اظہار کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا بھی انھیں پوری طرح احساس تھا۔ ان کا مشاہدہ وسیع ہونے کے باوجود مجموعی طور پر وہ زندگی میں ایک

طرح گھٹن محسوس کرتے رہے۔

؎ دیوانگی کہاں کہ گریباں سے تنگ ہوں
گردن مری ہے طوق میں گویا کہ پھنس رہی

انھوں نے وحشت اور آشفتگی کے موضوعات کو کمال بے ساختگی اور ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں یادِ ماضی Nostalgia کی صورت ہی نہیں بلکہ گہری دردمندی کے احساس کی صورت میں ہے۔ یادِ رفتگاں انھیں افسردہ کر دیتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا براہِ راست احوال اپنی مثنوی ''خواب و خیال'' کے آغاز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے ان کے شدید المیہ جذبے کا اظہار ہوتا ہے:

؎ زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل
گئی کب پریشانی روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی

میرؔ نے اپنی دوسری عشقیہ مثنویوں میں بھی مؤثر الم نگاری کی ہے۔ ان کے ہاں غم و الم کا ایک عمومی احساس جگہ جگہ پر ملتا ہے وہ غم کو زندگی کا لازمی اور غالب حصہ شمار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جو اذیت پسندی اور خود اذیتی پائی جاتی ہے وہ ''نشاطِ غم'' میں ڈھل کر اپنی انتہا کا احساس دلاتی ہے۔

؎ لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

انھوں نے غم کی عمومی صورتوں کا بیان کیا ہے جن کا تجربہ ہر انسان کو ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے:

> ''میرؔ کے غم میں کچھ ایسی وسعت اور آفاقیت ہے کہ وہ اپنی تمام ترنشتریت اور چبھن کے باوجود گوارا محسوس ہوتا ہے۔ میرؔ کے غم میں ایسی گہری انسانی معنویت ہے کہ اکثر صورتوں میں ہر شخص کو اپنا غم محسوس ہوتا ہے۔'' ۱۳

میؔر کی الم پسندی کا سب سے تعمیری پہلو یہ ہے کہ ان کا المیہ طرزِ احساس عصری شعور کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے اور ان کے عہد کے انسان کے المناک انجام نے اور اس عہد کی شکست و ریخت نے انھیں ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دل اور دلّی کا فرق مٹ گیا ہے۔ اگرچہ میؔر کا تصوّرِ مکان زیادہ وقیع نہیں تھا اس کے باوجود ان کا وجدان دنیا اور آفاق کی وسعتوں کا احساس ضرور رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں نوعِ بشر کی وحدت کا ادراک بھی ہے۔ اس لیے انسانوں کے غم اور کائنات کے الم انگیز حقائق کا احساس انھیں ذاتی آلام کی طرح شدّت سے ہوتا ہے۔

؎ اس باغِ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آ لگے

میؔر کی زندگی میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں نے زندگی اور اس کی قدروں کا حُسن پامال کر دیا جس نے ان کے ہاں مستقل احساسِ الم کی صورت اختیار کر لی۔

؎ جن بلاؤں کو میؔر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

ان کے عہد کا سب سے بڑا اور اجتماعی مسئلہ غمِ روزگار اور فکرِ معاش تھا۔ زمانے کے حالات نے معاشرے کی معیشت کو کلی طور پر تباہ کر دیا۔ میؔر چونکہ بچپن ہی سے معاش کی فکر کے تجربے سے گزر چکے تھے اس لیے وہ اس دور کے انسانوں کے اس غم کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے اسی لیے ان کی شاعری میں منعم اور بے زر کا موازنہ واضح طور پر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں فکرِ روزگار، غمِ حیات اور معاشی بدحالی کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔

دنیا، آفاق اور کائنات کے حوالے سے میؔر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کے مطابق وہ عالمِ انفس کی وسعتوں کے قائل ہیں اور خارجی دنیا کو اکثر چھوٹے پیمانے پر تصوّر کرتے ہیں لیکن عظیم مظاہرِ فطرت کے ذریعے کائنات کی وسعت کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مظاہرِ کائنات میں بھی معنویّت کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بھی ان کے ہاں ایک حزنیہ رو ہے اور کائنات ایک برتر ہستی کے عشق میں مبتلائے غم ہے۔

؎ گل و سنبل ہیں نیرنگِ قضا، مت سرسری گزرے
کہ بگڑے زلف و رُخ کیا کیا بناتے اس گلستاں کو

میؔر زندگی کی خوشیوں سے مکمل طور پر انکار نہیں کرتے بلکہ ان کا اسرار اس بات پر ہے کہ زمانے نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور:

> ''میؔر کے غم کا اثباتی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اسے ایک ناگزیر حقیقت پا کر نہ صرف اس کو قبول کیا بلکہ ایک ایسی وضعِ زیست میں تبدیل کر دیا جو جگرداری، بلندنظری، عالی حوصلگی، صبرورضا، بے نیازی، عظمتِ انساں کے ادراک، قناعت پسندی اور بخود گزیدگی مگر انسان دوستی جیسی بلند اور برتر اخلاقی اور روحانی اقدار کا مظہر بن گئی۔'' [۱۴]

میؔر کے غم میں خلوص اور سچائی ہے۔غم نے ان کے سامنے زندگی کی کئی پرتیں کھول کر رکھ دی ہیں اور ان پرتوں تک غم کے سہارے کے بغیر پہنچنا ناممکن تھا۔

؎ یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

انھوں نے اپنے سارے رنج والم اور شدید المیہ جذبے کو بے قراری میں بڑی کامیابی کے ساتھ تبدیل کیا ہے۔ مصنّف نے اس کتاب میں میؔر کے المیہ تصوّرات کے اسباب، ان کی نوعیّت، اظہار اور ان کے، ان کی ذات پر وسیع تر اثرات کا جائزہ بڑی کامیابی کے ساتھ لیا ہے۔ ان کی بحث کے بعد میؔر کے المیہ تصوّرات صرف تصوّرات ہی نہیں رہتے بلکہ یہ انسانی زیست اور کائنات کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے المیہ تصوّرات نے انھیں مغلوب کر کے زندگی سے فرار کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ میؔر غم پر غالب ہو کر زندگی کو ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ گزارنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

''پیغمبرانِ سخن، کبیر، میؔر اور غالبؔ'' سردار جعفری کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میؔر کی شاعری کا کوئی منکر نہیں۔ یہ شاعری جتنی سادہ ہے اتنی ہی ٹیڑھی، بانکی، ترچھی اور تیکھی ہے۔ نرم

اور گرم کا امتزاج میؔر کی شخصیت کا سارا جادو ہے اور یہی شخصیت اپنے عہد کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک ہو گئی ہے۔ زمانے کے حالات کی وجہ سے ان کے ہاں نشاط و سرشاری مفقود ہے۔ سوؔدا کے بعد میؔر کے کلام میں سب سے زیادہ گالیاں ملیں گی۔ اسی وجہ سے کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ میؔر کا بلند کلام بلند اور پست کلام بے انتہا پست ہے۔

میؔر کا غم صرف ان کی ذات کا غم نہیں بلکہ کائنات کا غم ہے۔ ان کے ہاں بے بسی اور بیچارگی کے ساتھ ساتھ عظمت اور وقار ہے۔ وہ ایک ہارے ہوئے عاشق ضرور ہیں لیکن یہ ہار زمانے کی دی ہوئی ہار نہیں، خدا کی دی ہوئی ہار معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک بامقصد اور باشعور شاعر ہیں۔ انھوں نے امیروں کی نوکری ضرور کی لیکن غزل کا دامن ان کی تعریف سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ان کے ہاں غزل کے شعروں میں جہاں پر زمانے کی بات کی گئی ہے وہاں پر ان کی آپ بیتی، اُن کی اپنی زندگی سے زیادہ عہد کی خانہ جنگیوں کی داستان ہے جس سے ان کی سیاسی بصیرت جھلکتی ہے، کیونکہ وہ اپنے عہد کے المناک ڈرامے میں ذاتی طور پر شریک تھے۔

اٹھارویں صدی اُردو زبان کے ارتقاء کی صدی ہے جس میں میؔر اور ان کے ہم عصر شعراء جہاں پر عام بول چال کی زبان کو شعروں میں ڈھال رہے تھے وہاں پر فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ بھی کر رہے تھے۔ میؔر پر وؔلی کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میؔر کی زبان بول چال کی زبان ہے۔ انھوں نے ہندوستانی لب و لہجے کو فارسی لب و لہجے پر ترجیح دی ہے۔

مصنّف نے ''آبِ حیات'' کو میؔر کا دلچسپ تذکرہ قرار دیا ہے جس میں شامل میؔر سے متعلق کئی واقعات سے انھوں نے اختلاف کیا ہے لیکن پھر بھی ان کے خیال کے مطابق اس میں میؔر کے کردار اور شخصیت کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ میؔر کا لکھنؤ پہنچ کر لوگوں کے پوچھنے پر کہ حضور کا وطن کہاں ہے، قطعہ پڑھنے والا واقعہ محض افسانہ ہے اور یہ اشعار میؔر کے اشعار ہی نہیں ہیں۔ ان کی تنک مزاجی اور بددماغی کے حوالے سے جو واقعات آزؔاد نے لکھے ہیں، ان سے بھی مصنّف مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال کے مطابق میؔر نازک مزاج ضرور تھے لیکن درباروں کے آداب سے پوری طرح واقف تھے کیونکہ وہ نوکر بھی رہے اور سفارت کے فرائض بھی سرانجام دیے۔

''ذکرِ میرؔ'' میں انھوں نے اپنے باپ اور دادا کو جوشِ عقیدت میں جتنا مشہور لکھ دیا ہے وہ اتنے مشہور نہیں تھے۔ ان کے بچپن کے واقعات سے یوں لگتا ہے کہ ان کا گھرانہ خوش حال گھرانہ نہیں تھا۔ وہ دلّی آئے، پھر اکبرآباد آئے، دوبارہ دلی گئے تو آرزوؔ کے پاس قیام کیا۔ وہ نوعمری ہی میں مشہور اور مستند شاعر ہو گئے تھے۔ بقول مصنّف:

> ''چاہے میرؔ نے دیوانگی کے عالم میں خان آرزوؔ کے زیرِاثر شاعری شروع کی ہو چاہے دیوانگی کے بعد امروہے کے سعادت علی خاں کی ترغیب سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نوعمری ہی میں مستند شاعر ہو گئے تھے۔'' ۱۵

دلّی میں قیام کے دوران ان کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں قتل و غارت اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ جس کا ذکر، میرؔ کی بہت سی غزلوں میں بھی ہوا ہے۔ جب دلّی اُجڑ رہی تھی تو لکھنؤ آباد ہو رہا تھا۔ وہ بھی نواب آصف الدّولہ کے کہنے پر لکھنؤ آ گئے اور یہ وہی میرؔ تھے جنھوں نے رعایت خاں سے اس لیے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ اس نے ڈوم کے لڑکے کو گانے کے لیے ان سے کہا تھا کہ اسے اپنے چند شعر یاد کروا دیں لیکن لکھنؤ میں یہی میرؔ مرغوں کی لڑائی میں نواب آصف الدّولہ کو اپنی غزل سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں پر میرؔ کو معاشی فراغت تو نصیب ہوئی لیکن وہ اس کے باوجود لکھنؤ سے ناخوش رہے۔

؎ کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

اصل میں میرؔ کا مزاج لکھنؤ کی فضا سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ لکھنؤ کی فضا ایک ایسی شاعری پیدا کر رہی تھی جس میں معشوق کا جسم عاشق کے دل سے زیادہ اہم تھا۔ اس شاعری نے لفظوں کی ظاہری تراش خراش پر زیادہ زور دیا لیکن یہ اندر سے بے جان رہی۔ اس لیے میرؔ کی عمر کے آخری بیس تیس سال ان کے معیار کی غزل فراہم نہ کر سکے اور وہ زیادہ تر آصف الدّولہ کے لیے شکارنامے اور مثنویاں لکھتے رہے۔

میرؔ ان معنوں میں عشقیہ شاعر نہیں ہیں کہ انھیں جنسیات تک محدود کر دیا جائے۔ ان کے ہاں عشق ایک بحرِ بیکراں ہے جس کی بہت سی موجیں ہیں۔ عاشق ان کے عہد کے انسان کی طرح ایک کچلی ہوئی شخصیت ہے جو اپنا کھویا ہوا وقار واپس مانگ رہی ہے۔ اس میں دور دور تک انانیت کا پتہ نہیں، صرف بے دماغی ہے۔ میرؔ کی غزلوں میں اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں انھوں نے سماجی، سیاسی اور معاشی مضامین کو براہِ راست ڈھال دیا ہے جبکہ ایسی چیزیں غزل کی نازک طبع پر گراں ہیں۔ اس براہِ راست بیان کے علاوہ انھوں نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے۔ اُن کے محبوب کے اس تصوّر کے پیچھے حالاتِ زمانہ کا ایک سماجی شعور ہے۔

میرؔ کے ہاں وصل کی تین کیفیتیں ہیں:

۱۔ محبوب کے گال کاٹنے اور نشے میں دھت معشوق کی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خبر لینے کی کیفیت۔

۲۔ وہ کیفیت جہاں وصل کی لذّت درد وغم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔

۳۔ خالص نشاط کی کیفیت۔

لیکن ان کے ہاں وصال کا اضطراب، درد و کرب اور خالص نشاط سب کچھ ہونے کے باوجود یہ شاعری وصال کی سادہ لذّت اور معشوق نوازی کی کیفیت سے خالی ہے۔ ان کے ہاں محبوب کئی شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ ہر معشوق کے ساتھ میرؔ کے احساسات و جذبات بالکل مختلف ہیں۔ ان کی شاعری میں موت کے دو پہلو ہیں:

۱۔ معشوقِ حقیقی سے وصال

۲۔ فطری عمل

میرؔ کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> "میرؔ کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، بلبل بھی ہے اور صیّاد بھی، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی،

> زندہ رہنے کی اُمنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔'' ۱۶

''میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ'' ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کی کتاب ہے جس میں مصنف ''میرؔ اور غالبؔ کا تقابلی مطالعہ'' کے زیرِعنوان بیان کرتے ہیں کہ میرؔ اور غالبؔ میں زمانی بُعد کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری بُعد بھی ہے۔ ان میں سے ایک نے شدید جذبوں کو وفورِ جذبات کے ساتھ پیش کیا تو دوسرے نے اپنے تاثرات کو تعقّل میں ڈبو کر جذبہ وفکر کو ہم آہنگ کر دیا۔ میرؔ کے ہاں دھیمے لہجے میں بہکی بہکی باتیں طول بیانی کی حامل ہیں اور غالبؔ کے ہاں تاتاری لہجہ اور کفایتِ لفظی کی حامل باتوں کا نمونہ ہے۔ میرؔ کے رطب و یابس سے بھرے ضخیم دیوان اور غالبؔ کے ہاں سراپا انتخاب کلام۔ میرؔ کے ہاں غم و اندوہ کی جذباتی کسک، طعن و تشنیع کا زور اور غالبؔ کے ہاں غم کی فکری نوعیّت، لطیف ظرافت اور مزاح کی فراوانی ہے۔ ان کے ہاں ہر غم، غمِ جاناں اور غالبؔ کے ہاں ہر غم، غمِ زیست کا نقیب۔ میرؔ کے ہاں تہذیبی اقدار کے زوال پر ماتم اور غالبؔ کے ہاں نئی قدروں سے رابطے کی خواہش۔ میرؔ کے ہاں ناکامیوں کے باوصف محبت میں سلیقے سے نبھانے کا دعویٰ جب کہ غالبؔ کے ہاں دامن کو حریفانہ کھینچنے کی جرأت۔ میرؔ کے عشق میں خودسپردگی اور عزلت پسندی جب کہ غالبؔ کے ہاں جارحیّت پسندی اور محفل آرائی کا شوق۔ میرؔ کی طبیعت نازک مزاج شہاں اور غالبؔ کے مزاج میں انکساری و شگفتگی کا رنگ۔ ان فنی اور فکری فاصلوں اور امتیازات کے باوجود دونوں کے ہاں مشترک خصائص بھی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ زمانی بُعد کے باوجود دونوں شعراء کے زمانے کے حالات کم وبیش ایک جیسے ہیں۔ دونوں کے ہاں:

۱۔ زمانے کا انتشار

۲۔ دلّی کی بربادی کا نوحہ

۳۔ احساسِ برتری اور احساسِ کمال

۴۔ انفرادیت کا شدید احساس

۵۔ مسلّماتِ متعارفہ کی تردید اور تضحیک کا جذبہ

۶۔ تشکیک وتنقید کا رویّہ

۷۔ حسّاسیّت اور شدّتِ جذبات

کا وجود ہے لیکن اس کے باوجود:

> ''دونوں کا فن مختلف اسالیب کا حامل ہے۔ دونوں کا زندگی کے بارے میں رویّہ مختلف ہے، دونوں کا فلسفۂ حیات مختلف ہے، دونوں کا نظریۂ فن مختلف ہے۔'' ۱۷

ذاتی اور معاشرتی حالات نے میؔر کی طبیعت میں افسردگی اور دردمندی کا سحر پھونکا جس نے انھیں غمزدہ اور الم پسند انسان بنا دیا اور پھر وہ ساری زندگی روئے یا رُلاتے رہے۔ ان کے ہاں تشبیہات، استعارات اور علامات بھی افسردگی اور غم کے حوالے سے ہیں۔ غالبؔ کے ہاں بھی غم ہے لیکن سلبی یا منفی شکل بہت کم اختیار کرتا ہے۔ غالبؔ، میؔر سے کم غمزدہ نہیں ہیں لیکن ''الم پسندی'' کے سلسلے میں دونوں کا رویّہ بالکل مختلف ہے۔ میؔر میں زندگی کی مقاومت کا وہ حوصلہ نہیں جو غالبؔ میں ہے۔ میؔر امکانات یا ذوقِ عمل کے شاعر نہیں جب کہ غالبؔ امکانات کے شاعر ہیں۔ ان دونوں کے ہاں ذاتی کرب اور آشوبِ زیست کے اظہار کے مختلف رویّے پائے جاتے ہیں۔ میؔر کے ہاں بیتابی، گریۂ پیہم اور شکوہ ہے جب کہ غالبؔ کے ہاں حوصلہ اور شگفتہ مزاج ہے۔ میؔر کے ہاں سلبی نظریات زیادہ ہیں اور غالبؔ کے ہاں زندگی سے بھرپور لگاؤ ہے۔ غالبؔ حیات کے اور میؔر موت کے شاعر ہیں۔ میؔر کے بارے میں حتمی رائے قائم کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ:

> ''میؔر اور غالبؔ کے شعری تناظر مختلف ہیں۔ ان کے ذہنی رویّے اور فاصلے مماثلتوں اور قربتوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔'' ۱۸

اسی کتاب کے دوسرے مضمون ''میں۔ معترفِ میؔر'' میں مصنّف لکھتے ہیں کہ میؔر اپنے رنگ کے ایسے شاعر ہیں جن کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی اور اس رنگ میں وہ یکتا ہیں کیونکہ انسانی جذبات و احساسات کا تنوّع جتنا ان کے ہاں ہے، اتنا کسی اور شاعر کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ وہ دروں بیں تھے، اس

لیے ان کے ہاں سوز و گداز اور جذبہ و احساس کی گرمی و شدّت پائی جاتی ہے اور:

''اس شاعری کو پڑھ کر طبیعت سکون کی طرف مائل ہوتی ہے۔
جذبوں کی تطہیر ہوتی ہے۔ نغمگی سے بھری لے اور نرماہٹ،
مزاج کو صوفیانہ رنگ میں رنگ دیتی ہے۔'' ۱۹

میرؔ کا کلام اُداس ضرور کرتا ہے لیکن اس میں مریضانہ گھٹن نہیں ہے۔ ان کا خارجی زمانہ انتشار کا زمانہ تھا، اسی لیے انھوں نے دل کی دنیا میں پناہ لی، ہمارا زمانہ بھی زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلانے والا زمانہ ہے، اس لیے آج کے انسان کو بھی ان کی آواز اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔

عوامی لہجہ، عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گزارنا، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا، کسی کی خوشامد نہ کرنا محبت میں نبھانے کا سلیقہ اور وضع داری جیسے اوصاف کی وجہ سے بھی مصنف میرؔ کی عظمت کے معترف ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے خیال کے مطابق ان دونوں شعراء کے شعری تناظر مختلف ہیں۔ ان میں بہت زیادہ مشترک خصوصیات ہونے کے باوجود، ذہنی رویّے اور فاصلے، ذہنی قربتوں سے زیادہ ہیں۔

''میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ'' ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ہے جس میں انھوں نے تین صدیوں کے تین عظیم شاعروں کا مطالعہ ''وحدت الوجود'' کے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اس مطالعہ کے لیے ان کے صرف اُردو کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔

میرؔ کا زمانہ برصغیر میں طوائف الملوکی، افراتفری اور اضطراب و کرب کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کے حالات کی طرف مخصوص محاورات، استعارات اور علامات کے ذریعے انھوں نے اپنے کلام میں اشارے کیے ہیں۔ مجموعی ملکی فضا کا عکس بہت حسّاس تاثر کے ساتھ ان کے کلام میں صاف نظر آتا ہے۔

؎ جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

میرؔ نے خود اردگرد کے حالات و کوائف اور اپنی شاعری کے ربط کے بارے میں کہا ہے کہ:

؎ برہمی حال کی ہے ساری مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

ایسے اشعار میں میرؔ نے اپنی بصیرتوں کا اظہار کیا ہے جو انھیں وجدان سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ اپنے زمانے سے بے خبر نہیں تھے کیونکہ:

''بڑا شاعر اپنے عہد اور اپنے معاشرے کے مزاج اور اجتماعی
شعور کا رازداں بھی ہوتا ہے اور ترجمان بھی۔'' ۲۰

میرؔ جن کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے صرف اپنی ہی رام کہانی کہی ہے ایسے شعر کہتے بھی نظر آتے ہیں:

؎ عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اِس فرقے کا عاشق ہوں
بھری مجلس میں بے دھڑکے یہ سب اسرار کہتے ہیں

کسی قوم کا ادب اس کی تہذیب و تمدن کا مظہر ہوتا ہے۔ تہذیب اور کلچر کا خمیر کسی نہ کسی مذہب سے اٹھتا ہے۔ ہمارے ادب کا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس بات کو ڈھونڈنا ہے کہ ہمارے ادیبوں کے احساس و ادراک اور مزاج و شخصیت کو اسلامی تصوّرات نے کس حد تک متاثر کیا۔

عام طور پر مسلمان شاعروں نے اسلام کو تصوّف کے ذریعے پہچانا کیونکہ:

''تصوّف ایک طرزِ احساس و ادراک ہی نہیں ایک روحانی دستورِ حیات
بھی ہے اور مذہب کے مجرّد عقائد کی بہ نسبت اس کے تصوّرات میں
زیادہ ماورائیت آزادی اور ''شاعری'' پائی جاتی ہے۔'' ۲۱

تصوّف ایک روحانی تجربہ ہے جو اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہے لیکن مسلمان صوفیوں نے اسے اسلامی تعلیمات کے پس منظر میں دیکھا اور ایک خاص نقطۂ نظر سے اس کی تشریح کی جس سے ایک مخصوص ''اسلامی تصوف'' وجود میں آیا۔ یہ مسلمان صوفیاء کے ہاں ابنِ عربی کے ''وحدت الوجود'' کے عقیدے کی صورت میں سامنے آیا۔

وحدت الوجود اسلامی تصوّف کی وہ مرکزی روایت ہے جس نے کئی سال تک مسلمان شاعروں کو متاثر کیا۔ تصوّف کی یہ مرکزی روایت ان صوفیاء کی وجہ سے یہاں پر قائم رہی جو طویل عرصے تک یہاں پر وارد ہو کر محبت و اخوّت کے جذبے کو ابھارتے رہے۔ تصوّف کی یہ روایت ہمارے کلاسیکی

شعراء کے ذہنی ورثے کا اہم حصہ رہی ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں شاعری کا ایک موضوع تصوّف اور دوسرا عشق تھا۔ یہ عشق بھی ایسا عشق تھا جو تصوّف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ میرؔ بھی تصوّف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری پر اس کے واضح اثرات ہیں۔

میرؔ کی تربیّت انتہائی صوفیانہ ماحول میں ہوئی ان کی زندگی کے ابتدائی سال قلندروں اور درویشوں کی صحبت میں گزرے اسی لیے ان کے شعری مزاج کی تشکیل میں تصوّف کا عمل دخل رہا۔

؎ اس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

؎ ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا
اختلاف آیا یہ ہندو و مسلمان کے بیچ

جب کفر کی تمثیل کو شاعری میں قبول کر لیا گیا تو شاعری میں اس کے دیگر لوازمات بت خانہ، دیر، زنار، قشقہ کا بھی رواج آیا اور اس کے ساتھ ساتھ مئے خانے کی بساط بھی بچھ گئی۔

؎ میرؔ کے دین و مذہب کی اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اسلامی تصوّف میں روحانیت کی تربیّت اور اصلاح و ترقی کے ذریعے عرفانِ ذات اور قربِ الٰہی کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ معرفتِ الٰہی کا صحیح طریقہ کشف و اشراق ہے جو تزکیۂ نفس اور صفائے قلب سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر آئینۂ دل صاف ہو تو آب و گل کے اس جہان سے آگے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی خیال میرؔ کا بھی ہے:

؎ دل نے ہم کو مثالِ آئینہ
ایک عالم سے روشناس کیا

اردو کی شعری روایت میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشقِ مجازی کو بھی عشقِ حقیقی کی اصطلاحات کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عشقِ مجازی میرؔ کی شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے

اور ان کے عشق میں ان کی شخصیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

"میرؔ کے لیے عشق کوئی ایسا فروعی اور سطحی جذبہ نہیں جو دل بہلانے یا وقت گزارنے کے لیے عارضی طور پر اپنے اوپر طاری کر لیا جائے اور پھر اسے تہ کر کے رکھ دیا جائے۔ میرؔ کا عشق ان کے لیے ایک ایسا بھرپور اور ہمہ گیر تجربہ ہے جس میں میرؔ کی پوری شخصیت منہمک نظر آتی ہے اور وہ اس کا معروضی شعور بھی رکھتے ہیں۔" ؎۲۲

؎ یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

میرؔ کے ہاں غمِ عشق کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار بھی ہے۔ ان کی اپنی طبیعت کی نرمی، گداز اور دکھ بھری زندگی کے تجربات نے ان کی شاعری کو وہ لب و لہجہ اور اثر انگیزی دی جو ان کا "انداز" بن گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ:

"سلیقہ، ہنر، ادب، ڈھب اور شعورؔ، یہ وہ اسالیب ہیں جنھیں میرؔ نے زندگی اور عشق میں مٹ مٹ کے سیکھا اور ملحوظ رکھا ہے۔" ؎۲۳

میرؔ نے غمزدگی اور یاسیّت کے باوجود اثباتی عناصر کو متصوّفانہ تربیّت کی وجہ سے اپنی شخصیت کا جزو بنایا ہے۔ ان کے ہاں اس کی تربیّت کی وجہ سے تسلیم و رضا اور مقبولیت کے جو نمونے ملتے ہیں ایسے غالبؔ کے ہاں ناپید نہیں تو کم ضرور ہیں۔

غالبؔ اور میرؔ کے ہاں عشق کا بنیادی جذبہ مشترک ہے لیکن انھوں نے جو عشق سے متعلق رویّے اختیار کیے ہیں وہ مختلف ہیں لیکن اقبالؔ نے عشق کو ایسے معنی دیے ہیں جو صرف اور صرف اقبالؔ کا تصوّرِ عشق ہے اور یہ اپنے اندر قدیم تصوّف اور جدید فلسفے کے اثرات کو لیے ہوئے ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا عشق تمام اختلافات کے باوجود انسان کے بنیادی جذبے کی مشترک صفت لیے ہوئے ہے۔

میرؔ کے ہاں غمِ عشق، غمِ روزگار اور غمِ وجود کا بے پایاں احساس اور اظہار پایا جاتا ہے۔

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
سو مقدور بھر تو دوا کر چلے

میرؔ نے غمزدگی اور تسلیم و رضا کی وجہ سے درد کو قبول تو کیا ہے لیکن درد کی اس قبولیت میں بھی خوشگوار پہلوؤں کا ذکر ہے۔

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

میرؔ مئے خانے کے آدمی نہیں تھے لیکن انھوں نے خیال میں مئے خانے کی کیفیت کا خوبصورت بیان کر کے شاعرانہ کمال کا ثبوت دیا ہے۔

میرؔ کو غم سے قریب کا واسطہ رہا ہے اور وہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن اس کے باوجود:

> "میرؔ کے کلام میں غم کی افراط نے ایک قسم کی رقّت، یاسیّت اور قنوطیّت کے عناصر بھی پیدا کر دیے تھے مگر آخری تجزیے میں یہی کہا جائے گا کہ میرؔ کے مزاج کی بنیادی سلامت روی بہرحال قائم رہی۔" ۲۴

میرؔ و غالبؔ تو صوفیاء کے شیوۂ تسلیم و رضا پر کاربند تھے لیکن اقبالؔ اس کے قائل نہیں تھے اور:

> "اقبالؔ نے میرؔ و غالبؔ کی طرح کائنات میں انسان ایک مجبور و معذور اور ناتواں ہستی کے طور پر نہیں بلکہ اشرف المخلوقات کی حیثیت سے ایک ایسی ہستی کے طور پر پیش کیا ہے جو تسخیرِ کائنات کے لیے جملہ اوصاف کی حامل ہے۔" ۲۵

مصنّف نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا مطالعہ متصوّفانہ نقطۂ نظر سے کرنے کے بعد تینوں شاعروں کی عظمت کو سراہا ہے لیکن اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے غالبؔ کی تعمیر کی گئی زندگی کو ترجیح دی ہے کیونکہ

ان کے ہاں اقبالؔ کی زندگی فوق البشر کی زندگی ہے اور میرؔ کے بارے میں مصنّف کی رائے ہے کہ:

> ''اس جہانِ آب و گِل میں میرؔ کچھ ایسے مہمان کی طرح رہے
> جو کبھی کبھی خوش بھی ہو لیتا ہے مگر عام طور پر ناخوش و بیزار نظر آتا
> ہے۔ اس قسم کی ناخوشی اور بیزاری کے ساتھ جینا میرے بس کی
> بات نہیں۔'' ۳۶ے

اس کتاب میں مصنّف نے میرؔ کا مطالعہ متصوّفانہ رویّے کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ میرؔ کے ساتھ ساتھ انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ کو بھی تصوّف کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرؔ کے بارے میں ان کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ مسلمان شاعروں نے عام طور پر اسلام کو تصوّف کے ذریعے پہچانا ہے کیونکہ یہ ایک روحانی دستورِ حیات ہے اور اس میں زیادہ ماورائیت اور شاعری پائی جاتی ہے۔ اس لیے میرؔ نے بھی اپنی شاعری میں تصوّف کی روایت کو نبھایا ہے۔

میرؔ کی تربیّت چونکہ صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی اس لیے انھوں نے تصوّف کے تصوّرات اور اس کے متعلقات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اسی وجہ سے تصوّف کی وجہ سے پیدا ہونے والے تمام رویّے ان کے ہاں نظر آتے ہیں اور جہاں پر ان کی شاعری میں یاسیّت اور غمزدگی پائی جاتی ہے وہاں پر اثباتی عناصر کی بھی کمی نہیں ہے۔

''تین شاعر: میرتقی میرؔ، میر انیسؔ، ہوریس اسمتھؔ'' سیّد غلام محی الدّین قادری زورؔ کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کی مثنویوں پر بحث کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں لیکن انھوں نے تیس سے زیادہ عنوانات پر مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی مثنویاں اعلیٰ پایہ کی نہیں ہیں کیونکہ ان میں ادبیت کا فقدان ہے۔ اُردو کی بعض دیگر مثنویوں کے مقابلے میں ان کی مثنویاں کچھ ناقص سی نظر آتی ہیں۔

میرؔ گوشہ نشین شاعر تھے، ان کی مشہور بے دماغی اور خودداری نے انھیں ماحول کے کیفیات اور بیرونی کائنات کے مطالعہ سے باز رکھا لیکن گھریلو اشیاء پر وہ بڑی مہارت کے ساتھ روشنی ڈالتے

ہیں۔ اگر زمانہ، میرؔ کو خارجی کائنات کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا تو ان کی شاعری میں خارجی تصویریں اچھی سے اچھی صورت میں سامنے آتیں۔

دیگر مشرقی شعراء کے برخلاف میرؔ کی شخصیت اکثر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے لیکن ان کی زندگی کے متعلق بہت سی معلومات ان مثنویوں میں نظر آتی ہیں جن میں ان کی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقاء اور ماحول کا عکس بھی اکثر جگہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے مثنویوں کے لیے مروّج بحروں سے ہٹ کر مختلف بحریں استعمال کیں۔ ان کی مثنویاں معنوی خصوصیات کے لحاظ سے تین قسم کی ہیں:

۱۔ عشق و محبت سے متعلق

۲۔ آصف الدّولہ سے متعلق

۳۔ خانگی زندگی اور ماحول سے متعلق

پہلی دو قسم کی مثنویاں کچھ طویل ہیں اور ان میں سے اکثر میں پلاٹ پایا جاتا ہے جبکہ تیسری قسم کی مثنویوں میں پلاٹ نہیں لیکن ان کے ذاتی حالات اور خیالات سے متعلق ہونے کی وجہ سے دلچسپ ہیں۔

میرؔ کی دردمند طبیعت کی فطری افتاد کے علاوہ اس امر میں ان کے ماحول کا بھی اثر تھا جو انھوں نے عشق کی کیفیات کو دل کھول کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان کے متعلق مصنّف لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کا نمایاں اور قابلِ ذکر عنصر ان کیفیات کے مرقعے ہیں جو عشق سے متاثر ہونے کے بعد عاشق مزاج پر طاری ہوتے ہیں۔'' ۲۷

ان کے عشقیہ مرقعے اکثر ذاتی تجربات پر مبنی ہیں جو ان کے دلی جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو جیتی جاگتی تصویر کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں بلکہ جگہ جگہ ان خیالات اور واقعات کو بھی منکشف کرتے ہیں جو ان کے یا کسی اور کے خراب و آشفتہ حال ہونے کے بعد سرزد ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کی مثنویاں جو نواب اودھ سے متعلق ہیں، تعداد میں چھے ہیں۔ ان میں سے تین

''صیدنامے'' ہیں جن میں انھوں نے شکار کے تفصیل کے ساتھ مرقعے پیش کیے ہیں۔ بقول مصنف:

> ''گو معاملاتِ خارجی کے لحاظ سے میرؔ کا درجہ اردو کے بعض شاعروں سے کم تر ہے تاہم ان تینوں مثنویوں میں انھوں نے شکار کے جس قدر تفصیل وار مرقعے پیش کیے ہیں وہ ضرور قابلِ ذکر ہیں۔'' ۲۸

تیسری قسم کی مثنویاں دو طرح کی ہیں:

۱۔ پر بیتی

۲۔ آپ بیتی

پر بیتی مثنویاں ہمیں ان کے ماحول کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کرتی ہیں اور آپ بیتی والی مثنویاں ان کے نجی حالات کو ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ یہ پر بیتی اور آپ بیتی مثنویاں اپنے زمانے اور میرؔ کی ذات کے متعلق اتنی معلومات فراہم کرتی ہیں کہ ان کے ماحول اور ذات کا مکمل نقشہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

نیچر یا فطرت دو قسم کی ہوتی ہے:

۱۔ اس نظر آنے والی دنیا پر مشتمل

۲۔ دل کی مخصوص خانگی دنیا سے وابستہ

میرؔ کی فطرت دوسری قسم کی تھی لیکن کائناتی فطرت کی انھوں نے جو تصویریں کھینچی ہیں وہ بھی پاکیزہ اور دلچسپ ہیں۔ ان کی جو مثنویاں خارجی فطرت کے حوالے سے ہیں وہ بھی اس حد تک مکمل ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ خارجی فطرت کے اظہار میں بھی قادرالکلام تھے۔ ایسی مثنویوں میں ان کی سراپا نگاری خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کیونکہ اردو شاعری میں اچھے سے اچھے سراپا کثرت سے ہونے کے باوجود یہ اودھ کے اوّلین سراپاؤں میں داخل ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی مثنویوں کو دیکھا جائے تو:

> ''میرؔ کی تمام مثنویاں اُن کی عمر کے کسی مخصوص زمانے کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی طفولیت سے لے کر بڑھاپے تک کی

ساری زندگی پر حاوی ہیں اور ان میں ایک تــحیّــر خیــز

یکسانیت نمایاں ہے۔" ۲۹

میؔر کی شاعری کو حقیقی طور پر سمجھنے اور ان کی مثنویوں سے اچھی طرح متکیف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم میؔر کو متموّل اور متکبّر انسان نہ سمجھیں بلکہ خوددار اور مستغنی مزاج شریف آدمی سمجھیں جو کسی اُجاڑ محلے کے ٹوٹے پھوٹے مکان میں دردآشنا زندگی کے طویل ایام گزار رہا ہے۔

"Three Mughal Poets"، Ralph Russell اور Khurshid-ul-Islam کی کاوش ہے جس میں میؔر کا ذکر تین ابواب پر مشتمل ہے۔ "The Love Poetry of Mir" میں مثنویوں پر بحث کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں:

> "Mir's love masnavis are all of this second kind.Perhaps the best of them is 'Muamlat - i - Ishq' (The Stages of Love), in which he tells the tragic story of his own love affair with a frankness that he caused most critics to pass over the poem in discreet silence." ۳۰

''معاملاتِ عشق'' میں جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس لڑکی کے ساتھ تھی جس کے متعلق میؔر نے لوگوں سے باتیں سنیں۔ بعد میں وہ اس لڑکی سے خود ملے اور انھوں نے اسے بہت ہی اچھا پایا۔ اسی طرح کے ایک اور عشق نے انھیں پاگل بنا دیا جس کا بیان ان کی مثنوی ''خواب و خیال'' میں ہے۔

''دریائے عشق'' میں میؔر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں ایک خوب صورت لڑکا گلی میں سے گزرتی ہوئی لڑکی کو دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ محبت میں گھر جاتے ہیں بعد میں ان کی محبت میں مشکلات کا ذکر ہے۔ میؔر کی عشقیہ شاعری صرف مثنویوں کی صورت میں ہی نہیں بلکہ اس کا اظہار ان کی غزلوں میں بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ غزل پر اپنی نوعیت کے لحاظ سے پابندیوں کی وجہ سے عشقیہ جذبات کے صرف اشارے ملتے ہیں جب کہ ان کی تفصیل مثنویات میں ہے، کیونکہ غزل کی نسبت مثنوی کے دامن میں واقعات کے بیان کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے، جب کہ غزل میں صرف اشارے سے محبوب کی زلفوں کو

رات اور چہرے کو صبح کہہ کر بات آگے بڑھائی گئی ہے۔ انھوں نے عشقیہ جذبات کا اظہار مثنویوں اور غزلوں میں کئی انداز سے کیا ہے، کبھی وہ جذبات کا اظہار عاشق کی زبانی اور کبھی معشوق کی زبانی کرتے ہیں۔ ان عشقیہ جذبات کے اظہار میں شوخی کا پہلو بھی صاف نظر آتا ہے، یہ چھیڑ چھاڑ کا انداز انھیں عام شعراء سے بلند درجہ عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں محبت تمام مشکلات پر فتح حاصل کر لیتی ہے۔

"Lines like these depict a stage where love has at length triumphed over every difficulty. But such lines are comparatively rare in ghazal poetry, for, unlike the masnavi, the ghazal is, in the main, the poetry of unrequited love." ۳۱

میرؔ نے ان کیفیات کا اظہار اپنی شاعری میں بڑے پرسوز انداز میں کیا ہے جو محبوب کی بے التفاتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں محبوب کی بے التفاتی کو بھی ایک سہارا سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب سے شکووں کے باوجود ایک عاجزی کا اظہار ہے۔ اس شاعری میں جہاں پر عشق کا اظہار اور اس میں مشکلات برداشت کرنے کا عزم ہے وہاں پر ناصح کا کردار بھی ہے جو انھیں ان مشکلات سے دُور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، کیونکہ:

"The man who has not loved appears in the ghazal in the stock character of the nasih or counsellor." ۳۲

میرؔ اپنی عشقیہ شاعری میں ناصح کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ وہ عشقیہ شاعری کو بھی ابتذال کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں پائے جاتے ہیں۔ عاشق ان کی شاعری میں ایک اونچے درجے پر فائز ہے جو دنیا کے تمام مصائب برداشت کرتا ہے۔ اس کے اندر محبوب سے ملنے کی شدید خواہش ہے اور جب اسے محبوب مل جاتا ہے تو پھر یہ عاشق اس پر دین و دنیا قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جبکہ 'شیخ' حسنِ بتاں کا منکر اس لیے ہے کہ اس کی آنکھوں میں وہ نور ہی نہیں جو محبوب کے حسن کو دیکھ لے۔ یہ شیخ صرف اور صرف حقیقی عشق کے پیچھے پڑا ہوا ہے جب کہ عاشق مجازی عشق بھی کرتا ہے اور اس کے ذریعے حقیقی عشق بھی کرنا جانتا ہے۔ ان

کے ہاں صوفی اور شیخ کے متعلق یہ رائے ہے کہ:

"Between him (Shaikh) and the mystic, therefore, it is war to the end, and because the world and all its powers are on the Shaikh's side, the prospect for the mystic is life long persecution and, in the end martyrdom." ۳۳

میرؔ کے ہاں صوفی سچی محبت کرنے والا ہے جب کہ شیخ کے ہاں صرف اور صرف دکھاوا ہے۔

میرؔ نے استعاراتی انداز میں اپنے تجربات کو شاعری میں سمویا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں معاشی اور معاشرتی احساس بھی جھلکتا ہے۔

"Mir: The Man and His Age" میں میرؔ کے زمانے کے حالات کا اثر ان کی شاعری پر واضح کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں ذاتی، سیاسی اور سماجی حالات سے پیدا ہونے والے غموں کا ذکر ہے۔ وہ غم کو شاعری کے لیے لازمی خیال کرتے تھے، کیونکہ:

"Mir knew that the "Pain and grief" of love, in all its senses, was the essential material of poetry, and that mere technical excellence could do nothing without it." ۳۴

میرؔ کی شاعری میں عملی زندگی کی ایک واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھیں بچپن ہی سے مصائب نے گھیر لیا تھا۔ اس کے بعد جوانی میں بھی مصائب نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان واقعات کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوا، کیونکہ ان کی طبیعت بڑی حساس تھی۔ ان کے زمانے میں اپنی عزت بچانا بہت مشکل تھا اور انھیں غم و آلام کی وجہ سے ان کے ہاں بے دماغی کا عنصر داخل ہوا جو بددماغی تک پہنچ گیا۔ آخری عمر میں خراب حالات کی وجہ سے انھیں پہلے زمانے کے لوگ اور اقدار یاد آتے رہے:

"The days of its greatest glory were past, but even now it seemed to him to preserve, more than any other place, the best values of Mughal India." ۳۵

اگر ان کی شاعری کو غور سے پڑھا جائے تو نہ صرف ان کے ذاتی حالات ہمارے سامنے آتے

ہیں بلکہ اس زمانے کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی واضح صورت بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ انگریزی میں میرؔ کا اس طرح کا تعارف موجود نہیں تھا۔Ralph Russell اور Khurshid-ul-Islam پر سماجی تنقید کا گہرا اثر ہے، اسی لیے انھوں نے میرؔ کی زندگی پر اثرانداز ہونے والے سماجی عوامل پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ اگرچہ میرؔ کو عام طور پر غزل کے حوالے سے سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کتاب پر اُن کی مثنویوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے جہاں پر اُن کی مثنویوں کی خوبیوں کو واضح کیا گیا ہے وہاں پر ان مثنویوں کے حوالے سے ان کی ذات اور سماج تک رسائی کی کامیاب کوشش بھی کی گئی ہے۔

"Urdu Literature"، D.J. Mathews، C. Shakle اور Shahrukh Hussain کی مشترکہ کاوش ہے جس میں مصنفین لکھتے ہیں کہ میرؔ اُردو شاعری کا چوتھا ستون ہیں جن کی شاعری میں آرزوؔ نے حوصلہ افزائی کی۔ ان کے خیال میں وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں دردیہ شاعری کے فن کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ اُردو شاعری میں شاعروں نے محبت کے تجربات اور غم کی کیفیات کو محض رسمی طور پر بیان کیا ہے لیکن میرؔ کے ہاں اس قسم کی کیفیت نہیں پائی جاتی بلکہ انھوں نے جن کیفیات کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

> "As even now, for most poets, the expression of love's pain and grief was merely the observance of a formal convention and one could write about love and wine without experiencing either. In Mir's case, however, there is very reason to believe that his suffering was real." ۳۲

میرؔ نے اپنی شاعری میں حسّاس جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اگرچہ انھوں نے بہت زیادہ شاعری کی ہے لیکن انتخاب کرنے والوں نے ان کے بہتر نشتروں میں سے بہت سی خوبیوں کو تلاش کیا ہے۔ مصنفین میرؔ کے ہاں محبت اور خمریات کے متعلق تمام تر جذبات کو حقیقت پر مبنی قرار دیا ہے جب کہ دیگر شعراء کے ہاں ایسی باتیں صرف اظہار کا درجہ رکھتی ہیں۔

Ralph Russell ،"The Pursuit of Urdu Literature" کی کتاب ہے جس میں مصنف نے بڑی جامعیت کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ بیان کی ہے۔ میؔر کا ذکر انھوں نے "Mir-The Poet and the Man" کے زیرِعنوان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے خیال کے مطابق میؔر اردو ادب کے سب سے بڑے ''محبّت کے شاعر'' ہیں۔ عام طور پر اردو کے شعراء نے محبت کے تجربات کو روایت کے طور پر بیان کیا ہے لیکن میؔر ایسے شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وہ خود ان تجربات سے گزرے ہیں اور:

"He was speaking of his own experiences." ۳۷

میؔر کی آپ بیتی ''ذکرِ میؔر'' اور ان کی مثنویاں عشق کے معاملات کی جو تصویریں ہمارے سامنے لاتی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان تجربات سے گزرے تھے اور ان کیفیّات کو جب وہ غزل میں بیان کرتے ہیں تو ان تجربات کے حوالے سے ان کے حال کا رنگ غالب ہوتا ہے کیونکہ:

"When Mir speaks in his ghazals of deep, passionate love for a woman he speaks of what he has himself experienced." ۳۸

مصنف کے خیال کے مطابق میؔر ۱۷۲۲ء یا ۱۷۲۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں وہ آگرہ سے دلّی گئے۔ اسی زمانے میں نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلّی کو تباہ و برباد کر دیا۔ میؔر ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ چلے گئے جہاں پر انھوں نے ۷۷ یا ۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

میؔر نے اپنے زمانے میں دلّی کو اپنی آنکھوں سے لٹتے دیکھا جہاں پر زندگی کی ہر قدر پامال ہو رہی تھی۔

؎ عہد ہمارا تیرا ہے یہ جس میں گم ہے مہر و وفا
اگلے زمانے میں تو یہی لوگوں کی رسم و عادت تھی

مصنف کے خیال کے مطابق میؔر کے ہاں پاگل پن اور شراب محض ایک علامت ہیں اور ان کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بقول مصنف:

"Just as madness is a symbol, so, I think, are wine, and revelry, and the idolatary of beauty.

There is no evidence that Mir, so far as the externals of daily life were concerned, was in any marked way distinguishable from the average Muslim of his day; and in his poetry, wine and music and revelry, which banish the inhibitions of worldly, wisdom and release the generous impulses in man's nature are, I think, simply the symbols of those impulses." ۳۹؎

میرؔ کی زندگی کے آخری سالوں میں انا کا جذبہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا اور انھوں نے شاہانِ وقت کے ناروا رویّے کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ میرؔ نے جو شاعری کی ہے وہ ان کے گہرے احساسات کی حامل شاعری ہے۔

"Mir's life, then, testifies to the fact his poetry is not 'just poetry' but the eloquent, sincere expression of his deepest feelings." ۴۰؎

میرؔ اپنی غزلوں میں جب اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں تو وہ تمام تر احساسات کو اس میں شامل کر دیتے ہیں اور ان کے ہاں تمام جذبوں کا اظہار ''حالیہ'' رنگ کا حامل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ محبّت کس جذبے کے ساتھ کی جاتی ہے اور اس میں پیش آنے والے مصائب کا سامنا کتنی ہمت سے کرنا ہوتا ہے۔

''میرؔ و سوداؔ کا دور'' ثناء الحق حقی کی کتاب ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میرؔ و سوداؔ کے دور سے پہلے شاعری:

۱۔ الفاظ کا گورکھ دھندہ تھی۔

۲۔ تذکیر و تانیث کے واضح اصول نہیں تھے۔

۳۔ قافیہ اور ردیف کے استعمال میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

لیکن اس دور میں شاعری کو حشو و زوائد سے پاک کر کے مروّجہ تشبیہات و استعارات کے استعمال میں نکھار پیدا کیا گیا اور میرؔ اس دور کے نمائندہ شعراء میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں سیادت کے حوالے سے شکوک و شبہات پیدا کرنے والے بیانات کو انھوں نے ردّ کرتے ہوئے انھیں سیّد قرار دیا

ہے۔ والد کی وفات کے بعد ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اپنوں کی بے رخی تو اپنی جگہ وہ پورے زمانے کی المیہ زندگی کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں ایک لڑکی سے عشق ہو گیا، جب یہ عشق ناکام ہوا تو ان کی ساری زندگی تاریکی میں ڈوب گئی۔ بددماغی کا عنصر ان کے ہاں حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے پیدا ہوا جس کا اظہار ان سے دلّی اور لکھنؤ میں ہوتا رہا۔ دکھوں، غموں اور بدمزاجیوں کے باوجود وہ ایک عظیم شاعر تھے۔ اسی لیے:

''میرؔ کی شاعرانہ عظمت کے سب لوگ قائل ہیں اور بڑے بڑے صاحبِ ذوق اور اہلِ قلم حضرات، شعراء اور نثّار نے نظم اور نثر دونوں میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔'' [۴۱]

میرؔ نے اپنی شاعری کے لیے جو زبان استعمال کی وہ اپنے اندر سادگی رکھتی ہے۔ اس سادگی کی تعریف ان کے ہر نقاد نے کی ہے کیونکہ یہ وہ سادگی نہیں جو اُکتا کر رکھ دیتی ہے بلکہ اس سادگی کے باوجود:

''میرؔ کی زبان صاف، شستہ، بامحاورہ اور عام فہم ہے۔ وہ الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لفظوں کے لیے نہایت تجسس و تفحص سے کام لیتے ہیں اور ان کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔'' [۴۲]

میرؔ کے موضوعات عموماً عاشقانہ اور غم و الم سے مملو ہوتے ہیں اور ان کے کلام کا اہم وصف غم انگیزی اور المناکی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری اپنے اندر ایک خاص قسم کا نشاطیہ انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ تفصیل سے زیادہ ایمائیت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا پیرایۂ بیان بڑا سیدھا سادہ ہے۔

اسے ڈھونڈتے میرؔ کھوئے گئے ؎
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

اُن کی تشبیہات دور از کار نہیں لیکن ان کے اشعار میں ایسی ندرت ہے جو تاثیر کو بڑھا دیتی ہے۔ انھیں جہاں پر شدتِ جذبات کو پیش کرنا ہوتا ہے، وہاں پر بحروں کو چھوٹا کر دیتے ہیں اور ان کا انداز عموماً بیانیہ یا خطابیہ ہوتا ہے۔

معاصرین اور ماحول کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی
ہیں جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھیں۔'' ۵۰

''شعرائے اُردو کے تذکرے، نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک'' حنیف نقوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے ''نکات الشعراء'' کے متداول نسخوں میں شعراء کی تعداد سے اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ اس امکان کو بھی ردّ نہیں کیا کہ اس متداول نسخے کے علاوہ بھی ''نکات الشعراء'' کا کوئی نسخہ موجود تھا جس میں شاعروں کی تعداد متداول نسخے میں شامل شعراء سے زیادہ اور ولی کے بارے میں میر کی یہ رائے کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور شاعر ہیں، موجود تھی۔ کیونکہ:

''بعض قرائن و شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرے کا
ایسا کوئی نسخہ ضرور موجود تھا جس میں شاعروں کی تعداد متداول
نسخے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ تھی۔۔۔۔ ولی سے متعلق میر سے
منسوب یہ مشہور قول بھی کہ ''وے شاعریست از شیطان مشہورتر''
متداول نسخوں میں شامل نہیں، حالانکہ میر سے اس کے انتساب
پر شبہے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔'' ۵۱

تذکرے کا آغاز شمالی ہند کے شاعروں سے ہوتا ہے۔ چند شعراء کے حالات کی تفصیل سے محض اس بنا پر صرفِ نظر کیا گیا ہے کہ دوسرے تذکرہ نگار اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں جو کہ تذکرہ نگاری کی قدیم روایات کے خلاف ہے۔ انھوں نے حالاتِ زندگی لکھتے وقت بقدرِ ضرورت توجہ نہیں دی۔ کئی جگہوں پر وہ سہل پسندی اور سطحیت کے مرتکب بھی ہوئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ''نکات الشعراء'' کی شہرت اور مقبولیت کا راز دراصل سیرت و شخصیت کے ان مرقعوں میں ہے جو تذکرے کے اوراق پر جابجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اس تذکرے میں میر نے شعراء کے ساتھ اختلافات کے باوجود ان کی تعریف بھی کی ہے جو ان کے بلند کردار کی عکاس ہے۔ انھوں نے جب بھی شعراء کی تعریف کی ہے خوش خلقی و خوش مزاجی، زندہ دلی، یار باشی اور شرافت و سادگی کے پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ یہ تمام اوصاف میر کی اپنی ذات میں بھی موجود تھے۔ محض چند واقعات کی بنیاد پر یہ قیاس کر لینا کہ میر اپنی فطرت کے لحاظ سے

حد درجہ کم آمیز، مردم بیزار، تنگ مزاج اور بد دماغ قسم کے انسان تھے، صریح ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ بعض لوگوں کے ساتھ جذبات سے مغلوب ہو کر انھوں نے زیادتیاں بھی کی ہیں۔ یہ زیادتیاں اس حد تک بھی ہیں کہ جہاں انصاف اور دیانت داری کی تمام قدریں پامال ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس قسم کی مخاصمانہ رائے کو کسی طرح بھی معقول اور سنجیدہ تنقید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ انھوں نے کلام کے معائب و محاسن کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ان کی آراء بالعموم نہایت جامع اور متوازن ہیں۔ یہ آراء آزادیٔ مطلق کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض لسانی و فنی ضابطوں اور چند بنیادی اصولوں کی پابندی کی گئی ہے کیونکہ:

> ''میرؔ صاحب فارسی کی مانوس و شگفتہ تراکیب، صنعتوں کے بے تکلف استعمال، صفائیِ بیان و شستگیٔ بندش اور فصاحت و بلاغت کے اصول و آداب کی پاس داری کو لوازماتِ شاعری تصور کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری کے لیے ذوقِ سلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک اکتسابی فن نہیں، ایک فطری ملکہ اور وہبی عطیہ ہے۔'' ۵۲

وہ شاعری کو محض گل و بلبل کی داستان سرائی تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کے خیال کے مطابق زبان برگِ گل کی طرح پاکیزہ و رنگین ہونی چاہیے۔ بلندیٔ فکر اور شعر کی اثر آفرینی و تہ داری کے علاوہ نو بہ نو خیالات اور تازہ مضامین و معانی کی تلاش ان کے ہاں بڑی اہمیّت کی حامل ہے۔ صحتِ الفاظ وصحتِ محاورات کا خیال رکھنا اور حتی الامکان غلط العوام کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان کے ہاں مثل میں تصرّف جائز نہیں۔ میرؔ کا خیال یہ بھی ہے کہ متوارد اشعار دراصل سرقے ہی کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ ان معیاروں کی روشنی میں ہم کلامِ میرؔ کی تفہیم بھی بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔

''نکات الشعراء'' میں میرؔ نے شاعروں کے کلام میں جہاں پر مناسب سمجھا ہے، اصلاح طلب اشعار میں ضروری ترمیم و تغیّر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار استادانہ انداز میں نہیں بلکہ ذاتی پسند اور دوستانہ مشورے کے طور پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''نکات الشعراء'' سے ہمیں اس زمانے کی تہذیب و معاشرت، اہلِ قلم کے باہمی روابط اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

''نقوش و افکار'' مجنوں گورکھ پوری کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت اور معاشرے کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میرؔ کا زمانہ انتشار کا زمانہ تھا۔ اس دور کے ہر شاعر کے ہاں زمانے کی شکایت اور زندگی سے بیزاری کی علامتیں موجود ہیں لیکن:

> ''میرؔ کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے زمانے کے سارے کرب و اضطراب کو ظاہر کر رہی ہے۔'' ۵۳

میرؔ کے ہاں تصوّف و معرفت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ ایسی غزلیں اور ایسے اشعار ان کے شعورِ شعری کا حصہ نہیں بلکہ مروّجہ مفروضات اور روایات کا حصہ ہیں۔ وہ یاس پرست نہیں تھے کیونکہ ان کے لہجے میں بغاوت کا مہذّب اور پرتمکنت احساس ملتا ہے۔ عظیم شاعر اپنی شاعری کو پروپیگنڈہ نہیں بننے دیتا، اس لیے انھوں نے ایسا ہی کیا ہے، وہ غزل گو شاعر تھے۔ غزل گو عشق و محبت کی زبان میں بات کرتا ہے جس میں ایک سنجیدہ نرمی ہوتی ہے۔ میرؔ کو زمانے سے جو شکایت تھی اس کا روپ اتنا بدلا ہوا ہے کہ ایک نکتہ رس قاری ہی اس میں ایک مستقل فکری جھکاؤ اور جذباتی میلان محسوس کر سکتا ہے۔ ان کی شاعری کو غور سے پڑھا جائے تو اس کے اندر ایک زمانے کی فریاد کا احساس ہوتا ہے جو چیخ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ ان کی شاعری میں تڑپنا اور تلملانا نہیں ہے وہ خودداری اور سنجیدگی کے ساتھ بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کو مجہولیت کی تعلیم کہنا درست نہیں، کیونکہ انھوں نے خارجی اور شخصی آلام کا مقابلہ ایک برتری کے ساتھ کیا۔

میرؔ کے زمانے میں زندگی کی کوئی آرزو پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کو سدھارنے کی کوششیں خارجی قوتیں ایک دھکے میں مغلوب کر لیتی تھیں۔ شکست پر شکست کھانے کے باوجود انھوں نے اپنی گردن سیدھی اور سر کو بلند رکھا۔ چونکہ اس زمانے میں غم تھا اس لیے غم دوستی اور یاس پرستی ہر چھوٹے بڑے شاعر کے خمیر میں شامل تھی اور یہ غم ان کے زمانے کا مزاج تھا۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو:

> ''میرؔ غم کے شاعر ہیں۔ میرؔ کا زمانہ غم کا زمانہ تھا اور اگر وہ غم کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانے کے ساتھ دغا کرتے اور ہمارے لیے بھی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔'' ۵۴

انھوں نے غم کو مقدر کی طرح تسلیم کیا اور اس کو ایک نئی قوت میں تبدیل کر دیا۔ وہ غمِ عشق اور غمِ زندگی کو مقابلہ کرنے کے تازہ دم حوصلے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

غالبؔ کا کلام سمجھنا مشکل کام ہے لیکن میرؔ کے بہترین اشعار کی روح تک پہنچنا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ وہ تمام بڑے ادیبوں اور مفکّروں کی طرح اپنے زمانے کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری ان تمام مختلف بے چینیوں کی ایک مہذّب عکاسی ہے جو ان کے دور کی اصل روح تھی۔ یہ شاعری ہمیں اپنے دور کے مظالم اور تشدّد کے آگے سر نہ جھکانے کا درس دیتی ہے لیکن اس سے زبردست اثر اس شاعری کا یہ ہوتا ہے کہ جو مناسب اور زمانے کے اعتبار سے ممکن ہو کرو مگر اپنے اندر چھچھورا پن، سطحیّت اور فرومایگی نہ آنے دو بلکہ سنجیدگی، توازن، شائستگی اور سلیقہ قائم رکھو۔

''اصنافِ ادب'' ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی کی کتاب ہے جس میں فنِ شاعری کی اصطلاحات پر بحث کی گئی ہے۔ غزل کی زبان کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ بالعموم سادہ، سلیس اور شستہ ہوتی ہے۔ اس جگہ پر میرؔ کا جو شعر درج کیا گیا ہے اس میں غزل کی زبان کی یہ خصوصیات موجود ہیں۔

؎ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس کے ساتھ سوداؔ کا یہ شعر درج ہے جو میرؔ کے شعر کے مضمون میں ہے:

؎ سوداؔ کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مصنف ان دونوں اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں اشعار کا مفہوم ایک ہے مگر الفاظ اور لب و لہجے میں فرق ہے۔ اوّل الذّکر شعر دھیمے پن، نرم روی اور سادگی کا احساس دلاتا ہے جب کہ دوسرے شعر میں ایک طرح کا کھردرا پن، طنطنہ اور شکوہ موجود ہے، چنانچہ پہلا شعر غزل کے مزاج سے

مطابقت رکھتا ہے جب کہ دوسرا شعر قصیدے کی آرائشی زبان اور
پر رعب لہجے کا آئینہ دار ہے۔'' ۵۵

مصنف نے میر کی زبان کو غزل کی زبان قرار دیا ہے اور اس طرح وہ ان کی غزل میں برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

''تنقیدی تجربے'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے ''میر کا فنی شعور'' کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ وہ فنِ شعر کا گہرا شعور رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ان کی شاعری کی جو عظمت اور بلندی ہے وہ اسی گہرے فنی شعور کی وجہ سے ہے۔

''نکات الشعراء'' میں انھوں نے فن سے متعلق جو باتیں کی ہیں ان کا اظہار ان کے اشعار میں بھی ہوا ہے۔ ان کے فنی شعور میں خلوص، صداقت، حقیقت اور واقعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی زندگی غم سے عبارت ہے اس لیے وہ اسی کے اظہار کو شاعری سمجھتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بھی ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں فن میں دردمندی کا عنصر ہونا لازمی ہے۔

ے پھرتا ہے کیا تو میر گلستاں میں غم زدہ
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

خلوص شعر کی بنیادی شرط ہے جو شاعر کے دل میں آتا ہے، وہی کہتا ہے۔ اس لیے میر کے نزدیک زبان دل کی ترجمان ہے:

ے جو دل میں آتا ہے کہنے میں بھی وہ
زباں میرے دل کی مگر ترجماں ہے

ان کے ہاں خونِ جگر کے بغیر شعر میں زندگی پیدا نہیں ہوتی:

ے غزل میر یاں کوئی موزوں کرو
تامل کرو ، دل جگر خوں کرو

اسی لیے ان کے ہاں شعر کی تخلیق کوئی اضطراری فعل نہیں ہے۔ احساس کی شدت اور

جذبے کا خلوص ہی اس کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ یہ چیزیں محنت اور کاوش کا تقاضا بھی کرتی ہیں۔ یہ چیزیں شعر کے لیے ضروری تو ہیں لیکن حرفِ آخر نہیں، کیونکہ بغیر بلند فکر کے شعر میں گہرائی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوسکتی، اس لیے میرؔ کے بقول:

بات بنانا مشکل سا ہے، شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

ان کے ہاں فکرِ بلند، احساس، جذبے اور شعور تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔ صناعی سے فن میں نئی زندگی کے آثار رونما ہو سکتے ہیں لیکن اس صناعی میں طرفگی کا ہونا ضروری ہے۔ صناعی کا مفہوم ان کے ہاں محدود نہیں بلکہ وہ صوری حسن کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، صوری خوبیاں اسلوب سے ہیں جو ایک طرزِ اظہار اور حسنِ ادا کا نام ہے، اسلوب میں زبان، بیان، الفاظ، آہنگ، ترنم، نغمگی اور اسی طرح کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ اسلوب اور طرزِ کلام، میرؔ کے خیال میں اپنی انتہائی بلندیوں کو اس وقت چھوتا ہے جب اس میں ستھرا پن، نکھری اور سنوری ہوئی کیفیت اور ایک رچا ہوا انداز پیدا ہو جائے۔ جدّت بھی اُن کے ہاں فن کا لازمی جزو ہے۔ ان کا فنی شعور تقلید اور نقالی کو گوارا نہیں کرتا۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

بقول مصنّف:

''میرؔ نے اسالیب کی باریکیوں کو سمجھا ہے۔ اسی لیے جدت اور اپج کی اہمیت انھوں نے محسوس کی ہے اور وہ خود اس کو برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' ۵۶

جدّت کے ساتھ ان کے ہاں روایت کی صحیح پاسداری پائی جاتی ہے۔

میرؔ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں، اسی لیے دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل کے مقتضیات کا ان کے پاس گہرا شعور ہے۔ انھوں نے رمزیت، ایمائیت، اشاروں، کنایوں، پیچ داری، تہ داری ربط اور توازن کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ اس کے باوجود غزل ان کے ہاں الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں

بنتی۔ یہ شاعری عمومیّت کی حامل ہے جس میں گہرائی اور گیرائی ہے۔

؎ سہل ہے میؔر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

انھوں نے جس گہرے فنّی شعور کا اظہار کیا ہے اس کو اپنے کلام میں برتا بھی ہے، کیونکہ:

''اگر میؔر کے پاس گہرا فنّی شعور نہ ہوتا تو ان کے فن میں یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ اس گہرے فنّی شعور نے میؔر کو صحیح معنوں میں میؔر بنایا ہے۔'' ۵۷

میؔر نے فنِ شعر پر صرف نظری مباحث ہی نہیں کیے بلکہ انھیں عملی طور پر اپنے شعروں میں استعمال بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری کی عظمت کا اصل راز ان کے اسی فنِ شعر کے گہرے شعور میں مضمر ہے اور اسی چیز نے انھیں میؔر بنایا ہے۔

''شاعری اور شاعری کی تنقید'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ہے جس میں ''میؔر کا تغزل'' کے زیرِعنوان وہ بیان کرتے ہیں کہ میؔر نے شاعری کو درد اور درد کو شاعری بنا دیا۔ اسی لیے ان کے دیوان میں قیامت کا سا ہنگامہ ہے۔ کسی جگہ اگر وہ نشاط و شادمانی کی باتیں بھی کرتے ہیں تو ان کی تہ میں رنج والم ہوتا ہے، کیونکہ:

''میؔر سرتاپا درد وغم اور رنج والم ہیں اور اُن کی شاعری بھی شروع سے آخر تک اسی درد وغم اور رنج والم کی تصویر ہے۔'' ۵۸

یہ شاعری اُداس ضرور کرتی ہے لیکن اس میں گھٹن ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ شاعری محدود ہے لیکن اس میں حیات و کائنات کی وسعتیں ہیں۔ یہ شاعری صرف جذبات کی تہذیب ہی نہیں کرتی بلکہ بنیادی انسانی قدروں کا احساس بھی دلاتی ہے۔ میؔر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، کیونکہ وہ غزل کی صنف کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے تھے، جن باتوں کا تقاضا غزل کرتی ہے، وہ باتیں ان کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ اپنی شاعری میں بظاہر دنیا سے دُور اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا

نہیں ہے۔ وہ دنیا اور زندگی کے بہت قریب ہیں اسی لیے وہ کبھی تنہا نہیں دیکھے جاتے۔ ان کے ساتھ ایک دنیا ہوتی ہے اور ان کی خلوت میں بھی ایک انجمن کا احساس ہوتا ہے۔

ان کے ہاں احساسِ حسن کی شدّت تو ہے لیکن اس کا تصوّر ہمیشہ ایک احساسِ محرومی کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ انھوں نے اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو محسوس تو کیا ہے لیکن اس احساس میں ہمیشہ ایک حسرت سی رہی ہے۔ ان کا حسن محض ایک فرد یا ایک ذات میں محدود ہے جو اُن کا محبوب ہے اور اسی محبوب کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کو وہ حُسن کا نام دیتے ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں محبوب نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس کی فعالی حیثیت مسلّم ہے۔ ان کے ہاں جو کچھ بھی ہے اس میں کسی نہ کسی طرح محبوب کا ہاتھ ضرور نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں محبوب کی تصویر بڑی حسین اور دلآویز ہے۔ وہ اپنے محبوب کو بلا کا حسین بنا کر پیش کرتے ہیں، کیونکہ:

> ''میرؔ اپنے محبوب کے پرستار ہیں۔ یہی ان کا عشق ہے۔ ان کا
> ایک لحہ بھی اس پرستش کے خیال سے خالی نہیں رہا۔'' ۵۹

ان کے ہاں محبوب کے حوالے سے کیفیّات و واردات میں انفعالیّت کی فضا ملتی ہے لیکن وہ کسی جگہ بھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ ایک سچے عاشق ہیں، اسی وجہ سے ان کی ذات عشق میں اور عشق ان کی ذات میں مدغم ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں عشق کا ایک واضح اور مکمل تصوّر پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں عشق کا ماورائی اور مابعدالطبیعاتی تصوّر نہیں ہے بلکہ اس میں ایک نظامِ معاشرت، نظامِ اخلاق اور نظامِ تہذیب کی جھلک موجود ہے۔ ان کا عاشق تمام تر دنیاوی مشکلات کے باوجود اپنے اندر جینے کا سلیقہ پیدا کرتا ہے۔ ان کے تصوّرِ عشق کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ناکامی، جس کے نتیجے میں رنج وغم پیدا ہوتا ہے

۲۔ ترفّع، جو ایثار، تقدّس اور پاکیزگی سے پیدا ہوتا ہے

میرؔ پر تصوّف کے اثرات ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں جگہ جگہ پر عشق کا حقیقی تصوّر بھی پیش کیا گیا ہے لیکن ان کا مجموعی میلان دنیاوی عشق کی طرف ہے اور:

> ''میرؔ کے عشق میں نری جذباتیت نہیں ہے۔ اس میں زندگی کا

گہرا شعور ہے اور اس شعور کی نوعیت، سماجی، تہذیبی، اقتصادی
اور معاشی ہے۔" ۶۰

ان کے ہاں تغزّل کے ساتھ ساتھ فکر کا پہلو بھی پایا جاتا ہے جس کا منبع تصوّف ہے۔ ان کو تصوّف کا ماحول ملا اور تصوّف کو انھوں نے محض رسمی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس سے اپنی تہذیب کی ہے۔ وہ طبعاً جذباتی ہیں، اس لیے فلسفیانہ خیالات ان کے یہاں انفرادی کیفیت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ وہ تصوّف کے فلسفی نہیں ہیں۔ انھوں نے تصوّف کو فکر کی بنیاد ضرور بنایا ہے لیکن اس کے اصول و نظریات بیان نہیں کیے۔ انھوں نے اگرچہ معاملات و مسائل اور افکار و خیالات نئے پیش نہیں کیے لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے ان کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے حقیقتوں کا روپ دیا ہے۔ میؔر کے تغزّل اور تفکّر دونوں میں غضب کی دل کشی اور بلا کی دل آویزی ہے۔ ان کی غزلوں میں تجربے اور روایت کی ہم آہنگی نے فن کی تشکیل کی ہے۔ جن عناصر سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، ان عناصر سے ان کے فن کی تشکیل ہوئی ہے جیسے خلوص و صداقت۔

میؔر کا فن غزل کا فن ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے جن پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے ان کا وہ رچا ہوا مذاق رکھتے تھے اسی لیے ان کے فن میں رنگینی اور رعنائی کی جگہ نفاست اور لطافت ہے۔

؎ ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
اک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

ان کے ہاں خیال میں سادگی کی وجہ سے فنّی اظہار میں بھی سادگی ہے۔ ان کے خیالات حزن و یاس اور رنج و الم سے واسطہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن میں حزنیہ فضا اور المیہ آہنگ کا احساس سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ:

"میؔر کے یہاں شدید داخلیت ہے اور اسی داخلیت نے ان کے
فن میں حزن و یاس کی فضا پیدا کر کے اس کو نرمی، گھلاوٹ اور
شیرینی سے آشنا کیا ہے۔" ۶۱

میرؔ کی غنائیت تمام حواس کو متاثر نہیں کرتی بلکہ براہِ راست دل پر اثرانداز ہوتی ہے۔ ان کا فن مکمل اظہار و ابلاغ کرتا ہے جس کے لیے انھوں نے روایت اور ماحول کا اثر لے کر اظہار و ابلاغ کے نئے وسائل تلاش کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روایت اور تجربے کا حسین امتزاج ہے۔ فارسی روایات سے انھوں نے صرف اسی حد تک استفادہ کیا ہے جس حد تک ریختے کی فنی حدود نے اجازت دی ہے۔ اس لیے وہ لکیر کے فقیر ثابت نہیں ہوئے بلکہ اُن کی حیثیت ایک مجتہد کی حیثیت ہے۔ ان کی تشبیہات اور استعارے آس پاس کے خام مواد سے ماخوذ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ نامانوس ہونے کا احساس نہیں دلاتے۔ ان کے فن میں رمزیت اور ایمائیت بھی خاصے کی چیز ہے جو کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ موضوع اور مواد اس کو پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی زبان بول چال کی زبان ہے جس پر فارسی کا ہرگز غلبہ نہیں ہے۔ انھیں خصوصیات نے اُن کو غزل کا ایک عظیم شاعر بنایا ہے کیونکہ:

> ''ان کے یہاں زندگی اور فن کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے
> اور ان دونوں میں ایک ایسی متوازن ہم آہنگی نظر آتی ہے جس
> سے وہ ستر پردوں میں بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔'' ۶۲

''مرآۃ الشعراء'' مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ کی کتاب ہے جس میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ میرؔ ایسے شاعر ہیں جس کو بڑے بڑے اہلِ سخن نے اعلیٰ درجے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ وہ ان کی غزل گوئی کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں رطب و یابس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ غزل گوئی میں بے نظیر اور قابل استاد ہیں لیکن ان کا کلام
> رطب و یابس سے پُر ہے اور یہ رائے صرف ان کے اعلیٰ اور
> بلند کلام کی نسبت ہے ورنہ ان کا ادنیٰ درجہ کا کلام اس قابل نہیں
> کہ اس کو کلام کہا جائے۔'' ۶۳

ان کے ہاں الفاظ کا انتخاب ہوتا ہے اور وہ موقع کی مناسبت سے ان لفظوں کا استعمال کرتے ہیں:

؎ میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میؔر نے ایسے الفاظ کو "مذکر" استعمال کیا ہے جو اب مؤنث استعمال ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ کو ہندی لفظ کے ساتھ واؤ عطف سے معطوف کیا ہے جو کہ اب متروک ہے:

ہر گھڑی رنجش ایسی باتوں پر
کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے

ان کے ہاں بعض رکیک اشعار ان کی بدمزاجی کے مظہر ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود:

"میؔر صاحب نے جس سلاست اور روانی کے ساتھ اپنے مطالب کو ادا کیا ہے اور اپنے اشعار میں درد کو کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس کی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے۔" ۶۴

لیکن ان کا بلند مقام صرف غزل میں ہے جبکہ ان کے قصیدے بہت پھیکے ہیں اسی طرح مثنوی میں بھی انھیں استاد ماننا صرف قدامت نوازی ہو سکتا ہے۔ بے شک ان کی مثنویوں کے اشعار زبانِ زدِ خاص و عام ہیں لیکن اس صنف میں انھیں تمام شعراء پر برتری نہیں دی جا سکتی۔

مصنف کے خیال کے مطابق میؔر کے کلام میں کم از کم تین سو اشعار ایسے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

"فردوسِ معانی" عبدالرحمٰن طارق کی تصنیف ہے جس میں میؔر کے صوفیانہ اور عارفانہ کلام کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ان کے کلام کی خوبیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ میؔر کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت انھوں نے بھی اُن کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ ان کے کلام کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

"میؔر صاحب کا کلام سراپا درد ہے اور الفاظ اپنی سادگی اور برجستگی سے تیر و نشتر بن کر دل میں چبھ جاتے ہیں۔ اسلوبِ بیان حد درجہ پاکیزہ اور عام فہم ہے، تکلف اور بناوٹ نام کو نہیں۔" ۶۵

مصنف نے میرؔ کے کلام کی ان خوبیوں کو نمایاں کیا ہے:

۱۔ معرفت:

؎ اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن محدود جانتے ہیں

۲۔ دل، ذریعۂ معرفت:

؎ غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنجِ خرابہ میں نہاں تھا

۳۔ دلدارئ خلق

۴۔ جہادِ نفس:

؎ آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تس پہ ہم جی کو مار رکھتے ہیں

۵۔ شانِ عبودیت:

؎ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

۶۔ تسلیم و رضا

۷۔ بے ثباتیٔ دنیا

۸۔ اخلاقیات

۹۔ فلسفۂ عمل

میرؔ کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ عشقِ مجازی کے شاعر ہیں اور تصوّف سے انھیں کوئی سروکار نہیں لیکن مصنف کی یہ کوشش اس حوالے سے قابلِ قدر اور میرؔ شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے کہ اس میں ان کی شاعری کے متصوّفانہ پہلو کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

"لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت انھوں نے "ذکرِ میرؔ" سے مدد لی ہے۔ اس میں انھوں نے ان کی زندگی کے صرف اہم واقعات کو شامل کیا ہے۔ اس کے بعد میرؔ کی شاعری پر مختصر بحث شامل ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری اپنے انفرادی رنگ کے باوجود دہلوی شاعری کا عام انداز لیے ہوئے ہے۔ اس شاعری کی خصوصیات لکھنوی شاعری کی خصوصیات سے مختلف ہیں۔ درد و درماندگی ان کی شاعری کا اہم ترین جزو ہے۔ بقول مصنّف:

> "میرؔ کی شاعری کا اہم ترین جزو درد و درماندگی ہے جو غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی موجود ہے۔" ۶۶

"جدید اُردو ادبیات" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے زمانے کو درد وغم کا زمانہ قرار دیا ہے۔ میرؔ کو اس دور کے اکابر شعراء میں سرِفہرست رکھتے ہوئے ان کی غزل کو ان کے حال کا آئینہ قرار دیا گیا ہے۔

میرؔ کی شاعری کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان کا بہترین کلام انتہائی اچھا اور کم درجے کا کلام انتہائی کم درجے کا ہے۔ مصنّف اس کی توضیح کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کو بار بار پڑھا نہیں ہے کیونکہ انھیں حالات نے اتنی مہلت ہی نہ دی، اسی وجہ سے وہ اپنے کلام کو منتخب کر کے لوگوں کے سامنے نہیں لا سکے۔ ان کے ہاں متنوع مضامین کا بیان ہے اور ساتھ ساتھ ان کے ہاں سادگی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی لیے:

> "خیال اور بیان دونوں میں سادگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ عام طور پر چھوٹی بحریں پسند کرتے ہیں لیکن طویل بحروں میں بھی بعض بہترین غزلیں موجود ہیں۔ ان سب عناصر نے مل کر ان کے کلام کو ایسا اثر بخشا ہے کہ ان کے بعض اشعار نشتر کہلاتے ہیں کہ سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔" ۶۷

''تجربے اور روایت'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کو تنہائی پسند اور خلوت نشین سمجھنے کے باوجود ان کی شاعری میں ماحول کی ترجمانی کا احساس پایا ہے۔ بقول مصنف:

> ''میرؔ کی تنہائی پسندی، خلوت نشینی اور عزلت گزینی انھیں اپنے عہد اور ماحول کی ترجمانی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اس عہد کی افراتفری، ذہنی انتشار، سکون کی تلاش، شرفاء کی پریشان حالی، شعراء کی سراسیمگی، معاش کی قلت، آسمان کی سفلہ پروری کی جیتی جاگتی تصویریں ان کے کلام میں ملتی ہیں لیکن ان کا انداز رمزیہ اور ایمائی ہے۔'' ۶۸

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عام نقادوں نے انھیں دنیا سے کٹا ہوا بیزار انسان تصوّر کر لیا ہے، غلط ہے، وہ خارجی کائنات کے حوالے سے بھی گہرے تجربات کا شعور رکھتے تھے جس کا انھوں نے اپنی شاعری میں بار بار اظہار کیا ہے۔

''اُردو غزل'' ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف ہے جس میں اُردو غزل پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ غزل پر بحث کرتے وقت مصنف نے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے غزل کے نمائندہ شعراء کے کلام میں سے انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ ان شعراء پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگرچہ شاعروں نے حقیقی حوالے سے بھی غزل لکھی ہے لیکن غزل کا اصل رنگ مجازی ہے اور میرؔ کی غزل اس کی مکمل نمائندگی کرتی ہے۔ کیونکہ:

> ''میرؔ صاحب کی غزل گوئی انسانی اور مجازی رنگ لیے ہوئے ہے لیکن کہیں بھی طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف راغب نہیں کرتی۔ یہ ایک عشق باز کی نازک قلبی وارداتوں کا بیان ہے جو اپنے خلوص اور سوز و گداز کے سبب سے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔'' ۶۹

غزل میں جہاں پر عشق کے حوالے سے بحث ہوئی ہے وہاں پر میرؔ کے کلام کو غمِ عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا قرار دیا گیا ہے اور تصوّف کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میرؔ کا غالب رجحان تصوّف نہیں لیکن پھر بھی اساتذہ کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے تصوّف کے مضامین اپنے چند شعروں میں بیان کیے ہیں۔

''اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ'' خواجہ منظور حسین کی تصنیف ہے جس میں اردو شعراء کے کلام سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی شعور کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول مصنّف:

> ''اس تالیف میں سروکار شاعروں کے کلام سے ان کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی شعور اخذ کرنے سے ہے، ان کی شعری صفات سے نہیں۔'' ۷۰

اس کتاب میں میرؔ کی شاعری کو خارجی حوالوں سے دیکھتے ہوئے ان خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے:

۱۔ احوالِ عالم پر نظر

۲۔ شعر کا پردہ

۳۔ بات کی تہ نہ پانا

۴۔ زباں بندی

۵۔ جاسوسی

۶۔ اظہارِ حال کی تڑپ

۷۔ اسیری

۸۔ احوالِ خرابات

مصنّف نے میرؔ کی غزل کا ربط خارجی دنیا سے قائم کرتے ہوئے اس تاثر کو غلط ثابت کیا ہے کہ ان کی غزل صرف داخلیت کی حامل ہے۔

''اُردو کے چاند تارے'' امیر حسن نورانی کی کتاب ہے جس میں میؔر کے مختصر حالاتِ زندگی لکھتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بقول مصنف:

''ان کی غزلوں میں آپ بیتی ہے جس میں درد ہے، تاثیر ہے، سوز و گداز اور روانی ہے۔ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کو رُلاتے ہیں ان کا کلام سادہ اور صنعتوں سے پاک ہے۔'' ا؎

؎ اب تو جاتے ہیں میکدے سے میؔر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

''بارہویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول'' میں ڈاکٹر الف۔د۔نسیم نے ''نکات الشعراء'' میں میؔر کی چند شاعروں کے متعلق آراء کو متعصبانہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر تقی میؔر جس طرح چند شاعروں کے متعلق ذاتی بغض نکالتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح کی صورت دوسرے تذکروں میں کم دیکھنے میں آئی ہے۔ ہاں بعض ایسے شعراء کے متعلق جو واقعی اوباش اور بازاری قسم کے تھے تذکرہ نگاروں نے چند ہلکے الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن عام طور پر انھوں نے شاعروں کی ذاتی، صفاتی اور خاندانی اچھائیوں ہی کا ذکر کیا ہے۔'' ۲؎

''اُردو ادب کا ارتقاء'' میں ایم نذیر تشنؔہ نے میؔر کی شاعری میں ''آہ'' کو خارجی اور داخلی حالات کا نتیجہ قرار دیا ہے کیونکہ انھیں جو ماحول ملا وہ بھی سیاسی انتشار اور معاشرتی بربادی کا تھا اور وہ خود بھی بزمِ طرب اور محفلِ سرود کے فطرتاً اہل نہ تھے۔ بقول مصنف:

''ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی اس پر طرہ یہ کہ خودداری اور عزت کا ان کو بے حد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ عزلت کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر

> پھر تلخابۂ حیات پیتے رہے۔ بزمِ طرب اور محفلِ سرود کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے۔ خوشی اور ہشاشی بشاشی کا حصّہ قسامِ ازل نے ان کو دیا ہی نہ تھا۔" ۳۷

"اُردو میں قطعہ نگاری" میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، میرؔ کی قطعہ نگاری کی ادبی حیثیت کا تعیّن کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "کلیاتِ میرؔ (مرتبہ آسی) میں غزلیات سے علیحدہ صرف تین قطعات ہیں اور وہ بھی زیادہ اہم نہیں، البتہ غزلیات میں قطعہ بند اشعار کی تعداد بہت ہے یہاں تک کہ بعض غزلوں میں دو دو، تین تین، قطعہ بند موجود ہیں۔ معیار کے لحاظ سے بھی ان میں خاصا فرق ہے۔ بعض قطعات بہت اچھے، بعض اچھے اور بعض غیر معمولی ہیں۔" ۴۷

میرؔ نے مدحیہ قطعات نہیں لکھے۔ ان کے قطعات پر بھی غزل اور مثنوی کی طرح داخلیّت کا غلبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں موضوع کی تکرار پائی جاتی ہے لیکن یہ تکرار بری نہیں لگتی۔

"اُردو شاعری کا ارتقاءؔ" ڈاکٹر ناہید کوثر کی کتاب ہے جس میں اُردو شاعری کے ارتقاء کا جائزہ، طرزِ بیان اور موضوعات کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ اس میں جہاں پر مصنفہ نے زبان کی سادگی خلوص وصداقت، بول چال کا انداز، خطابیہ انداز، محاوراتی انداز، نازک خیالی، معنی آفرینی، بے ساختگی و برجستگی اور سلاست و فصاحت کا ذکر کیا ہے وہاں پر دیگر شاعروں کے ساتھ میرؔ کے کلام سے بھی مثالیں دی ہیں۔ میرؔ نے ایسی شاعری کی ہے جو عوام کے لیے ہے اور ان کا لب ولہجہ بڑی حد تک عوام کے لیے قابلِ فہم ہے۔ اظہار کے علاوہ ان کے موضوع بھی عام انسانی جذبات کو متاثر کرتے ہیں، کیونکہ:

> "میرؔ کی شاعری کا لب ولہجہ ایسا ہے جو عوام کے لیے قابلِ فہم اور مرغوب طبع ہے۔ جس طرح ان کے موضوع عام انسانی جذبات کو متاثر کرتے ہیں، اس طرح ان کے اظہار کا طریقہ بھی ایسا

ہے۔جس کی وجہ سے عام اور خاص ان کے اشعار کو بہت اچھی طرح
سمجھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔'' ۵؎

مصنفہ نے جہاں پر میرؔ کی شاعری کی دیگر خصوصیات کی طرف بڑے واضح اشارے دیے ہیں وہاں پر ان کی شاعری کے عوامی لہجے پر بڑا زور دیا ہے۔

''اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات'' میں ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں کہ میرؔ نے غزل جیسے تنگ میدان کو اپنی جولانگاہ بنایا ہے لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی روح کو اس میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ وہ اس مشترک تہذیب کے نمائندے تھے جس کی تشکیل برصغیر میں ہوئی۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں ہندوستان کی زمین بھی ہے اور فارسی کا آسمان بھی ہے۔ ان کی شاعری میں تہذیب کے دونوں دھاروں کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں پر ہندی بحروں کا استعمال، ہندی لفظوں کا بے تکلف استعمال، جذباتیت اور بعض تلمیحات، مقامی ماحول کا حصہ ہیں وہاں پر موضوعاتی اور لسانی اعتبار سے ان کی شاعری فارسی کی پیروی ہے۔ ان کی تہذیب کا مرکز ومحور تصوّف تھا جو عشق کی بنیاد پر قائم ہوا۔ کیونکہ:

''میرؔ کے عہد کی تہذیب میں تصوّف اس طرح داخل تھا جیسے
رگوں میں خون۔'' ٦؎

میرؔ نے چاہے تصوّف کو اپنی زندگی میں داخل نہ کیا ہو لیکن انھوں نے اسے اپنی روح میں ضرور اُتارا ہے کیونکہ تصوّف اُن کے عہد کا عام رجحان تھا۔

؎ تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

میرؔ کے مزاج میں غم پسندی اور جان کو گھلا دینے والا سوز وگداز جہاں پر سیاسی حالات کی وجہ سے تھا وہاں پر اس کو پیدا کرنے میں ان کی صوفیانہ تربیّت نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے ہاں سامانِ میکدہ پوری آب وتاب کے ساتھ ہے لیکن محض ان کے شعروں کو بنیاد بنا کر انھیں مئے خوار ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل خمریات پر مبنی اشعار ایرانی تہذیب اور فارسی شاعری کا حصہ ہیں۔ ان کی

شاعری میں عشق کی رسمی تصویریں اور امرد پرستی کے مضامین کی کثرت بھی ایرانی تہذیب کا حصہ ہیں۔ فارسی کے غلبے کا فیض ان کے ہاں کئی صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کی غزل کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''میرؔ کی غزلیں باوجود رسمی مضامین کے حقیقت سے قریب ہیں جن میں دردمندی ہے، سادگی ہے، گفتگو ہے، تخیلاتی بھول بھلیاں نہیں لیکن ان کی شاعری میں نری جذباتیت بھی نہیں۔ وہ تخیل کو بھی جرأت دیتے ہیں۔'' ۷۷

میرؔ اگرچہ غزل کے شاعر ہیں لیکن شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مثنویاں بھی اپنے عہد میں بہت مقبول تھیں۔

''اُردو شاعری پر ایک نظر'' میں محمد جمیل احمد، میرؔ کی غزل کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''میرؔ نے اگرچہ مثنوی، قصیدہ، سب کچھ لکھا ہے مگر ان کا اصل رنگ غزل گوئی ہے اور اس میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غزل ان کے ہاتھ میں پہنچ کر خوں گشتہ جذبات کا ایک دل آویز مرقّع بن گئی ہے۔'' ۷۸

مصنف نے میرؔ کی غزل کے حوالے سے اس میں غیرت وخودداری، عارفانہ رنگ، خمریات، فلسفہ کی آمیزش، ندرتِ بیان، لطافتِ خیال، حسنِ تشبیہ، روزمرہ اور محاورہ کی خوبصورت آمیزش جیسی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔

''ادب اور حقیقت'' انجم اعظمی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے ''میرؔ کا لہجہ'' کے زیرِعنوان ان کی شاعری کی انفرادیّت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب کوئی شاعر اپنی پوری شخصیت اور انفرادیّت کے ساتھ الفاظ میں ڈھل جاتا ہے تو یہی عمل اس کا لہجہ ہے۔ کیونکہ شاعر الفاظ

کے روپ میں اپنی ہی تخلیق کرتا ہے اور:

"میر کا لہجہ اُردو کا سب سے نرم، مانوس، دل گداز اور باوقار لہجہ ہے۔" ۷۹

لوگ میر کی شاعری سے زیادہ ان کے لہجے کے سحر میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہی لہجے کی قربت ان کی شاعری کی پوری معنویّت کو سمجھنے میں مانع رہی ہے، کیونکہ وہ دل میں یوں اُتر جاتے ہیں کہ انھیں ذہن سے کریدنے اور جاننے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے لہجے کے بنیادی عناصر کی کھوج کے لیے ان کے زمانے اور ذات کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ لوٹ مار کے معاشرے میں جہاں زندگی کی قدروں کا تحفظ ناممکن تھا۔ وہ اپنے زمانے کی قدروں کے محافظ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ "عشق" ان کے ہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے جو کسی شخص سے بھی ہے اور شخص سے بلند بھی ہے۔ ان کے ہاں یہ عشق کبھی معرفت، کبھی دردمندی اور انسانیت اور کبھی تہذیب بن جاتا ہے۔ اُن کا تصوّرِ انسانیت اپنے ہم عصروں سے اس لیے انفرادیت کا حامل ہے کہ:

"میر کی انسانیت اتنی سچی، الگ تھلگ، ایسی انوکھی، اتنی عظیم، اتنی سادہ اور فطری ہے کہ اس کو اپنانے کے لیے میر ہی بننا پڑے گا۔ اسی کی طرح تصنع کے سارے خول اُتارنے ہوں گے، عشق میں سب کچھ کھونا پڑے گا۔" ۸۰

اسی انسانیّت کی وجہ سے ان کا لہجہ منفرد صورت اختیار کرتا ہے اور ان کی شخصیت، لہجہ اور انسانیّت کا وہ دائرہ بنتا ہے جس میں گاہے گاہے آفاق بھی سمٹ جاتا ہے۔ داخل اور خارج کی وسعت کا مطالعہ کر کے ان کا لہجہ اُردو شاعری کی محدود فضا سے آگے چلا جاتا ہے اور دنیا کی شاعری میں اپنے لیے مناسب جگہ چاہتا ہے۔ ان کے لہجے کا ایک اہم عنصر وہ جمالیات ہے جس میں شاعر بحیثیت شاعر اپنے وجود کو قائم رکھتا ہے۔

؎ دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

میرؔ کے ہاں ایک ناکامی کے بعد دوسری ناکامی کے لیے جدوجہد کا تسلسل ہے۔ وہ ہزاروں درد و غم جمع کر کے ایک گلدستے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ شاعری کا اپنا نصب العین ہوتا ہے۔ شاعری جس قدر زندگی کی توانائی اور حُسن کی تخلیق کرتی ہے اتنی ہی عظیم ہوتی ہے۔ میرؔ کا لہجہ شاعری کے اسی نصب العین اور جمال نے مل کر تراشا ہے۔

''آئینۂ سخن فہمی'' سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی کتاب ہے جس میں انھوں نے ''میرؔ کا ایک شعر اور حشویات'' کے زیرِ عنوان میرؔ کے اس شعر:

؎ بیکسی مدّت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

سے حشویات کی نشان دہی کی ہے اور اس پر بڑی مدلّل بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے شاعر کو بعض موقعوں پر حشویات سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر وہ حشو قبیح سے بچ کر حشو ملیح سے کام لے تو بے شک تعریف کا مستحق ٹھہرے گا لیکن حشو بہرحال حشو ہی رہے گا اور اس کو حشو کہنا حقیقت کا اظہار ہوگا نہ کہ عیب جوئی یا اعتراض۔'' ۸۱؎

اصل میں مصنّف نے ''اختصار'' کی بحث میں میرؔ کے اس شعر کی مختصر صورت:

؎ بیکسی برسا کی اپنی گور پر
جو ادھر سے ہو کے گزرا رو گیا

پیش کی، جس پر ناقدین نے اعتراض کرتے ہوئے اسے میرؔ کے کلام پر اصلاح کی شکل قرار دیا، جبکہ مصنّف کا موقف یہ ہے کہ اس شعر میں حشو ضرور ہے لیکن اس کی مختصر صورت پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس اختصار سے بھی شعر کا مفہوم قطعاً کم نہیں ہوا۔

''میرؔ اور نظیرؔ کے ہم مضمون قطعے۔۔۔ تقابلی مطالعہ'' کے زیرِ عنوان مصنّف نے میرؔ اور نظیرؔ کے دو قطعے پیش کیے ہیں۔ ان میں سے نظیرؔ کا قطعہ طویل اور میرؔ کا قطعہ مختصر ہے جب کہ دونوں میں ایک ہی

مضمون بیان کیا گیا ہے لیکن اثر کے لحاظ سے میرؔ کا قطعہ، نظیرؔ کے قطعے سے بہت بہتر ہے۔

''تنقیدی ادب'' سیّد مرتضیٰ زیدی کی کاوش ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد ان کی شاعری پر بحث کی ہے۔ سب سے پہلے ان شاعروں کے اشعار درج کیے گئے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں میرؔ کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے کلام میں مشاہدے کی گہرائی، بول چال کا انداز، دردمندی، موسیقیت، تصوّف، مصوّری، حسن و عشق، انسان دوستی، تصوّرِ موت، فطرت پرستی، عہد کی ترجمانی اور تشبیہات کے استعمال پر بحث کی گئی ہے۔

''نقوشِ ادب'' فرزانہ سیّد کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے بارے میں ابتدائی معلومات دینے کے بعد ان کی شاعری پر بحث ہے۔ المیہ عناصر کے متعلق مصنّفہ لکھتی ہیں:

> ''میر تقی میرؔ اُردو کے ایک مسلّم الثّبوت اور بلند پایہ اور بلند آہنگ شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کا مدار المیے پر ہے، کیونکہ میر تقی میرؔ یہ بخوبی جانتے تھے کہ المیہ ایک مستقل امر ہے۔'' ۸۲

میرؔ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ایک سلجھی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ ان کی شاعری میں غم کی کسک موجود ہے۔ وہ واویلا کرنے کے قائل نہیں بلکہ اپنے غم کے حوالے سے دوسروں کے غم کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو کائناتی حوالوں سے دیکھا ہے، وہ ذاتی حوالوں کو کائناتی وسعت دینے کے ماہر ہیں۔ ان کی قناعت پسندی اور بے ریائی نے انھیں درویشانہ خصوصیات سے متصف کر دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے دنیا کی ناپائیداری اور اس سے بے نیازی کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ میرؔ کی بے ساختگی کے بارے میں مصنّفہ لکھتی ہیں:

> ''میر تقی میرؔ نے غزل کے پیکر لطیف میں بے ساختہ پن سے حد درجہ حسن پیدا کیا ہے۔ میرؔ اس بے ساختگی میں بھی وجدانی اور عرفانی باتیں کرتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ انداز میرؔ کے علاوہ کسی اور کو نصیب ہی نہیں ہو سکا۔'' ۸۳

''میرؔ سے فیضؔ تک'' پروفیسر خالد ندیم کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی میں وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کو آرزوؔ کے برتاؤ سے بڑی تکلیفیں پہنچیں، ان کی شاعری کے بارے میں مصنّف کا خیال ہے کہ اسے عروج دلّی میں نصیب ہوا اور لوگ ان کے کلام کو دور دراز شہروں میں بطور تحفہ لے جاتے تھے لیکن دلّی نے ان کی بہت کم قدر کی، میرؔ میانہ قد، لاغر اندام اور گندمی رنگ کے تھے، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات کم اور آہستہ آواز میں کرتے، ان کے مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے بھی زیادہ تھی جس کے نتیجے میں انھیں فاقے کرنے پڑتے۔

''ادبیاتِ اُردو'' شعبہ تصنیف و تالیف، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی کی مرتّب کردہ کتاب ہے جس میں میرؔ کے کمال کو غزل میں تسلیم کرتے ہوئے اُن کی شاعری کو سہل ممتنع کا نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ میرؔ کی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے جو انقلاباتِ عالم ان پر ذاتی اور اجتماعی طور پر گزرے تھے، وہی ان کے کلام کا موضوع ہیں۔ ان کا کلام ناہمواری کا حامل ہے، کیونکہ:

> ''میرؔ کو اپنے ذاتی حالات اور اس عہد کے سیاسی اور سماجی معاملات کی وجہ سے اس کا کبھی موقع نہ ملا کہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی کر کے حک و اصلاح کریں۔'' ۸۴

غزل کے علاوہ میرؔ کی مثنویاں ذاتی اور وارداتی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ عاشقانہ بھی ہیں۔ ذاتی مثنویوں میں وہ ایک نازک مزاج بلکہ بددماغ شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت دونوں یاس و حرماں کا مجسمہ ہیں کبھی تبسم زیرِ لب بھی ان کے ہاں نظر نہیں آیا۔ اپنے زمانے کے معاملات اور واقعات سے جو شدید اثر انھوں نے قبول کیا اسی نے ان کی شاعری کو جذبات کی شدّت، گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے منفرد بنا دیا۔

''مشاعرہ عالمِ ارواح'' سیّد مرتضیٰ حسین موسوی کی کتاب ہے۔ منفرد انداز کی حامل اس کتاب میں میرؔ کی بازیافت کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے مشاعرے کا حال ہے جو عالمِ ارواح

میں برپا ہے۔ اس مشاعرے میں میرؔ اور ان کے ساتھ دیگر شعراء ولیؔ، شبلیؔ، حالیؔ، آزادؔ اور مصحفیؔ کی باہمی گفتگو سے ''میرؔ شناسی'' کی کوشش کی گئی ہے۔

''گفتگو پہلی'' کے زیرِ عنوان ولیؔ اور میرؔ کا مکالمہ ہے جس میں ولیؔ اور میرؔ اُردو شاعری کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ میرؔ نے ولیؔ کا تتبع کیا ہے۔

''گفتگو دوسری'' کے زیرِ عنوان جب میرؔ غزل پڑھتے ہیں تو تمام شعراء جو اُردو ادب میں مقام رکھتے ہیں اور عالمِ ارواح کے مشاعرے میں موجود ہیں، اپنے اپنے انداز میں میرؔ کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی تعریف سے میرؔ کی شاعری کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ سہل ممتنع

۲۔ نادر تشبیہات

۳۔ لطیف استعارات

۴۔ حسنِ تعلیل

۵۔ واقعیت

آزادؔ کی زبان سے مصنف نے میرؔ کے کلام کی جو تعریف کرائی ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے:

> ''زبان کی شستگی، کلام کی صفائی، بیان کی پاکیزگی۔ جیسے باتیں کر رہے ہیں، کہیں تکلّف نظم نہیں ''سہل ممتنع'' یہی ہے۔ دل کے خیالات کو محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیا ہے۔ زبان میں وہ تاثیر ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں جن کی اصلیت قائم رہتی ہے۔ حزن و سوز سے دلوں کو گداز کرنا آپ ہی کا کام ہے۔'' ۸۵

یہ کتاب ''میرؔ شناسی'' کی ایک اچھوتی کوشش ہے جس میں صرف تخیّل سے کام لے کر میرؔ کے ادبی مقام کے تعیّن کی کوشش کی گئی ہے۔

''جنت میں مشاعرہ'' ڈاکٹر عارف بٹالوی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے بھی بڑے اچھوتے انداز میں جنت میں ہونے والے ایک ایسے مشاعرے کا خیالی حال لکھا ہے جس میں میرؔ، سوداؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ جیسے بڑے بڑے شعراء کو اپنی اپنی شاعری پیش کرتے دکھایا ہے۔ مصنف میرؔ اور سوداؔ کے بارے میں اس تاثر کو قائم کرتے ہیں کہ میرؔ کا کلام ''آہ'' اور سوداؔ کا کلام ''واہ'' ہے یعنی میرؔ کے کلام میں زندگی کے دُکھ اور سوداؔ کے کلام میں زندگی کی خوشیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

''تعارف: مشاہیر نظم و نثر کا سوانحی و تنقیدی جائزہ'' حفیظ الرحمٰن خاں اور عبدالعزیز بلوچ کی مشترکہ کاوش ہے جس میں میرؔ کی شاعری کی ان نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے:

۱۔ درد و غم
۲۔ سوز و گداز
۳۔ سادگی
۴۔ تصوّف
۵۔ موسیقیت
۶۔ حالاتِ زمانہ کی تصویر کشی

مصنف میرؔ کی عظمت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''میرؔ کی عظمت کا راز اس کے ہمہ گیر اور آفاقی پیرایۂ بیان میں ہے۔ انھوں نے ذاتی احساسات و جذبات اور درد و غم کے اظہار کے لیے ایک ایسا سادہ، بے تکلفانہ اور عمومی لب و لہجہ اختیار کیا کہ ان کے کلام کو جو بھی پڑھتا ہے اسے اپنے ہی جذبات و احساسات اور دکھ درد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''[۸۶]

''اُردو شاعری پر ایک نظر'' کلیم الدّین احمد کی کتاب ہے جس میں انھوں نے جہاں پر غزل پر اعتراضات کیے ہیں وہاں پر غزل گو شعراء کے بارے میں بھی سخت آراء دی ہیں۔ میرؔ کے بارے

میں اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ مخصوص و محدود قسم کی قوتِ حاسہ کے مالک تھے۔ ان کے جذبات و تصوّرات میں تنوّع نہیں پایا جاتا بلکہ:

> ''میؔر کے ذہن و ادراک بھی محدود قسم کے تھے۔ ان کے خیالات عمیق و بلند نہیں، سطحی اور معمولی ہیں۔ کسی جگہ بھی وہ اعلیٰ دماغی طاقت کا ثبوت نہیں دیتے۔'' ۸۷

بے شک ان کے احساسات کی دنیا محدود تھی لیکن وہ جو بھی محسوس کرتے، وہ شدّت کے ساتھ محسوس کرتے، اس سے وہ خود بھی متاثر ہوتے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے۔ ان کی دنیا میں عشق کی حکمرانی ہے لیکن ان کو عشق کے ایک خاص رُخ سے آشنائی تھی اور وہ اسے باعثِ عیش و نشاط نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے خیال میں اس کا نتیجہ ہمیشہ یاس انگیز ہوتا ہے۔ انھیں چاروں طرف اپنی حرماں نصیبی کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ان کی دنیا اتنی تاریک ہے کہ اس میں کہیں اُمید کا ستارہ نظر نہیں آتا:

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

میؔر کے ہاں پامال مضامین ہیں جن سے اُردو غزلیں بھری پڑی ہیں لیکن پھر بھی ان کے ہاں یہ پامال مضامین ایک عجیب اثر آفرینی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عام انسانی احساسات خاص ذاتی احساسات کا روپ بدل لیتے ہیں۔ اگر وہ نظم کے صحیح مفہوم سے واقف ہوتے اور نظمیں لکھتے تو دنیا کے عظیم شاعر ہوتے۔

ان کی شاعری سوختہ جانی کی تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری نہیں، ایک شعلۂ رقصاں ہے۔ انھوں نے جو غزلیں لکھی ہیں، یوں لگتا ہے کوئی باتیں کر رہا ہے۔ وہ ایک کامل مصوّر ہیں جو خارجی اور باطنی تصویریں نہایت حسن و خوبی سے کھینچتے ہیں۔ ان کے کلام میں بہت زیادہ خامیاں ہیں لیکن:

> ''میؔر کے کلام کا اصل نقص اس کی ناہمواری ہے۔ اس کا معتدبہ حصہ پست و مبتذل ہے۔'' ۸۸

میؔر کے ہاں ناگوار ناہمواری پائی جاتی ہے اور یہ ناہمواری مختلف غزلوں میں نہیں بلکہ ایک ہی

غزل کے مختلف شعروں میں بھی موجود ہے۔ وہ عشق مجازی کے مردِ میدان ہیں لیکن کبھی کبھی رسماً عشقِ حقیقی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے جذبات زیادہ پرجوش ہیں۔ اس لیے وہ دلوں پر اثر بھی جلد کرتے ہیں۔ ان جذبات نے ان کی ہستی میں ایسا طوفان برپا کیا ہے جس سے ان کا سکون ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گیا ہے اور ان کے رگ رگ میں خون جاری ہے، جس یاس وحرماں اور ناامیدی کی وہ تصویر کھینچتے ہیں کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ آپ بیتی خون بھرے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے بے چین ہو جاتے ہیں لیکن ان کا طرزِ کلام خاص ہی نہیں، خاص الخاص ہے۔

''مطالعہ آبِ حیات'' سیّد آغا حیدر کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے آزؔاد کی تحقیقی کمزوریوں کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزؔاد نے میؔر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان پر تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے مصنف بیان کرتے ہیں کہ میؔر کے والد کا نام آزؔاد نے میر عبداللہ لکھا ہے لیکن یہ نام بعد میں ہونے والی تحقیقی پیش رفت کے پیشِ نظر غلط ہو گیا لیکن آزؔاد کی تحقیق پر حرف اس لیے نہیں آتا کہ اس وقت کے دستیاب ذرائع کے حوالے سے یہی نام تھا۔

مولوی حبیب الرحمٰن شیرانی نے تذکرۂ ''نکات الشعراء'' مرتّب کیا جس میں انھوں نے آزؔاد کی میؔر کے بارے میں پیش کی گئی آراء سے اختلاف کیا ہے۔ آزؔاد نے میؔر کی نازک مزاجی اور بے دماغی کے حوالے سے جیسے خیالات کا اظہار کیا ہے، مصنف نے ان سے اتفاق کیا ہے جب کہ شیرانی کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''میؔر سے ذاتی واقفیت رکھنے والے مصنفوں کے یہ بیانات میؔر کی ویسی ہی تصویر پیش کرتے ہیں جیسی آزؔاد نے آبِ حیات میں کھینچی ہے۔ ان بیانات کو پڑھنے کے بعد میؔر کو منکسر المزاج ماننا مشکل ہے۔'' ۸۹

مولوی شیرانی نے آزؔاد کے جن خیالات کو میؔر کے بارے میں من گھڑت قرار دیا ہے،

اس کتاب کے مصنف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے آزاد کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ آزاد کے بارے میں اس خیال سے کہ ان کی نظر سے ''نکات الشعراء'' کا نسخہ گزرا ہی نہیں، اس سے بھی اختلاف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''قاسم اور آزاد کے سامنے نکات الشعراء کا مکمل نسخہ اپنی اصل شکل میں تھا۔۔۔ نکات الشعراء کا مطبوعہ نسخہ اصل نسخے کا ترمیم شدہ خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔'' ۹۰

''کاشف الحقائق'' سیّد امداد امام اثر کی تصنیف ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میر سلطان المتغزلین ہیں ان کے بہت سے اشعار ترک کر دینے کے قابل ہیں لیکن پھر بھی انتخاب کیا جائے تو ایک قابلِ قدر دیوان مرتب ہوسکتا ہے ان کی غزل سرائی کبھی وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھتی، اسی لیے:

> ''میر صاحب کی غزل سرائی تمام تر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے۔ تب ہی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجۂ کثیر پائی جاتی ہیں۔'' ۹۱

یہ صفات درد کے کلام میں بھی موجود ہیں لیکن درد کے ہاں پاکیزگی اور نفاست قابلِ توجہ جبکہ محزونی اور نشتریت میر کے ہاں درد کے مقابلے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اُن کی سخن سنجی کا انداز ایسا ہے جس کا کوئی شاعر تتبع نہیں کر سکا بلکہ اُن کے حسنِ کلام تک پہنچنے کی شعراء نے جس قدر کوششیں کی ہیں، انھیں اسی قدر پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔

''گلِ رعنا'' حکیم عبدالحیی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میر کے والد کا نام عبداللہ لکھا ہے۔ اس کتاب سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ''نکات الشعراء'' میں میر نے خان آرزو کا

ذکر محبت اور ادب سے کیا ہے۔ محمد حسین کلیم، میرؔ کے بہنوئی تھے۔ میرؔ ساٹھ سال کی عمر میں دلّی سے لکھنؤ آئے اور نواب آصف الدّولہ نے ان کی بڑی قدر کی۔ آزادؔ نے میرؔ کی نازک مزاجی اور بدماغی سے متعلق جو واقعات درج کیے ہیں، ان سے:

''معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزادؔ کی نظر سے نکات الشعراء نہیں گزرا، نہ اس قسم کے مضامین جو آبِ حیات میں لکھے ہیں، کسی مستند مآخذ سے لیے گئے ہیں، صرف قصے کہانیوں پر ان کی بنیاد ہے۔'' ۹۴

''نکات الشعراء'' اور دیگر تذکروں کی مدد سے میرؔ کے جو اوصاف سامنے آتے ہیں ان کے مطابق وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضع دار آدمی تھے۔ مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی زندگی انقلاباتِ زمانہ کی نذر ہوگئی۔ پرانی وضع سے ہٹ کر نئی وضع کے لوگوں سے جب ان کا سابقہ پڑا تو وہ اس صحبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہی ان کی بدماغی ہے۔

''گلشنِ ہند'' کے حوالے سے مصنّف نے لکھا ہے کہ جب کلکتہ میں اُردو زبان کی سرپرستی کا خیال ہوا تو لکھنؤ سے میرؔ کو کرنل اسکاٹ کے سامنے بھیجا گیا لیکن عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان کا انتخاب فورٹ ولیم کالج میں نہ ہو سکا۔

''شعرالہند'' مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف ہے جس میں ''میرؔ و مرزاؔ'' کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ و مرزاؔ کو حریف و مقابل تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی شاعری کا موازنہ و مقابلہ اردو شاعری کی تاریخ کا لازمی جزو ہو گیا ہے۔ میرؔ و مرزاؔ کی حریفانہ حیثیت کا تو صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن ایک زمانے تک دونوں میں اتحاد رہا اور میرؔ، سوداؔ کو اپنا شریکِ فن تسلیم کرتے رہے۔ سوداؔ کا بھی یہی حال تھا لیکن ان کی شاعری سے اتحاد کے بعد اختلاف کے شروع ہونے کا پتا بھی چلتا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ ان کے اختلافات دلّی میں نہیں، لکھنؤ میں شروع ہوئے۔

میرؔ اور سوداؔ کو اگر سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس دور کی شاعری کی خوبیاں اور خامیاں دونوں کے ہاں موجود ہیں لیکن:

''غزل گوئی میں سوداؔ کو میرؔ سے اس لیے پست درجہ خیال
کیا جاتا ہے کہ سوداؔ کی غزلوں میں تغزل کی اصلی روح یعنی
سوز و گداز کم ہے۔'' ۹۳

مصنّف کے نزدیک اس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ سوداؔ کی ہجوگوئی نے ان میں وہ عجز پیدا نہیں ہونے دیا جو میرؔ کا عام شیوہ اور غزل کا اصل عنصر ہے۔

۲۔ سوداؔ کی غزلوں کی زمینیں مشکل ہیں جبکہ میرؔ نے آسان زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں۔

۳۔ سوداؔ، میرؔ کی طرح گوشہ نشین اور قناعت پسند نہ تھے بلکہ انھوں نے ہمیشہ درباری زندگی بسر کی۔

۴۔ میرؔ فطرتاً شگفتہ مزاج نہیں تھے جبکہ سوداؔ شگفتہ مزاج تھے۔

قصائد میں میرؔ کا درجہ سوداؔ سے پست نظر آتا ہے لیکن تشبیہات میں سادگی اور لطافت جیسی خصوصیات جو سوداؔ کے ہاں پائی جاتی ہیں، ان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ میرؔ کی مثنویوں کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی ''شعرالہند'' حصہ دوم میں لکھتے ہیں کہ:

''میرؔ کی مثنویاں ابتدا ہی سے عام پسندیدگی کی نگاہ سے
دیکھی گئیں۔'' ۹۴

اُردو ادب کی تاریخ نگاری کا جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تذکروں کی روایت نے تاریخ نگاری اور تنقیدی عمل کو بھی متاثر کیا۔ بیشتر نقاد اور مؤرخ بنیادی طور

پر محقق تھے۔ اسی لیے وہ زیادہ تر تاریخی نوادر تلاش کرتے رہے جب کہ رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے ہاں تاریخ نگاری کا سائنسی انداز ملتا ہے لیکن تاریخ نگاری کے تمام تر تقاضے وہ بھی پورے نہ کر سکے۔ اس لیے قیامِ پاکستان سے پہلے اردو ادب کی جامع، مکمل اور مستند تاریخ نہیں لکھی جا سکی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ایسی تاریخ کی شدّت کے ساتھ ضرورت محسوس کی گئی جو ادبی تاریخ کے تمام تقاضے پورے کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بڑی حد تک کوششیں ہوئیں۔ ان کوششوں نے کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''آزادی کے بعد تاریخِ ادب کو منصوبہ بندی سے مرتّب کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی، چنانچہ کئی اشخاص کی محنت سے مرتّب ہونے والی تاریخیں بھی منظر پر آئیں اور انفرادی کاوش سے ترتیب پانے والی مفصّل تاریخوں کی اشاعت کا اہتمام بھی ہوا اور تفصیل کو اجمال میں سمیٹ کر ''مختصر ترین تاریخ'' شائع کرنے کا تجربہ بھی ہوا۔'' ۹۵

تاریخ ادب میں جہاں ادب کا مطالعہ اس دور کے اپنے ادبی معیار اور نظامِ اقدار کی مدد سے کیا جاتا ہے وہاں ساتھ ساتھ دائمی ادبی معیاروں سے بھی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ اسے پڑھتے وقت یہ احساس ہو کہ جہاں پر مخصوص واقعات و رجحانات شخصیات کو جنم دے رہے ہیں وہاں پر ادبی شخصیتیں بھی تاریخی دھارے کو نئی جہت دے رہی ہیں۔ ادبی مؤرخ میں ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ تاریخی شعور

۲۔ قوتِ تجزیہ

۳۔ نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت

۴۔ گہری تنقیدی نظر

۵۔ تحقیقی مزاج اور تربیت

۶۔ گہرا لسانی شعور

۷۔ اپنے ادب کا مربوط مطالعہ

۸۔ واقعات کو منطقی انداز اور ترتیب سے بیان کرنے کی صلاحیت

تاریخ ادب صرف ادب ہی کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ یہ سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر زبان و بیان کی تبدیلیوں کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخ میں ان تخلیقات کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں معاشرے کو متاثر کیا اور پھر سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بے جان ہو کر رہ گئیں اور ان تخلیقات کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے جو قدیم ہوتے ہوئے آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے پہلے تھیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد لکھی جانے والی تمام ادبی تاریخوں میں میرؔ کو شامل کیا گیا ہے اور عام طور پر انھیں دیگر شعراء سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ادبی تاریخوں میں ''میرؔ شناسی'' کی کوششیں جس رنگ میں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان کا اجمالاً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

''تاریخِ ادب اُردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی بہترین کوشش ہے جس میں وہ میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے ساری زندگی غموں میں بسر کی۔ انھیں ذاتی اور معاشرتی سطح پر سازگار حالات میسر نہ ہوئے۔ ان کی ذات غم سے وابستہ تھی جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہونا لازمی امر تھا۔ انھوں نے غم کو اپنی شاعری میں بیان تو کیا ہے لیکن جب یہی غم کاغذ پر منتقل کیا گیا تو ذاتی کے بجائے آفاقی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کی شاعری کے قاری کو یوں محسوس ہوا کہ یہ اس کا اپنا غم ہے۔ یہی ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے ذاتی جذبے کو آفاقی رنگ دے دیا۔ بے شک:

> ''میرؔ کے لیے اپنی ذات بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن جب وہ اپنی تنہائی
> کو بیان کرتے ہیں تو اسے ذاتی سطح کے بجائے زندگی سے ملا کر اس
> طور پر بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کی تنہائی ہم سب کی تنہائی بن جاتی ہے۔
> ان کے درد و غم، ہم سب کے درد و غم بن جاتے ہیں۔'' ۹۶

میرؔ کی شاعری میں احساس اور جذبے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے غم کا اظہار

نہ کرتے تو مریضانہ ذہنیت کا شکار ہو جاتے۔ اپنی شاعری میں غم کے اظہار کی وجہ سے وہ اس مرض سے بچ گئے۔ ان کے کلام میں اتنی تاثیر ہے کہ شعر پڑھتے ہی دل میں بس جاتے ہیں۔ عشق ان کے ہاں ذاتی حوالے سے بھی ہے اور کائناتی حوالے سے بھی۔ انھوں نے موت کے روایتی تصوّر کو عشق میں شامل کر کے موت اور زندگی کو ایک کر دیا ہے۔ بقول مصنّف:

> ''میرؔ نے موت کے روایتی تصوّر کو جو مجاہدانہ تصوّر دیا ہے۔
> اپنے تصوّرِ عشق میں دوبارہ شامل کر کے اسے نمایاں کیا اور موت
> کو زندگی سے ملا کر اسے ایک نیا تسلسل دیا۔'' ۹۷

ان کے کلام میں عشقیہ کیفیات میں انسانی سطح برقرار رہتی ہے اور عشق کا سارا عمل انسانی سطح پر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں غم کی کیفیات بہت زیادہ ہیں۔ جہاں پر غم ان کی شاعری کے لیے لازم ہے، وہاں پر وہ اس غم کو ایسا غم نہیں رہنے دیتے جو انھیں شکستگی اور پسپائیت کی طرف لے جائے۔ یہ صرف ان کے لہجے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ان پر غم کے منفی اثرات مرتب ہونے کے بجائے اس نے انھیں جہاں بینی کی دولت سے نوازا ہے۔ کیونکہ:

> ''میرؔ اپنے لہجے سے غم و الم کو غم و الم نہیں رہنے دیتے جس کا اثر
> شکستگی و پسپائیت کا نہیں بلکہ مثبت ہوتا ہے۔ میرؔ کے غم میں تلخی،
> بیزاری اور زہر کا بھی یاسیت کے بجائے صبر، تسلیم و رضا اور
> جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے۔'' ۹۸

اسی غم کی وجہ سے ان کی شاعری میں غنائیت پیدا ہو گئی ہے اور دوسری چیز جس نے ان کی شاعری کو غنائیت دی ہے ان کا بنیادی طور پر جذباتی ہونا ہے۔

میرؔ کی شاعری میں انسان اور انسانی رشتوں کا گہرا شعور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی اپنی اچھائیوں، برائیوں، کمزوریوں اور توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی شاعری میں قدرتی مناظر ان کے جذبے کا حصہ بن کر سامنے آئے ہیں۔ وہ مختلف رنگوں کو ملا کر اپنی شاعری کا ایک خاص رنگ پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ

ان کے کلام میں محاورات کا برمحل استعمال بھی ہے۔ اُن کی طویل بحروں نے جذبے کی شدّت کو پھیلا کر خوشگوار بنا دیا ہے، وہ غزل کی روایت کے مکمل نمائندے ہیں۔ ان کی غزل کی زبان عام بول چال کی زبان ہے لیکن اس میں تخلیقی شعور بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جن کی زبان فارسی زبان کے زیرِ سایہ نہیں بلکہ انھوں نے اپنی خاص زبان استعمال کی جس نے فارسی زبان کی حاکمیّت کو ختم کر کے اُردو زبان کی حاکمیّت کو قائم کر دیا۔ انھوں نے غزل میں شہرت کی بلندیوں کو چھوا لیکن دیگر اصنافِ شاعری میں اتنا بلند مقام حاصل نہ کر سکے، اس کے باوجود انھوں نے خوبصورت مثنویاں لکھی ہیں لیکن عام طور پر نقادوں کو ان کی مثنویوں میں فن کا فقدان نظر آتا ہے۔ شاعری کی دیگر اصناف میں انھیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ ہو سکا۔

''تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی کاوش ہے جس میں میرؔ پر لکھا جانے والا باب مشہور میرؔ شناس ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا مقالہ ہے جس میں جامعیّت کے ساتھ میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد مصنّف لکھتے ہیں کہ ان کے قصائد اُردو ادب میں وہ مقام نہیں رکھتے جو ان کی غزل کو نصیب ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قصیدہ جن باتوں کا تقاضا کرتا تھا، میرؔ ان کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے اور یہی دردمند دل ان کی زبان کو سادہ اور دردمند بنا گیا۔ قصائد کے لیے ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے جو رعب و دبدبہ کی حامل ہو لیکن:

> ''میرؔ نے جو قصیدے لکھے ہیں، وہ بڑی کوشش کے باوجود غزل یا مثنوی کا ڈھنگ اختیار کر جاتے ہیں۔'' ۹۹

ان کی مثنویاں کمزوریوں کے باوجود بڑی خصوصیات کی حامل ہیں لیکن مقبولِ عام کے لحاظ سے میر حسنؔ کی مثنوی ''سحرالبیان'' کو فضیلت حاصل ہے۔ بقول مصنّف:

> ''میرؔ کی مثنویوں کی قدر و قیمت سے انکار نہیں لیکن جو قبولِ عام ''سحرالبیان'' کو حاصل ہوا ان کی مثنویوں کو نہیں مل سکا۔'' ۱۰۰

میرؔ کی غزل ان کے لہجے اور شخصیت کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں جس میں دلّی کے

شعراء کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان کی غزل باتیں ہیں اور یہ باتیں وہ ہیں جو وہ عوام سے کر رہے ہیں۔ وہ ان غزلوں میں آفاقی اقدار کو لازوال بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ انھوں نے جو شاعری کی ہے وہ اپنے اندر ان کی شخصیت اور زندگی لیے ہوئے ہے۔ اس میں ذاتی حوادث کے ساتھ ساتھ اجتماعی حوادث کا بھی بیان ہے۔

؎ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

؎ دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ان کے ذاتی غم اور کائناتی غم اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ انھیں جدا کرنا مشکل ہے۔ ان کے افکار کو دیکھا جائے تو وہ زندگی کو ایک گوہرِ گرامی سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں زندگی کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ اس زندگی میں جب وہ تجسّس کی حدود کو چھونا چاہتے ہیں تو تحیّر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ تحیّر انھیں تجسّس کا شکار کر کے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں کر دیتا ہے۔ ان کا تصوّرِ زندگی، تصوّرِ موت کے بغیر نامکمل ہے اور یہی تصوّر انھیں زندگی کی حقیقی قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ خدا کی جب بحث آتی ہے تو وہ صوفیاء کے عام عقائد کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں انسان اور آدمی کی اصطلاحات عام طور پر مترادف استعمال کی ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے مختلف معنی بھی لیے ہیں۔ میؔر نے جو کچھ محسوس کیا ہے، اس کو فن کا سہارا لے کر بالکل اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں بحور، الفاظ و اصوات اور زبان پر اختیار، ہر ایک ان کے مخصوص جذبات کے اظہار کے لیے معاون ہے۔ انھوں نے جو شاعرانہ حربے استعمال کیے ہیں وہ کسی طور پر بھی ان کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے۔ ان کے شاعرانہ فن کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''ان کی عظمت دراصل ان کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ خصوصاً غزل، مثنوی اور واسوخت کی وجہ سے اور اس خاص لہجے کی وجہ

سے جو انھیں دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے سچی
کیفیاتِ قلبی کو سادہ اور مؤثر زبان و بیان میں ڈھال کر شاعری
کا ایسا نمونہ بنا دیا جس کی کامیاب تقلید کوئی نہیں کر سکا۔'' ۱۰۱؎

میرؔ کی شاعری ان کی شخصیت اور زندگی کی ترجمان ہے۔ اس میں ذاتی حوادث کے احساسات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حوادث کے احساسات بھی شامل ہیں۔ ان کے کلام میں جہاں پر آپ بیتی ہے وہاں پر جگ بیتی بھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے کی روح کے کامیاب ترجمان ہیں۔

''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے مختصر حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد مصنف نے جہاں پر ان کی شاعری پر داخلی اثرات کا جائزہ لیا ہے وہاں پر اسے خارجی حالات سے ہم آہنگ کر کے بھی دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرؔ کی شاعری ان کی داخلی واردات اور اس پریشان حال دور
کی سماجی صورت کا آئینہ ہے۔ وہ زمانے کو بچشمِ نم دیکھا کیے اور
دل کی زبان سے حالاتِ زمانہ رقم کرتے گئے۔'' ۱۰۲؎

مصنف نے میرؔ کی غزل کو سراہا ہے۔ اس کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ انھوں نے ذات کے حوالے سے کائناتی تجربات کیے ہیں۔ ان کی غزل جذبات کو بے قابو نہیں کرتی بلکہ ان جذبات کی تقلیب کر دیتی ہے، کیونکہ اس میں دردمندی اور عجز و انکسار ہے۔ ان کی غزل میں ہر زمانے کی بازگشت سنائی دیتی ہے کیونکہ:

''اس صنف میں میرؔ نے ذاتی واردات سے کائناتی تجربے کیے
اور انسانی کرب کو تخلیقی کرب کی صورت دی ہے۔ ان کی غزل
میں دردمندی بھی ہے اور عجز و انکسار بھی، چنانچہ یہ احساس اور
جذبے کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ گیلی لکڑی کی طرح سلگاتی اور
دبے ہوئے بوجھل جذبات کا کتھارسس یا تقلیب ماہیت کر دیتی
ہے۔ میرؔ کی غزل نے انسانی تجربے کو ارتکازی صورت دی ہے

اور اس میں ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی آواز بھی مجسم ہو گئی ہے۔" ۱۰۳

ان کے زمانے میں صوفیانہ خیالات کا پرچار عام تھا۔ اس لیے وہ بھی مزاج کے لحاظ سے صوفی شاعر تھے لیکن انھوں نے تصوّف کو دردؔ کی طرح اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ شاعری میں وہ کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔ میرؔ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ سادہ زبان ہے اس کی تراش خراش پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جن جذبات و احساسات کے لیے یہ زبان استعمال کی گئی، وہ صداقت اور معصومیّت رکھتے ہیں۔ یہ صداقت اور معصومیّت اس زبان کی داخلی خوبی ہے۔

میرؔ کے بعد آنے والے شاعروں نے ان کی تقلید کا شیوہ اختیار کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی بڑے بڑے شاعروں پر ان کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کے سیاسی وسماجی حالات اور قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی وسماجی حالات میں بڑی حد تک مماثلت تھی۔

"تاریخِ ادبِ اُردو" ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ نے اپنی غزلوں میں نغمیت کی فضا پیدا کرنے کے لیے تکرارِ حروف والفاظ سے کام لیا ہے۔ غم اور میرؔ لازم وملزوم تھے۔ انھوں نے جب کبھی اپنی ذات اور کائنات کے حوالے سے غم کا بیان کیا تو اس کے اثرات ان کی شاعری پر بھی پڑے۔ بعض نقادوں نے ان کی شاعری کو صرف غم کی شاعری سمجھ لیا اور اس میں نشاطیہ انداز تلاش کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اگرچہ:

"میرؔ کی شاعری پر درد وغم کے بادل چھائے ہوئے ہیں مگر ان میں کبھی کبھی نشاط کی بجلی بھی چمکتی رہتی ہے جو اس درد وغم کو ہمارے لیے گوارا بناتی ہے۔" ۱۰۴

الغرض ان کی غزلیں ایسی ہیں جو خواص اور عوام دونوں پسند کرتے ہیں اور یہی چیز بڑی شاعری کا معیار ہے۔ ان کی غزل کو بہت زیادہ سراہا گیا ہے لیکن ان کی دیگر اصنافِ شاعری کو وہ مقام

نہیں دیا گیا جو مقام ان کی غزل کو دیا گیا ہے لیکن ان کی مثنویاں فنی کمزوریوں کے باوجود بڑی اہمیت کی حامل ہیں اگرچہ:

''یہ مثنویاں فنی اعتبار سے بلند مرتبے کی حامل نہیں ہیں مگر اپنے ہم عصروں میں میر ہی سب سے بہتر مثنوی نگار تھے۔ ان کی مثنویوں میں کہانی یا پلاٹ سے زیادہ جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔'' ۱۰۵؎

''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ڈاکٹر سلیم اختر کی تصنیف ہے جس میں وہ میر کے مختصر حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میر کی زندگی تضادات کا شکار رہی جس کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے کیونکہ:

''ایک طرف وہ زندگی اور اس کے الم کو سادہ سے سادہ الفاظ اور مترنم بحروں میں پرتاثیر طریق پر بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ ایک عیش پسند اور جارح امرد پرست کے روپ میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔'' ۱۰۶؎

میر نے اپنے خیالات و احساسات کے لیے سادہ ترین زبان استعمال کی ہے۔ ان کے اشعار میں مکالماتی انداز پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے مثنوی کی صورت میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان کا پورا پورا زور غزل پر صرف ہوا ہے۔ ان کے طرزِ اظہار کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

''طرزِ اظہار کے لحاظ سے میر کی سادگی اور سہل الممتنع اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جذبہ کا رچاؤ اور احساس کی گھلاوٹ اساسی خصوصیات ہیں۔ اشعار میں گفتگو اور مکالمے کا انداز اور ''تکیہ'' کی فضا ہے۔ طویل بحروں میں مترنم الفاظ تموج اور مختصر بحروں میں الفاظ کی ترتیب سے صوتی آہنگ پیدا کرنا اہم وصف ہے۔'' ۱۰۷؎

''مختصر تاریخِ ادب اُردو'' ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین کی تصنیف ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب میرؔ والد کی وفات کے بعد دلّی آئے تو خان آرزوؔ کے برتاؤ نے انھیں بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ یہاں پر ان کی شاعری کو عروج نصیب ہوا۔ ان کے مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں بدمزاجی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی شاعری کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''میرؔ صاحب نے مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے
لیکن غزل میں ان کا پایہ ہر شاعر سے ممتاز ہے۔'' ۱۰۸

اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزّل کو جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے انھوں نے نبھایا ہے وہ ان ہی کے حصے کی بات ہے۔ ان کے ہاں سوز و گداز، خستگی، نشتریّت، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ کی خاصیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ وہ عشق کی واردات کو اس خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا لطف محسوس کرتے ہیں۔ انھیں مثنوی میں بھی کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، کیونکہ وہ اس صنف میں بھی عشق کی واردات کو نہایت عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں لیکن منظر نگاری پر انھیں مکمل دسترس حاصل نہیں ہے، ان کے قصائد سوداؔ کے قصائد سے کم درجے کے ہیں۔

''مختصر تاریخِ ادب اُردو'' محمود بریلوی کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کے کلام کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''میرؔ کی اُردو شاعری سہل ممتنع، سادہ، آسان، سنجیدہ، باوقار، اثرانگیز اور داخلی جذبات سے لبریز ہے۔ اس میں گہری معنویّت کے ساتھ غم واندوہ کی کارفرمائی ہے۔۔۔ اگرچہ مثنوی میں میرؔ حسن، میرتقی میرؔ پر فائق تھے اور قصیدے میں سوداؔ، میرؔ پر بازی لے گئے تھے لیکن اُردو غزل میں آج تک کوئی شاعر میرؔ کی بلندیوں کو نہ چھو سکا۔'' ۱۰۹

میؔر جب دلّی سے لکھنؤ آئے تو ان کی شاعری کی وجہ سے بڑی قدردانی ہوئی۔ ان کے کلام میں غنائیت ہے اور اُردو غزل میں ان کی انفرادیّت آج تک قائم ہے۔ انھوں نے حسن و محبّت سے متعلق اپنے ذاتی تجربات کو اس پرکاری، فنّی مہارت اور اثرانداز ی کے ساتھ اپنے اشعار میں بیان کیا ہے کہ وہ شاعری نہیں، ساحری معلوم ہوتی ہے۔

''اُردو ادب کی تاریخ'' نسیم قریشی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میؔر کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے لیکن یہ بھی مانا ہے کہ ان کا اُردو ادب میں اعلیٰ ترین مقام غزل کی وجہ سے ہے۔ ان کی غزل میں درد و کرب کا جادو ہے جو انسان کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ بقول مصنّف:

> ''میؔر کا حقیقی کمالِ شعرگوئی غزل میں ظاہر ہوا ہے وہ ایک خوددار، حسّاس طبیعت، اپنے تجربات میں کھوئے ہوئے انسان تھے۔ تصوّف کی تعلیم نے اس رنگِ طبیعت کو اور چمکایا۔ زمانے کے حوادث نے اس کو نازک تر بنایا اور محبّت کی ناکامی نے خستگی، غمگینی اور دردمندی کے پہلوؤں کو ان کے دل و دماغ پر اس انداز سے کارفرما اور مستولی کر دیا کہ ان کے جہانِ شعری میں جاوداں درد و کرب کا جادو جاگ اُٹھا۔'' ۱۱۰

میؔر نے اپنی شاعری کو سچے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس میں جہاں سچے جذبات کا اظہار ہے۔ وہاں ان کی ناکامیِ محبت کے حقیقی تجربات بھی بیان ہوئے ہیں۔ مصنّف کا خیال یہ ہے کہ میؔر کے جو اشعار بہتر نشتر کے نام سے مشہور ہیں وہ ان کی ناکام محبّت کے حقیقی تجربات ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ان کے طرزِ نگارش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ یہ طرز سادہ، نرم اور میٹھے الفاظ کا خوب صورت امتزاج ہے۔ ان کی غزل دیگر تمام اصنافِ شعری سے بہتر ہے۔

''تاریخ زبان ادب اُردو'' صغیر احمد جان کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میؔر کو غزل کا بادشاہ کہا ہے، کیونکہ ان کی غزل اُردو شاعری کی تمام تر خصوصیات کے خوبصورت امتزاج کا نام ہے۔

ان کی مثنویات بھی اُردو ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں لیکن ان میں منظرنگاری کمزور ہے جب کہ میر حسنؔ کی مثنوی ''سحرالبیان'' میں کمال درجے کی منظرنگاری کی گئی ہے اور یہی چیز ان کو مثنوی کے میدان میں میر حسنؔ سے کم درجے پر لے جاتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں جو تغزل پایا جاتا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری میں کوئی اور شاعر سامنے نہ لا سکا اور:

> ''یہ حقیقت ہے کہ رنگِ تغزل کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے میرؔ نے برتا، اس کی مثال اُردو باوجود اس ترقی کے اب تک پیش نہ کر سکی۔ سوز و گداز، شیرینی، ملاحت، صداقت، جذبات وغیرہ غزل کی خصوصیات ہیں اور یہ خوبیاں کلامِ میرؔ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ عشق کی واردات کو اس حسن وصداقت سے بیان کرتے ہیں کہ تاثیر کی رو رگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے۔'' ۱۱۱

''تاریخِ نظم و نثر اُردو'' آغا محمد باقر کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی بڑی جامعیّت کے ساتھ لکھتے ہوئے انھوں نے ''ذکرِ میرؔ'' سے مدد لی ہے۔ ان کی عمر کا کوئی واضح تعیّن کرنے کے بجائے دیگر تذکرہ نگاروں، آزادؔ اور سکینہؔ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی عمر سے اختلاف بھی کیا ہے لیکن خود بھی حتمی رائے قائم نہیں کی کہ میرؔ کی عمر کتنی تھی۔ سیادت کے حوالے سے اعتراضات کو نظرانداز کرتے ہوئے میرؔ کو اصل نسل سیّد لکھا ہے۔ آزادؔ کے حوالے سے انھوں نے اس بات سے بھی اتفاق کیا ہے کہ میر پہلے سوزؔ کا تخلص تھا۔ ان کے کردار کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ صاحب انتہا درجے کے خوددار اور حسّاس تھے۔ امراء کے ارتباط کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بے حد وضع دار، کم گو اور آزاد طبیعت انسان تھے۔ افلاس نے انھیں اور زیادہ عالی ظرف بنا دیا تھا۔'' ۱۱۲

ان کے کلام کے حوالے سے مصنف کا خیال ہے کہ اس میں مایوسی اور درد ہے، کیونکہ ان کو جس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا، وہ نہایت نامساعد حالات تھے۔ میرؔ کی ایجادوں کا ذکر کرتے

ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ واسوخت، مربع اور مثلث کے وہ اردو میں موجد ہیں۔ انھوں نے فارسی تراکیب اور ان کے ترجمے اُردو میں داخل کیے۔ میرؔ کی شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ:

> ''ان کے اشعار سادہ، فصیح، دردانگیز اور دل کش ہیں۔ ان میں انتہا درجے کا ترنّم ہوتا ہے۔ وہ جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔'' ۱۱۳

میرؔ اور سوداؔ کا موازنہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شہرت غزلوں اور مثنویوں کی وجہ سے ہے جبکہ سوداؔ کی شہرت قصائد اور ہجویات کی وجہ سے ہے۔ یہ دونوں شاعر مزاج کے اعتبار سے ان اصناف کے لیے ہی موزوں تھے۔

''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' ڈاکٹر ابوسعید نورالدّین کی تصنیف ہے جس میں میرؔ کے مختصر حالاتِ زندگی کا جائزہ لینے کے بعد ان کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں درد و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو ان کی اپنی اُفتادِ طبع کے علاوہ تعلیم و تربیّت، زمانے اور ماحول کی وجہ سے تھا۔ اس لیے:

> ''میرؔ کی زندگی میں دنیا کا روشن پہلو کبھی نظر نہیں آیا۔ ہمیشہ تاریک پہلو سے سابقہ پڑتا رہا۔ اس لیے ان کے دل میں یاس وحرماں اور نااُمیدی کا سامان پیدا ہو گیا تھا۔ رنج وغم اور آلام و مصائب کا اظہار اور رونا دھونا ان کی طبیعت ثانی بن گیا تھا۔ ان کا کلام ان ہی ساری باتوں کا مرقّع ہے۔ اس لیے اس میں درد و سوز بھرا ہوا ہے۔'' ۱۱۴

میرؔ کو میر جعفر نامی شخص نے کچھ عرصہ پڑھایا اور سعادت علی امروہوی نے ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ ممکن ہے خان آرزوؔ سے بھی انھوں نے فیض حاصل کیا ہو، لیکن قیاس یہی ہے کہ میرؔ فطری اور خود رو شاعر تھے۔ غزل کا معیار ان سے قائم ہوا۔ ان کی شاعری میں وہ عالم گیر حُسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں ہے۔ انھیں اپنی شاعری پر ناز تھا اور ان کا

یہ ناز بجا تھا۔ ان کا کلام جن خصوصیات کا حامل ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ سادگی

۲۔ موسیقیّت

۳۔ سوز و گداز

۴۔ لطافت و پاکیزگی

۵۔ سہل ممتنع

۶۔ تغزّل

قصیدے کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ صنف ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھی۔ اس لیے انھیں قصیدہ گو شعراء میں شمار کرنا بے کار ہے لیکن مثنویوں میں ان کی بعض مثنویاں خوب ہیں۔

''اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ'' ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میر تقی میرؔ اُردو غزل کے سب سے بڑے استاد مانے جاتے ہیں۔ ویسے ان کے کلام میں مثنویات اور قصیدے بھی شامل ہیں لیکن وہ قصیدے کے مردِ میدان نہیں تھے۔ اس لیے قصیدے میں بالکل رسمی اور معمولی ہیں۔ مثنویاں انھوں نے البتہ بعض بہت اچھی کہی ہیں۔'' ۱۱۵

میرؔ کی زندگی آلام اور مصائب میں کٹی، ان کا کلام درد و غم کا مجموعہ ہے۔ اس لیے پڑھنے والے پر ایک حسرت کا عالم طاری ہوتا ہے اور اس کو تھوڑی دیر کے لیے دنیا کا سارا کارخانہ ایک دھوکا نظر آتا ہے۔ اس قسم کی شاعری زیادہ مفید نہیں ہوتی، اس سے طبیعت میں پس ماندگی اور فرار کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن یہ اس زمانے کے حالات اور ان کی زندگی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایسی زبان میں شاعری کی جسے سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔

''اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تصنیف ہے جس میں مجموعی طور پر اُردو شاعری کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو واضح کیا گیا ہے لیکن اس تمام بحث میں کہیں کہیں میرؔ کے کلام کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔ میرؔ کے ہاں ''دل اور دلّی'' کے حوالے سے مرثیے دوسرے شاعروں کی نسبت زیادہ ہیں۔ اگر چہ اُن کو غزل میں نمایاں مقام ملا لیکن اُردو مثنوی کے فروغ میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ:

> ''دکنی دور کے بعد شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے فروغ میں میرؔ کا
> بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اُردو مثنوی کا عبوری دور تھا اور میرؔ کی مثنویوں
> نے شمالی ہند میں اس صنفِ سخن کو مقبول بنانے میں بڑا کام کیا
> لیکن ان مثنویوں کا موضوع بھی غزل کی طرح زیادہ تر عشقیہ
> ہی ہے۔'' ۱۱۶

''اُردو زبان و ادب کا خاکہ'' ڈاکٹر خوشحال زیدی کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ اُردو غزل کے مسلّم الثبوت استاد ہیں۔ ان کی زندگی بے چارگی اور پریشان حالی میں گزری۔ اس لیے انھیں کبھی غموں سے فرصت نہ ملی۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے لیکن:

> ''ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود ان کی پریشانیوں،
> ناکامیوں اور نامرادیوں کے ان کے یہاں موت کا نغمہ یا مرگ کی
> تاریکی نہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی تڑپ اور لگن ہے۔'' ۱۱۷

میرؔ کی غزلوں کے اندازِ بیان اور لہجے نے صرف اپنے دور کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ان کا آج کے شعراء پر بھی گہرا اثر ہے۔ انھیں عشق سے عشق تھا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں مجازی عشق کی نمایاں جھلک ہے اور ان کے بہترین اشعار وہ ہیں جو سچے جذبات اور ناکام محبّت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ ان کے کلام میں نازک مزاجی کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی لطیف آمیزش ہے۔ شیرینی، صداقت، جذبات، سادگی، شگفتگی اور بانکپن ان کی غزل کی خصوصیات ہیں۔ وہ قنوطی

نہیں تھے، کیونکہ:

> ''قنوطی ہم اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے مایوس ہو چکا ہو، جس میں جدوجہد کا حوصلہ نہ ہو اور جس کی ذہنیت زندگی کے مقابلے میں شکست خوردہ ہو۔ ان معنوں میں میرؔ کو قنوطی کہنا بے سود اور بے بنیاد ہے، ان کی شاعری میں انسانیت کی اعلیٰ قدریں موجود ہیں، وہ شکست خوردہ نہیں۔'' ۱۱۸

میرؔ کا غم ذات کا غم نہیں بلکہ یہ بنی نوع انسان کا غم ہے جسے ہم غمِ کائنات کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہارے ہوئے انسان ضرور ہیں لیکن یہ ہار اُن کی نہیں بلکہ ایک زمانے کی ہار معلوم ہوتی ہے، انھوں نے کبھی زندگی کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ اس لیے ان کے ہاں غم اُٹھانے کا کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا گیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں انسان اور عشق کا بلند تصوّر پیش کرتے ہیں۔

''تعارف تاریخِ اُردو'' ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد مصنّف نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں الفاظ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ سادگی ان کی شاعری کا خاصہ ہے لیکن اس سادگی نے ان کی فصاحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مضامین کی جدّت کے ساتھ ساتھ تاثیر، نشتریت اور شیرینی کو بھی برقرار رکھا ہے، کیونکہ:

> ''الفاظ کا صحیح استعمال، فصاحت و سادگی، مضامین کی جدّت اور تاثیر خستگی، نشتریت، ملاحت، خالص تغزّل، زبان کی باوقار شیرینی آہنگ کی خوشگوار نرمی، پرخلوص جذبات و احساسات، نازک مزاجی خودداری، آلامِ عشق، غمِ روزگار، رنج و الم کی فراوانی، سوز و گداز درد و اثر، ذاتی تجربات و محسوسات، انفرادیت و اجتماعیت کا اشتراک ان کے کلام کی روح ہے۔'' ۱۱۹

میرؔ ایسے شاعر ہیں جن کی غزل تمام شعراء سے بہتر اور تمام خوبیوں کی حامل ہے لیکن ان کی

مثنویوں میں بھی سوز و گداز کے پہلو کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' سیّد احتشام حسین کی تصنیف ہے جس میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ میرؔ کی غزل ان کی دیگر اصنافِ شاعری سے بہت بہتر ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ آج تک غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کا شعر تیر کی طرح دل میں اُتر جاتا ہے۔ سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزا اور اتنی مٹھاس، اتنا زہر اور اتنی تلخی، دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری اور جذبات کا اتنا طوفانی جوش، تخلیقِ شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پراثر مرثیے بھی کہے ہیں مگر ان میں غزلوں کی طرح الم ناک فضا نہیں ہے۔ اس طرح انھوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ان کا معیارِ محبت واضح ہوتا ہے مگر بادشاہ وہ غزل ہی کے ہیں۔'' ۱۲۰

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا رجحان تاثراتی ہے البتہ وہ معاشرتی تنقید سے بھی کام لیتے ہیں۔

''اُردو اصناف کی مختصر تاریخ'' عطش درانی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر مختصر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں ان کا مرتبہ بلند ہے۔ تغزل کو انھوں نے جس سادگی سے نبھایا ہے یہ ان ہی کے حصے کی بات ہے اور:

> ''میرؔ کے کلام میں سب سے اہم عنصر مایوسی اور درد کا ہے۔ میرؔ اپنے ساتھ دردمند دل لے کر آئے تھے۔ انھیں سوائے رنج والم کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔'' ۱۲۱

"A History of Urdu Literature" رام بابو سکسینہ کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے اور ان کے خیال کے مطابق وہ نو عمری ہی میں اکبرآباد سے دلّی آ گئے اور آرزوؔ کے ہاں قیام پذیر ہوئے اور نواب آصف الدّولہ کے عہد میں دلّی سے لکھنؤ آ گئے اور وہ جب لکھنؤ آئے تو ایک سرائے میں قیام کیا اور ایک مشاعرے میں گئے جہاں پر پرانی وضع قطع کے لباس کی وجہ سے لوگ ان پر ہنسے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ میرتقی میرؔ ہیں تو انھوں نے معذرت کی۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدّولہ نے انھیں اپنے دربار سے وابستہ کر لیا لیکن میرؔ جلد ہی دربار سے الگ ہو گئے اور انھوں نے ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

فورٹ ولیم کالج کے لیے میرؔ کا انتخاب بطور مدرس زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ میرؔ کی عمر کے بارے میں مصنف نے وفات کے وقت ان کی اسّی سال کی عمر والی روایت سے اختلاف کیا ہے جبکہ سو سال کی روایت سے بھی کھل کر اتفاق نہیں کیا۔ ''آبِ حیات'' کے حوالے سے محمد حسین آزادؔ نے میرؔ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مصنّف نے کئی مقامات پر اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Azad, in his admirable but unfortunately occassionlly gossipy Ab - i - Hiyat has allowed certain misstatements to creep in. He has related anecdots and sayings of Mir illustrative of his ill-nature, supercilious temper, overweening conceit and uncritical attitude. He has also allowed himself to give currency to some incorrect statements on the authority of some of his all informed malicious contemporary writers in order to make the book entertaining he did not pause to verify his facts and stories." ۱۲۲

آزادؔ اور میرؔ کے متکبّرانہ پہلو کو جس انداز سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے اس کی تفصیلات بیان

کرنے کے بعد مصنّف میرؔ کی عزتِ نفس کے بارے میں جو احساس تھا اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"It is true that Mir had an overwhelming sense of self respect and was proud and sensitive by nature." ۱۲۳

تذکرے میں کئی جگہ پر شاعروں کے بارے میں ان کا رویّہ تلخ ہو گیا ہے۔ مصنّف نے آزادؔ کے تحقیقی کام کے بارے میں رائے دیتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' نہیں پڑھا اور زیادہ تر قدرت اللہ قاسمؔ کے تذکرے پر انحصار کرتے ہوئے دیگر لوگوں کے بیانات پر انحصار کیا ہے اور میرؔ کے جس طرح کے رویّے آزادؔ نے سامنے لانے کی کوشش کی ہے وہ میرؔ کی اصل تصویر نمایاں کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

مصنّف نے میرؔ کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ میرؔ کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے انھیں سوداؔ کے قصائد کے مقابلے میں کم درجے کے قصیدے قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"Mir has written a few qasidas which are not of a very high order and suffer in comparison with those of his rival Sauda." ۱۲۴

غزل کے بعد ان کی مثنویات کو بہت زیادہ شہرت ملی اور اردو ادب میں میرؔ کو واسوخت، مربع اور مثلث کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ میرؔ کو شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں کی وجہ سے ملی لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں کو میر حسنؔ کی مثنویوں کے مقابلے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ۱۷۵۲ء میں لکھا گیا جو اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری میں کئی چیزوں کو متعارف کرایا اور اس کے اصول وضع کیے جن کا اظہار انھوں نے اپنے تذکرے میں کر دیا۔

غزل میں میرؔ کو بلند درجے کا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کی تعریف کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں:

"Mir's sphere is the ghazal and in his domain he reigns superme. His verses are simple, eloquent, poignant, winged with pathos and

pain. They have the greatest appealing power and force. In the ardour of passion, in the melody and music, in the felicity of phrase, in the ecstasy of feeling, his ghazals rank the best in Urdu Literature." ۱۲۵

اردو ادب کی تاریخ میں میرؔ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھیں ''خدائے سخن'' کہا جاتا ہے اور غالبؔ اور ناسخؔ کے ساتھ ساتھ تمام شعراء نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں اردو غزل کے عظیم شاعر کے طور پر متعارف ہو چکے تھے۔

آخر میں میرؔ اور سوداؔ کا موازنہ کرتے ہوئے مصنّف نے دونوں کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے میدان میں انھیں لاثانی قرار دیا ہے جس طرح میرؔ کا غزل میں کوئی مقابل نہیں، اسی طرح قصیدہ اور ہجو میں سوداؔ کا کوئی مقابل نہیں ہے۔

"A History of Urdu Literature" ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ہے جس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فارسی زبان میں دلچسپی کے باوجود اُردو میں پذیرائی کا ذکر ہے۔ دلّی اُجڑنے کے بعد میرؔ لکھنؤ گئے، وہاں پر ان کی بڑی حد تک پذیرائی بھی ہوئی لیکن جب وہ لکھنؤ پہنچے تو دلّی کے حالات کے ساتھ ساتھ ذاتی حالات کا اثر اپنی شخصیت پر اس حد تک ثبت کر چکے تھے کہ معاشرے سے بیزار دکھائی دیتے تھے، کیونکہ انھیں معاشرے کی ہر اچھی قدر کی تباہی محسوس ہو رہی تھی اور اقدار کی تباہی کا برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی شاعری میں غم کے عنصر کے حوالے سے مصنّف لکھتے ہیں:

"For him the course of life and love did not run smooth, and his love lyrics are an expression of the grief, disappointments and pathetic yearnings consequent to it." ۱۲۶

انھوں نے اپنی شاعری کو درد و غم کا مجموعہ قرار دیا ہے لیکن ان کا یہ درد و غم ذاتی نہیں تھا بلکہ اس میں اپنے زمانے کی پوری روح سمٹ آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا غم ذات کے خول سے

نکل کر آفاقیّت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ بقول مصنّف:

"Mir's gloom is not all personal, it also reflects lime's sad decay." ۱۲۷

میؔر نے جو تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی، اس کا ذکر انھوں نے ''شہرآشوب'' میں کیا ہے۔ ''شہرآشوب'' سوداؔ کے لکھے گئے ''شہرآشوب'' سے کسی طرح کم درجے کے حامل نہیں ہیں۔ کیونکہ:

"His Shaihr Ashob also sheds light on the deplorable contemporary scene and should be studied side by side with Sauda's poems on the subject." ۱۲۸

انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے سادہ زبان استعمال کی ہے۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے اسی اندازِ بیان کو بہترین تصوّر کرتے ہیں۔

؎ شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور عوام سے گفتگو کرنے کے لیے سادہ زبان استعمال کرنا ضروری تھا اور:

"Mir's style is simple and bare even to nakedness there are some minds that cannot contemplate a thing without trailing a cloud of images. Mir shows little of his imagination fertility. He is neither allusive nor subtle whatever the nature of his thoughts, he can be expected to be straight forward." ۱۲۹

ڈاکٹر محمد صادق نے میؔر کی سادگی کو بالکل سپاٹ کہا ہے، حالانکہ ان کی شاعری میں صنائع بدائع بھی بہت زیادہ ہیں۔ انھوں نے مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن انھیں جتنی کامیابی غزل میں ہوئی، اتنی کسی اور صنف میں نہ ہوسکی۔ ان کے بہتر نشتروں کے بارے میں مصنّف لکھتے ہیں:

"We hear of his seventy two lancets or poignant lines, selected by his contemporaries.

We do not know, today, which they are. But it is possible to select probably a larger number of lines which will be accepted even by fastidious critics as meriting distinction." ۱۳۰

مصنف نے شیفتہ کے قول کے حوالے سے میر کے کلام کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے بلند درجہ اشعار بہت بلند درجے کے ہیں اور پست درجہ اشعار زیادہ پست ہیں۔

ڈاکٹر محمد صادق نے میر کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن وہ ان کی شاعری پر اعتراضات بھی کرتے ہیں، خصوصاً غم کے مضامین کے سلسلے میں ان کی آراء سے بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔

"An Outline of Urdu Literature"، Naz کی کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے میر کو سیّد ہی تسلیم کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میر کے والد کی وفات کے بعد ان کے سوتیلے بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اور وہ لکھنؤ سے دلّی آ کر آرزو کے پاس رہنے لگے جنھوں نے ان کے ذوقِ شعری کو نکھارا۔ لیکن خان آرزو سے مذہب کی بنیاد پر اختلافات پیدا ہوئے۔ میر نے دلّی کے شعراء میں جلد ہی مقام بنا لیا۔ دلّی کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے انھوں نے لکھنؤ آ کر پناہ لی۔ لکھنؤ کے پہلے مشاعرے میں انھیں تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ انھوں نے سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ میر کے قصائد سودا کے مقابلے میں کم درجے کے ہیں لیکن:

"In ghazal form Mir has no counter-part. He wrote straight from the heart, unaffected, spontaneous, pure with perfection of feeling expected only from a real true - to - life lover. He was perfect in his choice of rhyme, words and in the sentiments expressed." ۱۳۱

میر نے اُردو زبان میں شاعری کر کے ایک کم درجے کی زبان کو اس قابل بنا دیا کہ یہ دنیا کی قابلِ ذکر زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ میر کا انداز سادہ ہے کیونکہ:

"Mir's temperament was conditioned by his sad experiences or by the measure of sensitivity with which he viewed his experiences." ۱۳۲

اس کتاب میں میرؔ کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے جو غلطی پائی جاتی ہے، اس کے بارے میں تو یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے لیکن اس کے علاوہ میرؔ کے حالاتِ زندگی اور فن کے حوالے سے بھی روایتی باتیں ہی سامنے لائی گئی ہیں اور مکمل طور پر تحقیقی فیصلے صادر کرنے کی کوئی خاص کوشش ہمارے سامنے نہیں آتی۔ میرؔ کے بارے میں سرسری باتیں سامنے لا کر میرؔ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ فن اور فکر کے حوالے سے دھندلی سی تصویر ہی ہمارے سامنے لا سکا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں میرؔ کی عظمت کا اعتراف ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔

مجموعی جائزہ:

اگر جزوی کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ کی زندگی اور فن کے بارے میں جو بکھرا ہوا غیر مرتّب خاکہ بنتا ہے، وہ اس طرح سے ہے:

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب ''ولیؔ سے اقبالؔ تک'' کے مطابق میرؔ کے بارے میں ایک عام تاثر کہ ان کی شاعری میں فکر ونظر کا عنصر بہت کم ہے، غلط ہے، کیونکہ ان کی شاعری کو مجموعی طور پر سامنے رکھا جائے تو اس میں افکار و حقائق کا ایک معقول سرمایہ مل جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں حقائق کی دریافت اور ترتیب غالبؔ جتنی نہیں ہے لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو صرف استفہام تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ حقائق کا انکشاف و اثبات بھی کیا ہے۔ وہ جذباتی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ عقلی انداز کے بھی قائل ہیں۔ ''سخنور نئے اور پرانے'' کے مطابق جدید ذہن میرؔ کے کلام اور شخصیت سے زیادہ متاثر ہوا ہے، کیونکہ ان کے کلام میں ایسی سچائیاں ہیں جو مستقل اور پائیدار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید ذہن کو ان کے کلام میں دھندلی سی اپنی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'' کے مطابق ''نکات الشعراء'' اُردو شاعروں کا پہلا موجود تذکرہ ہے جس نے تذکرہ نگاری کی روایت پر گہرے اثرات مرتّب کیے۔ ''لطیفِ غزل'' کے مطابق میرؔ کا غم ذاتی ہونے کے باوجود کائناتی رنگ لیے ہوئے ہے اور اس غم کو انھوں نے رومانی انداز میں بسر کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیچر کے متعلق ان کا مشاہدہ محدود

نہیں تھا بلکہ انھوں نے تو مشاہدات پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان کے فن کو اگر دیکھا جائے تو وہ ایماء اور تفصیل کے خوبصورت امتزاج کو پیش کرتے ہیں اور ان کی اشاروں سے سمجھانے کی کوشش بھی گھمبیر معنویّت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتاب ''اردو شاعری میں المیہ تصوّرات'' میں میرؔ کے غمِ عشق، غمِ حیات اور غمِ کائنات پر بھرپور بحث کی گئی ہے۔ ان کے غم میں خلوص اور سچائی ہے اور اس غم کو انھوں نے صرف ناگزیر حقیقت ہی نہیں سمجھا بلکہ اس نے غم پر غالب آ کر زندگی نئے جوش اور جذبے کے ساتھ گزاری ہے۔

سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' کے مطابق صرف میرؔ ایسے شاعر ہیں جن کی اُستادی کا کوئی منکر نہیں ہے۔ ان کی شاعری سادہ اور دل نشین ہونے کے باوجود تیکھی ہے۔ ان کا غم ذاتی نہیں بلکہ کائناتی ہے۔ بے بسی اور بے چارگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں کھوئے ہوئے وقار کو پانے کا حوصلہ بھی ہے۔ دلّی میں انھیں بدامنی کا سامنا کرنا پڑا لیکن لکھنؤ میں معاشی فراغت کے باوجود ان کا مزاج اس فضا سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ عشق ان کے ہاں بحرِ بیکراں ہے۔ اسی وجہ سے کہ ان کی عشقیہ شاعری صرف جنسیات تک محدود نہیں بلکہ یہ ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لیے یہ شاعری، عظیم شاعری ہے۔

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کی کتاب ''میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ'' کے مطابق غالبؔ اور میرؔ کے ہاں فکری اور فنّی فاصلے اور امتیازات ہونے کے باوجود بہت سی خصوصیات مشترک بھی پائی جاتی ہیں۔ چونکہ ان دونوں شعراء کے شعری تناظر مختلف ہیں، اس لیے ان کے ذہنی رویّے اور فاصلے قربتوں سے زیادہ ہیں، لیکن میرؔ اپنے رنگ کے ایسے شاعر ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ''میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ'' میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا مطالعہ ''وحدت الوجود'' کے نقطۂ نظر سے کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ میرؔ بھی تصوّف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کی شاعری میں اس کے واضح اثرات موجود ہیں۔ میرؔ کی تربیت انتہائی صوفیانہ ماحول میں ہوئی جس کی وجہ سے ان کے شعری مزاج کی تشکیل میں تصوّف کا عمل دخل رہا۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں روحانیت کی تربیت اور اصلاح و ترقی کے ذریعے قربِ الٰہی اور عرفانِ ذات کی کوشش کے

ساتھ ساتھ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا باہم امتزاج، غمزدگی اور یاسیت کے باوجود اثباتی عناصر، تسلیم و رضا کی وجہ سے درد کی قبولیت، مئے خانے کا نقشہ اور کفر کی تمثیل کے لوازمات پائے جاتے ہیں۔

سیّد محی الدین قادری زورؔ کی کتاب ''تین شاعر'' کے مطابق میرؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی مثنویوں میں بھی ان کی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقاء اور ماحول کا عکس پایا جاتا ہے۔ اگر چہ مثنویاں انھوں نے عمر کے کسی خاص حصے میں نہیں لکھیں لیکن ان میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ان بحروں میں بھی مثنویاں لکھی ہیں جو عام طور پر اس کے لیے مروّج نہیں تھیں۔

Ralph Russell اور Khurshid-ul-Islam کی کتاب "Three Mughal Poets" میں میرؔ کی مثنویاں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ان کی مثنویوں کی خوبیوں کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مصنفین نے ان مثنویوں کے حوالے سے ان کی ذات اور سماج تک رسائی کی کامیاب کوشش کی ہے۔

D.J. Mathews , C Shakle اور Shahrukh Hussain کی مشترکہ کاوش "Urdu Literature" کے مطابق میرؔ اپنی شاعری میں حسّاس جذبات کی صحیح عکاسی کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کے بہتر نشتروں میں بہت سی خوبیوں کو تلاش کیا گیا ہے۔ محبّت اور خمریات سے متعلق ان کے تمام تر جذبات حقیقت پر مبنی ہیں جب کہ دیگر شعراء کے ہاں یہ باتیں صرف اظہار کی حد تک ہیں۔

Ralph Russell نے اپنی کتاب "The Pursuite of Urdu Literature" میں میرؔ کو اردو ادب میں محبّت کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میرؔ نے اپنی شاعری میں محبت کے جن تجربات کا ذکر کیا ہے، ان سے وہ خود بھی گزرے ہیں۔ ان کے ہاں پاگل پن اور شراب کی کیفیات محض علامت ہیں اُن کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی حسّاسیت کی وجہ سے آخری عمر میں ان کے ہاں انا کا جذبہ اُبھر کر سامنے آیا جس کی وجہ سے انھوں نے شاہانِ وقت کے ناروتے کا کُھل کر اظہار کیا ہے۔

ثناء الحق حقی کی کتاب ''میرؔ و سوداؔ کا دور'' کے مطابق میرؔ غزل، مثنوی اور واسوخت میں نمایاں مقام کے حامل ہیں جب کہ ان کی دیگر اصنافِ شاعری بھی تعریف کے قابل ہیں لیکن انھیں شہنشاہ صرف

غزل کا ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''کلاسکی ادب'' کے مطابق میؔر کی سیرت کا جائزہ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ انھوں نے ان کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے قائم کردہ اس تاثر کو غلط قرار دیا ہے کہ وہ کم اختلاط اور خلوت پسند آدمی تھے۔ وہ میلوں اور عرسوں میں شرکت کرتے اور اپنے گھر پر مشاعرے کرواتے تھے۔ وہ عاشق مزاج اور حسن پرست تھے۔ دوستوں سے مل کر بیٹھتے اور ہنسی خوشی کی باتیں کرتے تھے۔

الطاف حسین حاؔلی کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے مطابق میؔر کے ہاں دھیمے لہجے میں جوش پایا جاتا ہے۔ وہ معمولی خیالات جو صدیوں سے شاعری کا حصہ ہیں۔ سادگی اور صفائی کے ساتھ نرالے اسلوب میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی مثنویاں نتیجہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے پاک ہیں۔

امداد امام آؔثر نے ''کاشف الحقائق'' میں انھیں ''سلطان المتغزلین'' لکھتے ہوئے جہاں پر ان کے کلام میں بہت سے کلام کو ترک کر دینے کے قابل گردانا ہے وہاں پر اچھے اشعار سے ایک اچھا خاصا دیوان مرتب کرنے کی بات بھی کی ہے اور یہ انتخاب ایسا ہوگا جس سے خوبصورت کلام اردو ادب میں دستیاب نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل لکھتے وقت وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

محمد حسن عسکری کی کتاب ''وقت کی راگنی'' کے مطابق میؔر کے تصوّرات ایک نظر دیکھنے سے عام سے لگتے ہیں لیکن جب ذرا غور کیا جائے تو ان میں بڑی انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کے حوالے سے جانچتے ہوئے اپنی خامیوں کو بڑی جرأت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو طنز ہے وہ نفرت اور مایوسی کا حامل نہیں بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی سے قطعاً مایوس نہیں اور غم کا شاعر ہونے کے باوجود دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔

ناصؔر کاظمی کی کتاب ''خشک چشمے کے کنارے'' کے مطابق نئے زمانے کی عورت کے اگر بال

نہ کٹے ہوئے ہوں تو یہ وہی عورت ہے جو ان کے زمانے میں تھی اور جس کا وجود میرؔ کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان نامساعد حالات کا جاننا ضروری ہے جن سے انھیں گزرنا پڑا۔ ان کے ہاں عاشق اور معشوق کے تعلقات انسانی سطح پر ہیں۔عشق کے ذاتی تجربے کو وسعت دے کر انھوں نے کائناتی رنگ دیا ہے۔ مذہب کے حوالے سے وہ دردمندی، آدمیّت اور انسانی محبّت کے متلاشی ہیں۔ میرؔ کا امیج تخلیقی ہے۔ ان کے ہاں احساس وفکر، شیر وشکر ہو کر سامنے آئے ہیں۔ جتنا ان کی تقلید کرنا مشکل ہے، اتنا ہی ان کی تقلید سے روگردانی کرنا مشکل ہے، کیونکہ انھوں نے تمام امکانات کو اُردو شاعری میں اظہار دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب ''اُردو شاعری کا فنّی ارتقاء'' میں سیّد ولی الرحمٰن، ولؔی کے مضمون کے حوالے سے شاہ مبارک کو اُردو کا پہلا واسوخت لکھنے والا ثابت کیا گیا ہے جبکہ عام طور پر میرؔ کو اُردو کا پہلا واسوخت لکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔

''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ہے جس کے مطابق میرؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں جو شاعری کے علاوہ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نظری تنقید کے مباحث بھی ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ خیال کہ وہ خشک مزاج، مردم بیزار اور افسردہ طبیعت تھے۔ ''نکات الشعراء'' کے مطالعے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

حنیف نقوی کی کتاب ''شعرائے اُردو کے تذکرے، نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک'' کے مطابق ''نکات الشعراء'' کے متداول نسخے کے علاوہ بھی اس کا کوئی نسخہ موجود تھا جس میں شاعروں کی تعداد متداول نسخے سے زیادہ تھی۔ اس میں میرؔ کی ولؔی کے بارے میں یہ رائے کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور ہیں، موجود تھی۔ اپنے تذکرے میں حالاتِ زندگی لکھتے وقت انھوں نے کئی جگہوں پر سہل پسندی اور سطحیت سے کام لیتے ہوئے بقدرِ ضرورت توجہ نہیں دی لیکن پھر بھی ''نکات الشعراء'' کی شہرت اور مقبولیت، سیرت اور شخصیت کے مرقعوں کی وجہ سے ہے، اس تذکرے میں میرؔ نے شعراء کے ساتھ اختلاف کے باوجود ان کی تعریف کی ہے۔ انھیں صرف چند واقعات کی بنیاد پر بددماغ کہنا ناانصافی ہے لیکن بعض لوگوں کے ساتھ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ زیادتیاں بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے شعراء کے

بارے میں جو آراء دی ہیں وہ شاعری کے بنیادی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے لسانی اور فنّی ضابطوں کے ساتھ دی ہیں۔

مجنوں گورکھ پوری کی کتاب ''نقوش و افکار'' کے مطابق میؔر کو شخصی اور اجتماعی ہر دو حوالوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ شائستگی کے ساتھ اپنے زمانے کے کرب و اضطراب کو ظاہر کرتے ہیں۔ تصوّف ان کے ہاں صرف روایت کا حصہ ہے۔ وہ یاس پرست انسان نہیں تھے، کیونکہ ان کے لہجے میں بغاوت کا مہذّب اور پُرتمکنت احساس ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈہ نہیں بننے دیا۔ ان کے ہاں جرأتِ مردانہ ہے۔ اس لیے شکست پر شکست کھانے کے باوجود ان کی شاعری میں فتح کا احساس ہے۔ غم ان کے زمانے کا مزاج تھا جسے انھوں نے مقدر کی طرح تسلیم کیا۔ اسی لیے انھوں نے درد کو سرور اور الم کو نشاط بنا دیا۔ ان کی شاعری سنجیدگی، توازن، شائستگی اور سلیقہ سکھاتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی کی کتاب ''اصنافِ ادب'' کے مطابق میؔر کی زبان غزل کی زبان ہے، کیونکہ غزل کی زبان سادہ، سلیس اور شستہ ہوتی ہے اور یہ خوبیاں ان کی زبان میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ''تنقیدی تجربے'' کے مطابق میؔر فنِ شعر کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کی زندگی غم تھی جس کے اظہار کو وہ شاعری سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں خلوص شعر کی بنیادی شرط ہے۔ اسلوب اور طرزِ کلام بلندیوں تک اس وقت پہنچتا ہے جب اس میں سنوری ہوئی کیفیت اور رچا ہوا احساس ہو۔ انھوں نے جدّت کے ساتھ روایت کی صحیح پاسداری کی ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کے تمام تقاضے پورے کرتے ہیں۔ انھوں نے فنِ شعر پر صرف نظری مباحث ہی نہیں کیے بلکہ انھیں عملی طور پر اپنے شعروں میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ''شاعری اور شاعری کی تنقید'' کے مطابق میؔر سرتاپا درد و غم اور رنج و الم ہیں۔ آفاقیت اور عمومیّت ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیات ہیں۔ وہ بہ ظاہر دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں زندگی سے قریب ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب کی حیثیت فعالی ہے لیکن وہ خود نمایاں نہیں ہے۔ ان کے ہاں تصوّف کے اثرات کی وجہ سے جگہ جگہ پر عشق کا حقیقی تصوّر بھی موجود ہے لیکن مجموعی میلان دنیاوی عشق کی طرف ہے۔ ان کے ہاں تغزّل کے ساتھ ساتھ فکر کا پہلو بھی

موجود ہے جس کا مآخذ تصوّف ہے۔ انھوں نے معاملات و مسائل اور افکار و خیالات نئے پیش نہیں کیے لیکن انھیں زندگی سے ہم آہنگ ضرور کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں تجربے اور روایت کو ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی اور فن کا خوبصورت امتزاج پیش کیا گیا ہے۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کی کتاب ''مرآۃ الشعراء'' میں جہاں پر میر کے کلام کی خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے وہاں پر ان کے کلام میں رطب و یابس کا ذکر کرتے ہوئے ایسی شاعری کو شاعری کے زمرے میں شامل کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔

عبدالرحمٰن طارق کی کتاب ''فردوسِ معانی'' میں میر کے عارفانہ اور صوفیانہ کلام کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے میر کے کلام میں معرفت، دل ذریعۂ معرفت، دلداریٔ خلق، جہادِ نفس، شانِ عبودیّت، تسلیم و رضا، بے ثباتیِ دنیا، اخلاقیات اور فلسفۂ عمل جیسی صفات کی نشاندہی کی ہے۔

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی کتاب ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے مطابق میر کی شاعری اپنے انفرادی رنگ کے باوجود دہلوی شاعری کا عام انداز لیے ہوئے ہے جو لکھنوی شاعری سے مختلف ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ لکھنؤ ہجرت کر گئے لیکن اپنے اصلی رنگ سے انحراف نہ کر سکے۔

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی کتاب ''جدید اُردو ادبیات'' کے مطابق میر اپنے کلام کو منتخب کر کے لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکے۔ ان کے ہاں خیال اور بیان دونوں میں سادگی ہے اور اُن کی غزلیں ان کے حال کی آئینہ دار ہیں۔

''تجربے اور روایت'' میں ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی نے ان کی شاعری کو رمزیہ اور ایمائی انداز کی حامل قرار دیتے ہوئے اپنے عہد اور ماحول کی ترجمان قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی کتاب ''دلّی کا دبستانِ شاعری'' کے مطابق میر کی شاعری تاثیر کے لحاظ سے بہترین شاعری ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی میں معتدل راہ نکالی۔ دہلویّت کا جزوِ اعظم درد و اثر ہے اور یہی ان کا کمالِ فن ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب ''اُردو غزل'' کے مطابق میر کی غزل اپنے اندر نمائندہ غزل کی تمام خصوصیات رکھتی ہے۔ یہ مجازی رنگ کی حامل ہونے کے باوجود پستی یا ہوس کی طرف راغب نہیں کرتی۔

''اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ'' میں خواجہ منظور حسین نے میرؔ کے کلام سے سیاسی، سماجی اور معاشی شعور کو دریافت کیا ہے۔

امیر حسن نورانی نے ''اُردو کے چاند تارے'' میں میرؔ کی شاعری کو سادہ اور صنعتوں سے پاک قرار دیا ہے اور ان کے کلام میں سوز و گداز، روانی اور تاثیر کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی کتاب ''بارہویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول'' کے مطابق میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں شعراء کے متعلق متعصبانہ آراء بھی دی ہیں جیسے محمد یار خاکسارؔ کے متعلق اُن کی رائے سے ظاہر ہے۔

ایم نذیر تشنہؔ کی کتاب ''اُردو ادب کا ارتقاء'' کے مطابق میرؔ کی غزل پورے عروج پر ہے۔ ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ بزمِ طرب کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے اور خارجی حالات نے ان کی غزل میں المیہ لہجہ پیدا کیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ''اُردو میں قطعہ نگاری'' میں میرؔ کی قطعہ نگاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے قطعات بعض بہت اچھے، بعض اچھے اور بعض معمولی ہیں۔ ڈاکٹر ناہید کوثر کی کتاب ''اُردو شاعری کا ارتقاء'' کے مطابق میرؔ کی شاعری عوام کے لیے ہے اور اس کا لب و لہجہ بھی عوامی ہے۔

ڈاکٹر ساجد امجد کی کتاب ''اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات'' کے مطابق میرؔ نے غزل میں اپنے عہد کی روح کو سمو کر رکھ دیا ہے۔ ان کی تہذیب کا مرکز و محور تصوّف تھا جو عشق کی بنیاد پر قائم تھا۔ ان کے ہاں خمریات، عشق کی رسمی تصویریں اور امرد پرستی کے مضامین کی کثرت ایرانی تہذیب کی وجہ سے ہیں۔ وہ صرف غزل کے شاعر تھے۔ ان کے ہاں دیگر اصنافِ سخن غزل ہی کی توسیع ہیں۔

جمیل احمد کی کتاب ''اُردو شاعری پر ایک نظر'' کے مطابق میرؔ کا اصل رنگ غزل گوئی میں ظاہر ہوا ہے جو غیرت و خودداری، عارفانہ رنگ، خمریات، فلسفہ کی آمیزش، ندرتِ بیان، لطافتِ خیال، حسنِ تشبیہ، روزمرہ اور محاورہ کی خوبصورت آمیزش کا نمونہ ہے۔ انجم اعظمی ''ادب اور حقیقت'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کا لہجہ اُردو کا سب سے نرم، مانوس، دل گداز اور باوقار لہجہ ہے۔ ان کے ہاں ایک ناکامی کے بعد دوسری ناکامی کے لیے جدوجہد کا تسلسل ہے۔ اس لیے ان کا درد و غم گل دستے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے ''آئینۂ سخن فہمی'' میں میرؔ کے شعر میں حشویات کی نشان دہی

کرتے ہوئے ان کے شعر کی اختصاری صورت بھی پیش کی ہے۔ سید مرتضیٰ زیدی نے ''تنقیدی ادب'' میں میرؔ کے کلام میں مشاہدے کی گہرائی، بول چال کا انداز، دردمندی، موسیقیت، تصوف، مصوری، حسن وعشق اور انسان دوستی جیسی خصوصیات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

پروفیسر خالد ندیم نے ''میرؔ سے فیضؔ تک'' میں میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے متعلق بھی آراء دی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق میرؔ کو آرزوؔ کے رویّے نے تکلیفیں دیں اور ان کی شاعری کو عروج دلّی میں نصیب ہوا۔ فرزانہ سیّد نے ''نقوشِ ادب'' میں ان کو مسلّم الثبوت شاعر تسلیم کرتے ہوئے ان کی شاعری کو المیہ شاعری قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میرؔ کی زبان سلجھی ہوئی زبان ہے اور وہ ذاتی حوالوں کو کائناتی وسعت دیتے ہیں اور ان کا انداز کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ سیّد مرتضیٰ حسین موسوی نے ''مشاعرہ عالمِ ارواح'' میں ایک تخیلاتی مشاعرے کے حوالے سے میرؔ کی شاعری کی خصوصیات سہل ممتنع، نادر تشبیہات، لطیف استعارات، حسنِ تعلیل اور واقعیّت کو واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر عارف بٹالوی نے ''جنت میں مشاعرہ'' میں ایک اچھوتے انداز سے میرؔ شناسی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی شاعری کو ''آہ'' اور سوداؔ کی شاعری کو ''واہ'' قرار دیا ہے۔ ''سفینۂ ادب'' میں پروفیسر حمید احمد خان کے خیال کے مطابق میرؔ کی شاعری میں سوز وگداز ان کی طبیعت کا خاص رنگ ہے۔ غمِ عالم کے علاوہ عشق ومحبّت اور تصوّف ان کی شاعری کے اہم موضوع ہیں۔

کلیم الدّین احمد ''اُردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی قوتِ حاسہ محدود اور مخصوص تھی اور ان کے جذبات وتصوّرات میں تنوّع نہیں پایا جاتا۔ وہ عشق کو باعثِ نشاط نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس کا حاصل یاس انگیز ہوتا ہے۔ میرؔ کی غزلوں کے مضامین پامال مضامین ہیں لیکن اس کے باوجود اثر کے حامل ہیں۔ وہ ایک کامل مصوّر ہیں جو خارجی اور باطنی تصویریں حسن وخوبی سے کھینچتے ہیں۔ ان کے کلام میں ناگوار ناہمواری موجود ہے۔ ان کے ہاں اصل عشق، عشقِ مجازی ہے جب کہ عشقِ حقیقی رسماً ہے۔

سیّد آغا حیدر کی تصنیف ''مطالعہ آبِ حیات'' میں آزادؔ کی تحقیقی کمزوریوں کا دفاع کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے کہ ''نکات الشعراء'' آزادؔ نے دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ''نکات الشعراء'' کا اصل نسخہ ان کے سامنے تھا جب کہ

متداول نسخے میں ترامیم کی گئیں ہیں۔

سیّد امداد امام آثر نے ’’کاشف الحقائق‘‘ میں میر کی غزل کو داخلیت کی حامل قرار دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں دل گرفتگی، محزونی اور نشتریت ہے۔ ان کی شاعری کا انداز ایسا ہے جس کا آج تک کوئی شاعر تتبع نہیں کر سکا۔ حکیم عبدالحیی کی کتاب ’’گلِ رعنا‘‘ میں میر کی نازک مزاجی اور بددماغی سے متعلق آزاد کے الزامات کو ردّ کرتے ہوئے انھیں مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضع دار آدمی قرار دیا گیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میر نے سو برس عمر پائی اور فورٹ ولیم کالج میں ان کا انتخاب عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب ’’شعرالہند‘‘ میں میر کے ہاں عاجزی کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی غزل کو تغزل کی حامل قرار دیا ہے لیکن ان کے قصائد سودا سے پست درجے کے ہیں جب کہ ان کی مثنویاں ابتداء ہی سے عام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ’’تاریخ ادبِ اُردو‘‘ کے مطابق میر نے ساری زندگی غموں میں بسر کی اور اسی کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کے غم کی نوعیت ذاتی سے بڑھ کر آفاقی ہے۔ ان کی شاعری میں احساس اور جذبے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ عشق ان کے ہاں ذاتی حوالے سے بھی ہے اور کائناتی حوالے سے بھی ہے۔ ان کی شاعری میں انسان اور انسانی رشتوں کا گہرا شعور ہے۔ میر کی غزل کی زبان عام بول چال کی زبان ہے لیکن اس میں تخلیقی شعور ہے۔ یہ زبان فارسی زبان کے زیرِسایہ نہیں بلکہ یہ ان کی اپنی خاص زبان ہے جس نے فارسی زبان کی حاکمیت کو ختم کیا۔ غزل میں ان کا مقام بلند ہے لیکن دیگر اصنافِ شاعری میں انھیں اتنا بلند مقام نہ مل سکا۔

’’تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند‘‘ میں شامل ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے لکھے ہوئے مقالے کے مطابق میر کے قصائد اس اہمیت کے حامل نہیں ہیں جس اہمیت کی حامل اُن کی غزل ہے۔ وہ دردمند دل لے کر آئے تھے جس نے ان کی زبان کو سادہ اور دردمند بنا دیا۔ ان کی مثنویاں کمزوریوں کے باوجود بڑی خصوصیات کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت اور زندگی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کا ذاتی غم اور کائناتی غم آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ وہ زندگی کو گوہرِ گرامی سمجھتے ہیں۔ ان کا تصوّرِ زندگی تصوّرِ موت کے بغیر نامکمل ہے۔ خدا کی بحث میں وہ صوفیاء کے عام عقائد کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ میر نے

جو کچھ محسوس کیا ہے، اسے فن کا سہارا لے کر بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے سچّی کیفیاتِ قلبی کو سادہ اور موثر زبان میں بیان کر کے شاعری کو ایسا نمونہ دیا ہے جس کی کامیاب تقلید کوئی نہیں کر سکا۔

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کے مطابق میرؔ کی شاعری داخلی واردات اور پریشان حال دور کی سماجی صورت کا آئینہ ہے۔ انھوں نے ذات کے حوالے سے کائناتی تجربات بیان کیے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے وہ بھی صوفی شاعر تھے لیکن انھوں نے تصوّف کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ انھوں نے سادہ زبان استعمال کی جو صداقت اور معصومیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب ''تاریخ ادبِ اُردو'' کے مطابق میرؔ اور غم لازم وملزوم ہیں لیکن اس کے علاوہ ان کے ہاں نشاطیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ غزل میں انھیں بلند مقام حاصل ہے جب کہ مثنویاں فنی کمزوریوں کے باوجود اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے مطابق میرؔ کی زندگی تضادات کا شکار رہی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہوا۔ انھوں نے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے سادہ ترین زبان استعمال کی۔ اگرچہ انھوں نے مثنوی کی صورت میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان کا سارا زور غزل پر صرف ہوا ہے۔ ان کی شاعری سہل ممتنع، جذبے کے رچاؤ اور احساس کی گھلاوٹ کا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین کی کتاب ''مختصر تاریخ ادبِ اردو'' کے مطابق خان آرزوؔ کے برتاؤ نے میرؔ کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کے مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی جو ان کی بددماغی کا سبب بنی۔ غزل میں ان کا پایہ ہر شاعر سے بلند ہے جس میں انھوں نے تغزّل کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ وہ اُردو میں واسوخت کے موجد ہیں۔ محمود بریلوی ''مختصر تاریخ ادبِ اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ ہے اور غزل میں کوئی شاعر ان تک نہیں پہنچ سکا۔

نسیم قریشی ''اُردو ادب کی تاریخ'' میں بیان کرتے ہیں کہ میرؔ واسوخت کے موجد ہیں لیکن اردو ادب میں ان کا مقام غزل کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سچے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی زبان سادہ، نرم اور میٹھے الفاظ کا خوبصورت امتزاج ہے۔ صغیر احمد جان کی کتاب ''تاریخ زبان ادب اردو'' کے مطابق میرؔ کی غزل اُردو شاعری کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ ان کی

مثنویاں بھی اہم مقام رکھتی ہیں لیکن ان میں منظر نگاری کمزور ہے۔

آغا محمد باقر کی کتاب ''تاریخ نظم و نثر اردو'' کے مطابق میؔر بے حد وضع دار، کم گو اور آزاد طبیعت انسان تھے۔ ان کے کلام میں مایوسی اور درد ہے۔ وہ واسوخت، مربع اور مثلث کے اردو میں موجد ہیں۔ ان کے اشعار جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تصنیف ''تاریخ ادبیاتِ اُردو'' کے مطابق میؔر کے کلام میں درد و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور انھیں زندگی میں دنیا کا روشن پہلو کبھی نظر ہی نہیں آیا۔ وہ فطری اور خود رو شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں عالم گیر حسن ہے۔ سادگی، موسیقیّت، سوز و گداز، لطافت و پاکیزگی، سہل ممتنع اور تغزل ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ''اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ'' کے مطابق میؔر اردو غزل کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ ان کی زندگی آلام و مصائب میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں درد و غم ہے۔ ان کی شاعری کی زبان سہل ممتنع کی حامل ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی کتاب ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' کے مطابق میؔر کے ہاں دل اور دلّی کے حوالے سے مرثیے بہت زیادہ ہیں۔ ان کو غزل میں نمایاں مقام ملا لیکن مثنوی کے فروغ میں بھی ان کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی کی کتاب ''اردو زبان و ادب کا خاکہ'' کے مطابق میؔر اردو غزل کے مسلّم الثبوت استاد ہیں۔ ان کی زندگی پریشان حالی میں گزری جس کا عکس ان کی شاعری میں ہے۔ اُن کے لہجے نے ہر دور کی شاعری کو متاثر کیا۔ ان کا غم ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ کائناتی بھی ہے۔ وہ قنوطی ہرگز نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری میں انسان اور عشق کا بلند تصور پیش کیا۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی کتاب ''تعارف تاریخ اردو'' کے مطابق سادگی میؔر کی شاعری کا خاصہ ہے جس نے ان کی فصاحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کیا۔ وہ بے نظیر غزل گو ہیں اور ان کی مثنویوں میں سوز و گداز کا پہلو قابلِ تعریف ہے۔ مضامین کی جدّت، تاثیر، نشتریّت اور شیرینی جیسی صفات ان کی شاعری کی روح ہیں۔

سیّد احتشام حسین کی کتاب ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' کے مطابق میرؔ کی غزل ان کی دیگر اصنافِ شاعری سے بہت بہتر ہے۔ انھوں نے سادہ زبان میں شعر کہے لیکن یہ شاعری تمام خوبیوں کی حامل ہے۔ عطش درّانی کی کتاب ''اردو اصناف کی مختصر تاریخ'' کے مطابق غزل میں میرؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور انھوں نے تغزّل کو سادگی سے نبھایا ہے۔

رام بابو سکسینہ کی کتاب "A History of Urdu Literature" کے مطابق آزادؔ کی میرؔ کے متعلق آراء صحیح نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''نکات الشعراء'' ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ میرؔ کی زندگی درد سے معمور تھی۔ ان کی شہرت غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ غزل گوئی میں وہ تن تنہا حکمران ہیں۔ سادگیِ الفاظ، سلاستِ زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوّف ان کی شاعری کی خوبیاں ہیں۔ ان کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے۔

"A History of Urdu Literature" ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ہے جس کے مطابق میرؔ کی شاعری درد وغم کا مجموعہ ہے لیکن ان کا یہ درد وغم ذاتی نہیں بلکہ اس میں زمانے کی پوری روح سمٹ آئی ہے۔ ان کے ''شہر آشوب'' سوداؔ کے ''شہر آشوب'' سے کسی طرح کم درجے کے نہیں ہیں۔ انھوں نے شاعری کے لیے سادہ زبان استعمال کی ہے۔ ان کے ہاں جو سادگی پائی جاتی ہے، وہ بالکل سپاٹ ہے۔ اگرچہ انھوں نے مختلف اصناف میں شاعری کی ہے لیکن انھیں سب سے زیادہ کامیابی غزل میں ہوئی۔ ان کی بلند درجے کی شاعری بہت بلند درجے کی ہے جب کہ پست درجے کی شاعری زیادہ پست درجے کی ہے۔

"An Outline of Urdu Literature" میں Naz نے میرؔ کو غزل کا بے مثل شاعر قرار دیتے ہوئے ان کی غزل کو احساسات کی ترجمان قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قصائد میں سوداؔ کو ان پر برتری دی ہے۔ Naz نے اپنی کتاب میں میرؔ کے متعلق مشہور واقعات کا ذکر کر کے ان کی روایتی تصویر کو پیش کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا پہلو سامنے لا کر حتمی فیصلہ صادر کرنے کی کوشش نہیں کی۔

جزوی کتب کے حوالے سے ''میرؔ شناسی'' کی کوششوں کو دیکھا جائے تو میرؔ کے بارے میں تحسینی رویّے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ہمیں تردیدی رویّہ بھی نظر آتا ہے۔ تحسینی رویّے کے سامنے

تردیدی رویّہ نہ تو مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہے اور نہ ہی اس رویّے کے حامل لوگوں کے پاس اتنے مضبوط دلائل ہیں جو ان کی بات کو منوانے کے لیے کافی ہوں۔

میرؔ کی ذات اور فن کے حوالے سے مختلف جہات سامنے آنے کے بعد میرؔ کی جو تصویر بنتی ہے، اس کے مطابق:

۱۔ میرؔ ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔

۲۔ ان کے والد کا نام میر محمد علی اور خطاب علی متقی تھا۔

۳۔ میرؔ سیّد خاندان کے فرد تھے۔

۴۔ ان کی زندگی میں مشکلات بہت زیادہ تھیں جن کا انھیں سامنا کرنا پڑا۔ لکھنؤ آنے کے بعد انھیں قدرے مالی آسودگی نصیب ہوئی۔

۵۔ ان کی ذات میں خودداری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

۶۔ ان کی وفات ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔

جزوی کتب کی روشنی میں ان کی فنی تصویر کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ نے ابتدائی عمر میں شاعری شروع کر دی۔

۲۔ ان کی شاعری ان کی ذات کی آئینہ دار ہے۔

۳۔ غزل میں ان کا کوئی شاعر مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۴۔ وہ مثنوی کے بھی بہترین شاعر ہیں لیکن یہ مثنویاں فنی کمزوریوں کی بھی حامل ہیں۔

۵۔ سہل ممتنع ان کی شاعری کی نمایاں خوبی ہے۔

۶۔ میرؔ کی غزل میں اعلیٰ پائے کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۷۔ غزل اور مثنوی کے علاوہ دیگر اصنافِ شاعری میں وہ کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔

۸۔ ''نکات الشعراء'' اردو شاعروں کا پہلا دستیاب تذکرہ ہے جو تذکرہ نگاری کی روایت پر بہت زیادہ اثرانداز ہوا۔

میرؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ردِّ میرؔ کا رویّہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے جس کے مطابق میرؔ کے سیّد ہونے پر شکوک وشبہات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں آرزوؔ کا احسان فراموش قرار دیا گیا ہے۔ ''ذکرِ میرؔ'' کے حوالے سے انھوں نے جو کچھ اپنی ذات کے بارے میں لکھا ہے، اسے جھوٹ قرار دیتے ہوئے ان کے ذہن کی اختراع قرار دیا گیا ہے اور فن کے حوالے سے ان کی شاعری کو رطب و یابس کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ میرؔ شکنی کا رویّہ، ''میرؔ شناسی'' کے رویّے کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ردِّ میرؔ کے حوالے سے سامنے آنے والے نقادوں کے پاس اتنے مضبوط دلائل بھی نہیں ہیں کہ اُن کی تمام باتوں کو سچ تسلیم کرلیا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ولی سے اقبال تک، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، طبع چہارم ۱۹۷۶ء، ص۶۴

۲۔ ایضاً، ص۹۳

۳۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مباحث، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۶۵ء، ص۲۱۸

۴۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سخنور، نئے اور پرانے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۹

۵۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ جدید لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۵۲ء، ص۲۰۔۲۱

۶۔ ایضاً، ص۲۴

۷۔ ایضاً، ص۳۵

۸۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، طیفِ غزل، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی لاہور، طبع پنجم ۱۹۴۸ء، ص۵۳

۹۔ ایضاً، ص۸۷

۱۰۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اردو شاعری میں المیہ تصوّرات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۷۸

۱۱۔ ایضاً، ص۸۰

۱۲۔ ایضاً، ص۹۵

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص۱۱۲

۱۵۔ سردار جعفری، پیغمبرانِ سخن، مکتبہ اردو ادب لاہور، س ن، ص۹۱

۱۶۔ ایضاً، ص۱۲۸

۱۷۔ ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف، میر، غالب اور اقبال، بیکن بکس ملتان، ۱۹۹۱ء، ص۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص۴۵

۱۹۔ ایضاً، ص۴۷

۲۰۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، میر، غالب اور اقبال، دوست پبلیکیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص۲۳

۲۱۔ ایضاً، ص۲۸

۲۲۔ ایضاً، ص۵۷

۲۳۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ، ص ۶۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۸۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۸

۲۷۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، تین شاعر، صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۹

30- Ralph Russell, Khurshidul Islam, Three Mughal Poets, George Allen and Unwin Ltd London, 1968, P 95 - 96.

31- - do -, P 139

32- - do -, P 148

33- - do -, P 203

34- - do -, P 234

35- - do -, P 259

36- D. J. Mathews, CShakle, Shahrukh Hussain, Urdu Literature, Urdu Markaz London, 1995, P 49

37- Ralph Russell, The Pursuit of Urdu Literature, Zed Books London, 1992, P 54

38- - do -, P 55

39- - do -, P 60

40- - do -, P 62

۴۱۔ ثناء الحق حقی، میرؔ و سوداؔ کا دور، ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۲۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۲۲

۴۳۔ خواجہ احمد فاروقی، کلاسکی ادب، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۳۷

۴۴۔ الطاف حسین حالیؔ، مقدمہ شعر و شاعری، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۹۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۴۶۔ محمد حسن عسکری، وقت کی راگنی، مکتبہ محراب لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰۹

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۴۸۔ ناصر کاظمی، خشک چشمے کے کنارے، مکتبۂ خیال لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۵۵

۴۹۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۹۸۔۹۹

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۵۱۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۴۔۱۸۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۵۳۔ مجنوں گورکھپوری، نقوش و افکار، صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۳۔۲۴

۵۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۴

۵۶۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، تنقیدی تجربے، اردو دنیا لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۵

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۵۸۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، شاعری اور شاعری کی تنقید، اردو دنیا کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۶۳۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ الشعراء (جلد اوّل)، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، س ن، ص ۱۹۵

۶۴۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۶۵۔ عبدالرحمٰن طارق، فردوسِ معانی، ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۶۷

۶۶۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، غضنفر اکیڈمی کراچی، اشاعت ثانی ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۵

۶۷۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جدید اردو ادبیات، فیروز سنز لمیٹڈ کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۶

۶۸۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۹ء، ص۹۴۔۹۵

۶۹۔ یوسف حسین خان، اردو غزل، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۱۱۵

۷۰۔ خواجہ منظور حسین، اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ، مکتبہ کارواں لاہور، ۱۹۸۱ء، ص۲

۷۱۔ امیر حسن نورانی، اُردو کے چاند تارے، مطبع نول کشور لکھنؤ، س ن، ص____

۷۲۔ ڈاکٹر ل۔ د۔ نسیم، بارھویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول، الوقار پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۳۰۶

۷۳۔ ایم نذیر احمد تشنہ، اردو ادب کا ارتقاء، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۲۳

۷۴۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اردو میں قطعہ نگاری، خیب بکڈپو لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۴۰

۷۵۔ ڈاکٹر ناہید کوثر، اردو شاعری کا ارتقاء، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۱۳۲

۷۶۔ ڈاکٹر ساجد امجد، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۲۸۷

۷۷۔ ایضاً، ص۲۹۰

۷۸۔ محمد جمیل احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، غضنفر اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۶ء، ص۵۷

۷۹۔ انجم اعظمی، ادب اور حقیقت، کراچی اشاعت گھر کراچی، ۱۹۷۹ء، ص۱۲۴

۸۰۔ ایضاً، ص۱۲۸

۸۱۔ سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ، آئینۂ سخن فہمی، کتاب نگر لکھنؤ، ۱۹۵۹ء، ص۴۱

۸۲۔ فرزانہ سیّد، نقوشِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۰ء، ص۳۳

۸۳۔ ایضاً، ص۳۶

۸۴۔ ادبیاتِ اُردو، مرتبہ شعبہ تصنیف و تالیف اردو اکیڈمی سندھ کراچی، س ن، ص۴۷۳

۸۵۔ سیّد مرتضٰی حسین، مشاعرہ عالمِ ارواح، نسیم بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص۱۲۳۔۱۲۴

۸۶۔ حفیظ الرحمٰن خان، عبدالعزیز بلوچ، تعارف، مشاہیر نظم و نثر کا سوانحی و تنقیدی جائزہ، کاروان ادب ملتان، بار دوم ۱۹۷۸ء، ص۱۸۰

۸۷۔ کلیم الدّین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ اوّل)، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۱۰۶

۸۸۔ ایضاً، ص۱۱۵

۸۹۔ سیّد آغا حیدر، مطالعہ آبِ حیات، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۱۱۵

۹۰۔ سیّد آغا حیدر، مطالعہ آبِ حیات، ص۱۳۴

۹۱۔ امداد اما آثر، کاشف الحقائق (معروف بہ بہارستانِ سخن) مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ترقی اردو بیورونئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص۴۱۷

۹۲۔ حکیم عبدالحیی، گلِ رعنا، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۳۷۰ھ، ص۱۶۱۔۱۶۲

۹۳۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند (حصہ اوّل)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص۵۰

۹۴۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند (حصہ دوم)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص۱۸۳

۹۵۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۶۷۸

۹۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۵۷۵

۹۷۔ ایضاً، ص۵۷۹

۹۸۔ ایضاً، ص۵۸۵

۹۹۔ سیّد وقار عظیم (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد ۷)، مقالہ نگار ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۷۲۔۱۹۷۱ء، ص۱۳۱

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۳۳

۱۰۱۔ ایضاً، ص۱۴۴

۱۰۲۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۱۵۳

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۵۳

۱۰۴۔ ڈاکٹر حسن اختر ملک، تاریخ ادب اردو، یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۱۹۱

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۹۳

۱۰۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۸۱

۱۰۷۔ ایضاً، ص۸۱

۱۰۸۔ ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱ء، ص۹۰

۱۰۹۔ محمود بریلوی، مختصر تاریخ ادب اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۷۱

۱۱۰۔ نسیم قریشی، اردو ادب کی تاریخ، ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ، جدید ایڈیشن ۱۹۶۱ء، ص۸۲

۱۱۱۔ صغیر احمد جان، تاریخ زبان و ادب اردو، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۹۷

۱۱۲۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم ونثرِ اُردو، آزاد بکڈپو لاہور، بار دہم ۱۹۵۸ء، ص ۷۶

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۱۴۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، تاریخ ادبیاتِ اُردو (حصہ دوم) اردو نظم، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۷۰

۱۱۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۸

۱۱۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۸۔۱۹۹

۱۱۷۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو زبان و ادب کا خاکہ، بزم خضر راہ نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۴

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۱۱۹۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۹۲

۱۲۰۔ سیّد احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، مکتبہ خلیل لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۷۰

۱۲۱۔ عطش درانی، اردو اصناف کی مختصر تاریخ، مکتبہ میری لائبریری لاہور، بار دوم ۱۹۸۶ء، ص ۴۹

122- Saksana Ram Babu, A History of Urdu Literature, Sang-e-meel Publications Lahore, 1996, P 79

123- - do -, P 80

124- - do -, P 81

125- - do -, P 83 - 84

126- Dr. M. Sadiq, A History of Urdu Literature, Oxford University Press Karachi, 1985, P 131

127- - do -, P 131

128- - do -, P 132

129- - do -, P 132

130- - do -, P 138

131- Naz, An Outline of Urdu Literature, Feroze Sons Lahore, 1971, P 24

132- - do -, P 28



باب چہارم

میرؔ شناسی: عصرِ حاضر میں متفرق نقوش

میرؔ شناسی، عصرِ حاضر میں: متفرّق نقوش

''میرؔ شناسی'' کی روایت اپنے ابتدائی نقوش سے جب آگے بڑھی تو مکمل کتب اور جزوی کتب کے ساتھ ساتھ انتخابات کا حصہ بھی بنی۔ جب شاعر سے آگاہی بڑھتی ہے تو اس کی تخلیقات کے انتخابات ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ میرؔ سے لوگوں کی جب شناسائی بڑھی تو ان کے کلام کے انتخابات بھی ہوئے۔ ان انتخابات کے ساتھ میرؔ کی ذات اور فن پر تحریریں بھی لکھی گئیں۔ یہ تحریریں بھی ''میرؔ شناسی'' میں اضافہ ثابت ہوئیں۔ ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے لکھی جانے والی یہ تحریریں ان صورتوں میں انتخابات کے ساتھ شامل ہیں:

۱۔ باقاعدہ تحقیقی و تنقیدی مضامین

۲۔ مقدمہ جات

۳۔ دیباچہ جات

۴۔ حرفِ اوّل

''میرؔ شناسی'' کی متفرّق کوششوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی صورت میں ادبی رسائل نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین میں میرؔ کی زندگی اور فن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے تعلیمی اداروں میں ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات کو بھی ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مقالہ نگاری ایک طالب علمانہ کوشش ہوتی ہے لیکن پھر بھی انھیں قابل ترین اساتذہ کی نگرانی میں مکمل کیا جاتا ہے جن کی تحقیقی و تنقیدی حیثیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے لکھے جانے والے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات کا بھی میرؔ کی زندگی اور فن کو سمجھنے میں اہم کردار ہے۔ اب ہم ''میرؔ شناسی'' کے ان متفرّق نقوش کا جائزہ لیتے ہیں۔

''شعرِ شور انگیز'' شمس الرحمٰن فاروقی کا انتخاب کلامِ میرؔ مع تشریح ہے جس کی چار جلدوں میں میرؔ کو مشرقی شعریات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمہید میں مصنف لکھتے ہیں کہ اس انتخاب کا مقصد میرؔ کے کلام کا معتبر متن پیش کرنا ہے۔ کلاسیکی متن کو سمجھنے کے لیے کلاسیکی شعریات کی دریافت کی ضرورت ہے۔ مغربی شعریات ہمارے کلاسیکی ادب کو سمجھنے کے لیے معاون تو ہوسکتی ہے لیکن صرف اس کے حوالے سے مکمل طور پر کلاسیکی ادب کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ دیباچہ کو نو ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے مصنف نے سب سے پہلے ''خدائے سخن، میرؔ کہ غالب؟'' پر بحث کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق غیر ذمہ دار نقادوں کی آراء نے ''میرؔ شناسی'' کو نقصان پہنچایا۔ کئی روایات میرؔ سے غلط منسوب ہونے کی وجہ سے انھیں ان روایات کے حوالے ہی سے دیکھا جانے لگا۔ میرؔ کو اگر شخصیت کی ہمہ گیری کی بنا پر غالبؔ سے بڑا شاعر مانا جائے تو یہ ممکن ہے لیکن یہ خیال صرف ان لوگوں کا ہوسکتا ہے جو ہمہ گیر شخصیت کو شاعری کا معیار سمجھتے ہیں۔ غالبؔ اور میرؔ الگ الگ طرح کے شاعر نہیں ہیں بے شک:

> ''دونوں کے اسلوب مختلف ضرور ہیں، لیکن دونوں ایک ہی طرح
> کے شاعر ہیں، اس معنی میں کہ دونوں کی شعریات ایک ہے۔'' [۱]

میرؔ اور غالبؔ دونوں ایک ہی روایت کے پروردہ تھے لیکن ان دونوں کے تخیل کا مزاج اور زبان مختلف تھی۔ غالبؔ نے ادبی زبان وضع کی جب کہ میرؔ نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنا دیا۔ غالبؔ کے ہاں میرؔ کی پیروی اس روایت کا حصہ ہے جس کے تحت شاعر ہر بڑے شاعر سے اکتسابِ فیض کرتا آیا ہے۔ غالبؔ نے میرؔ سے اگر کوئی مضمون یا کسی بات کا کوئی پہلو مستعار لیا ہے تو ہمیشہ اس میں نئی بات پیدا کی ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کا موازنہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''زبان کے تنوع، تجربۂ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری
> میں میرؔ کا مرتبہ غالبؔ سے اعلیٰ ہے۔ خالص تعقل اور تجرید اور
> نازک خیالی میں غالبؔ کا درجہ میرؔ سے بلند ہے۔'' [۲]

چونکہ میرؔ نے غالبؔ سے زیادہ اصنافِ سخن کو برتا ہے، اس لیے ''خدائے سخن'' کا خطاب میرؔ

کو زیب دیتا ہے۔ ''غالبؔ کی میری'' کے زیرِ عنوان مصنف بیان کرتے ہیں کہ غالبؔ نے میرؔ سے بار بار استفادہ کیا ہے، کیونکہ دونوں شاعروں کی ذہنی ساخت اور طرزِ فکر میں مماثلت تھی۔ غالبؔ نے میرؔ کے تجربات اور وسائلِ اظہار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا۔ تقلیدِ میرؔ دراصل شعریاتِ میرؔ کی پیروی ہے۔ میرؔ کے کلام اور ''نکات الشعراء'' میں اصولِ شعر کے بیان سے میرؔ کا نظریۂ شعر برآمد ہو سکتا ہے اور غالبؔ کے خطوط سے شعر کی صفات و محاسن کے حوالے سے غالبؔ کا نظریۂ شعر سامنے آتا ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کی شعریات میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ غالبؔ کے ہاں میرؔ کے مقابلے میں موضوعات محدود ہیں جب کہ استفہام کی فراوانی ہے۔ اس لیے غالبؔ کا کلام میرؔ سے زیادہ رنگارنگ معلوم ہوتا ہے۔ میرؔ کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''اس وقت کی مروّج شعری زبان سے انحراف اور روزمرہ کو شاعری بنانے کا عمل جو میرؔ نے سرانجام دیا، وہ غالبؔ کے کارنامے سے کم وقیع نہ تھا۔'' ۳

''میرؔ کی زبان روزمرہ یا استعارہ'' پر بحث کرتے ہوئے مصنف بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کے بارے میں کئی اسباب کی بنیاد پر یہ غلط فہمی پائی گئی کہ وہ روزمرہ یا خالص زبان کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے کئی طرح کے لسانی اور شاعرانہ وسائل کا استعمال کیا۔ جیسے:

۱۔ استعارہ اور کنایہ کا بکثرت استعمال
۲۔ مناسبتِ الفاظ
۳۔ تلازمۂ خیال
۴۔ رعایت کا اس طرح استعمال کہ شعر میں قولِ محال یا طنز کی جہت پیدا ہو گئی ہے۔
۵۔ مناسبت پیدا کرنے کے لیے رعایت کا یک سطحی استعمال

میرؔ کے اسلوب کو سادہ اور سریع الفہم سمجھنے کی مخالفت کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے اسلوب کو سادہ اور سریع الفہم کہنا اور ان کے ابہام، ان کی

> پیچیدگی، کثیرالمعنویّت اور غیر معمولی زورِ بیان کو نظرانداز کرنا نہ صرف
> میؔر بلکہ تمام اُردو شاعری کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔'' ۴

میؔر نے استعارہ اور مناسبت کے اصولوں کے ساتھ ساتھ فارسی کے نادر الفاظ اور فقرے نسبتاً کم مانوس الفاظ اور فقرے بکثرت استعمال کیے ہیں۔ عربی کے غریب الاستعمال الفاظ اور تراکیب کا بکثرت استعمال بھی ان کے ہاں ہے۔ انھوں نے بلاغت کو فصاحت پر مقدّم سمجھتے ہوئے جس لفظ کو مناسب سمجھا اسے استعمال کر لیا۔ وہ کسی لفظ سے گھبراتے نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارے سب سے زیادہ مہم جو شاعر ہیں۔ ان کا کلام ہمیں اس لیے گھریلو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان کے استعمالات اب ''عوامی'' ہیں جب کہ حقیقت میں ان کا اسلوب سادہ اور سریع الفہم نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں الفاظ کا بے تکلّف استعمال تخلیقی منصوبے کا حصہ ہے۔ انھوں نے اُردو زبان کے فطری اور نامیاتی عناصر کو اہمیت دی ہے۔ وہ ہماری شاعری کے پہلے اور سب سے بڑے انفرادیت پرست ہیں۔ محاورے کا لغوی معنی میں اور رعایت لفظی کا نیا پہلو پیدا کرنا ان کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ انھوں نے زبان کو انتہائی پیچیدہ، متنوع اور متوازن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ زبان کے پورے سرمائے کا جس قدر خلاّقانہ اور بھرپور استعمال انھوں نے کیا ہے اس کے غالؔب بھی اہل نہ تھے۔ بے شک غالؔب کی زبان، میؔر کی زبان سے زیادہ بے مثال ہے لیکن محدود معنوں میں۔

''انسانی تعلقات کی شاعری'' کے زیرِ عنوان مصنّف بیان کرتے ہیں کہ میؔر کے عاشق کے ہاں افلاطونی محبّت ہرگز نہیں، کیونکہ:

> ''میر کا عاشق اپنے معشوق سے صرف افلاطونی محبّت نہیں بلکہ
> ہم بستری کا طالب ہے۔ وہ ہم بستر ہوتا بھی ہے اور ہجر کے
> عالم میں ہم بستری کے ان لمحات کو یاد بھی کرتا ہے۔'' ۵

ان کے عاشق کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ روایتی عاشق کی تمام خصوصیات رکھتا ہے لیکن ہم اس سے ایک انسان کی طرح ملتے ہیں۔ وہ بالکل خیالی اور مثالی عاشق نہیں ہے۔ اس روایتی عاشق کے انسانی رشتوں سے تعلق کی بنا پر میؔر ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی غزل گو شعراء کی

طرح معاملہ بندی کے اشعار کہے ہیں لیکن ان کے ہاں ایسے اشعار میں انکشافِ ذات ہے۔ وہ ہر چیز کو ٹھوس سے زیادہ ارضی سطح پر برتتے ہیں۔ اس لیے ان کے کردار تصوّراتی کے بجائے حقیقی اور علامتی سے زیادہ افسانوی ہوتے ہیں۔ انھوں نے روایتی انداز کے ساتھ ساتھ معشوق کی شخصیت کو جس نہج سے نمایاں کیا ہے وہ شاعری کی عام نہج نہیں ہے۔ ان کے ہاں معشوق اور عاشق میں برابری کا رشتہ ہرگز نہیں ہے بلکہ معشوق عاشق پر حاوی ہے۔ ان کی شاعری کا عاشق میرؔ کی اپنی ذات ہرگز نہیں ہے جو نقاد ان کی غزل کو سوانح کے طور پر دیکھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور ان کے غم کو ذاتی دائرے سے نکال کر کائناتی ثابت کرنے والا تصور ہی مہمل ہے کیونکہ ان کی شاعری اس سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ بقول مصنّف:

> ''اس کے یہاں تجربہ اور مشاہدہ کی وہ دنیا ہے جو غم، الم، دردناکی، دل شکستگی، حرماں نصیبی وغیرہ جیسی اصطلاحوں کے ذریعے بیان نہیں ہو سکتی۔'' [۷]

میرؔ کی شاعری کی دنیا رنگارنگ ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ہو چکا ہے اور سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کے وہ نقاد بھی غلطی پر ہیں جو ان کی حرماں نصیبی اور محزونی کو معاشرے کی فطری پیداوار قرار دیتے ہیں اور ان کے معشوق کو مجبور و بے بس سمجھتے ہیں بلکہ ان کا معشوق تو اپنی پسند کو عطا کرنے یا نہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ وہ پردے میں چھپ کر گھٹ گھٹ کر مرنے والی لڑکی نہیں ہے۔ ان کی شاعری کی طرح اُن کے عاشق اور معشوق پر کوئی ایک حکم لگانا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں یہ کردار بھی انتہائی پیچیدہ ہے۔

''چوں خمیر آمد بدست نانبا'' میں مصنّف بیان کرتے ہیں کہ انسانی رشتوں کے تعلق سے میرؔ سب سے بڑے شاعر ہیں جس کا اظہار انھوں نے جنسیت میں بھی کیا ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کے ہاں حسنِ مزاح مشترک ہے لیکن غالبؔ کے ہاں خود کلامی کی کیفیت ہے اور میرؔ ہر ایک سے بات کر لیتے ہیں۔ جنسی مضامین میرؔ کے علاوہ دیگر شعراء کے ہاں بھی ہیں لیکن جراتؔ جیسے شعراء کے ہاں ان مضامین میں وہ گہرائی نہیں جو میرؔ کے ہاں ہے۔ جنسی مضامین کے بیان کے حوالے سے میرؔ کی بڑائی کی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ دیکھتے اور دکھاتے بہت ہیں لیکن بیان کم کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے ہاں جنسی مضامین صرف مضمون آفرینی کے لیے نہیں ہیں۔

۳۔ ان مضامین میں بھی ان کے ہاں خوش طبعی اور اپنے اوپر ہنسنے کا انداز مل جاتا ہے۔

جنسی مضامین غزل کے مزاج کا خاصہ ہیں اگر یہ حسن کے ساتھ بیان ہوں تو شاعر کی کامیابی اور اگر یہ حسن کے ساتھ بیان نہ ہوں تو یہ شاعر کی ناکامی ہے۔ میرؔ کے ہاں جنسی مضامین میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''میرؔ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ جنسی مضامین میں بھی معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کو برتتے ہیں، لیکن اس طریق کار کے باوجود میرؔ کے یہاں جنسی مضمون دبتا نہیں بلکہ اور چمک اُٹھتا ہے۔'' ۷

میرؔ کے ہاں تکرار کا شکوہ کیا جاتا ہے لیکن ان کی تکرار ہر جگہ ناروا نہیں ہے۔ وہ اکثر ایک ہی مضمون میں نئے پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے بھی غیر معمولی شاعر ہیں کہ وہ جنسی مضامین میں بھی اکثر و بیشتر مضمون آفرینی یا کثرتِ معنی پیدا کر لیتے ہیں، کیونکہ:

۱۔ وہ استعارے کا ہر اسلوب جانتے ہیں۔

۲۔ انھیں رعایتِ لفظی میں کمال حاصل ہے۔

۳۔ وہ حتی الامکان شعر کو بیانیہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔

میرؔ وصل کی لذت اندوزی کے وقت بھی رعایتِ لفظی، ابہام اور استعارے سے کام لیتے ہیں، کیونکہ:

''جنسی لذت اور جنسی تجربے کی تمام حسیاتی جہتوں میں میرؔ کا انہماک و اشتعال تمام تر وہ کیفیت رکھتا ہے جسے مولانا روم نے ''نابنائی کے ہاتھ میں خمیری آٹے'' کے نادر اور پانچوں حواس پر مبنی استعارے کے ذریعہ بیان کیا ہے۔'' ۸

میرؔ میں زندگی کے تمام تجربات کو حاصل کرنے اور انھیں شعر کی سطح پر قبول کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ جنسی اشعار میں وہ زیادہ کھل کر تو نہیں کھیلے لیکن ان کے ہاں تہذیب طرح طرح سے اپنا

اظہار کرتی ہے۔ شاعری میں انھوں نے اس اصول پر عمل کیا ہے کہ ہر مظہر کو شعر کی سطح پر برتا جا سکتا ہے۔

''دریائے اعظم'' کے زیرِ عنوان مصنف بیان کرتے ہیں کہ عشق کا تجربہ میرؔ کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔ زندگی اور کائنات کے تقریباً ہر مظہر کو انھوں نے عشق کے حوالے سے یا عشق کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے اور:

> ''میرؔ کے ذہن میں عشق کا تجربہ ایک ایسی مرکزی قوت کا تجربہ
> بن کر روشن ہوتا ہے جو بناتی بھی ہیں اور بگاڑتی بھی ہیں۔'' ۹

وہ ہمارے پہلے اور آخری شاعر ہیں جن کے ہاں عشق کا تجربہ اور زندگی کا سارا تجربہ انسان کی غیر معتبری کے استعارے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں انسانی شخصیت کے تجربات لاحاصل ہیں۔ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں انسانی شخصیت اور انسانی وجود کی تعریف کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کے مختلف تجربات کی انتہائی شکلیں اس وجہ سے ہیں کہ ان کی نظر میں عشق اور زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی کہ اگر عشق ہے تو زندگی ہے اور اگر زندگی ہے تو عشق ہے۔ انھوں نے عشق کے لیے اوجِ فلک تک موجزن ہونے والے طوفان اور ایسے دریا کا استعارہ تلاش کیا ہے جس کی ہر لہر اور ہر تھپیڑا ایک طوفان پیدا کرتا ہے۔ عشق کے تجربے میں کثرت کا تصوّر دیگر شعراء کے ہاں بھی ہے لیکن اس تجربے کے حوالے سے میرؔ کی انفرادیت ان وجوہات کی بنیاد پر ہے:

۱۔ دوئیت اور قطبینیت کا شدّت سے بیان۔
۲۔ عشق کی بوقلمونی کے تصوّر کے بیان میں بہت زیادہ تنوع۔
۳۔ عشق کے تجربے کے بیان کے لیے ہر طرح کے مضمون کا بیان۔
۴۔ عاشق اور معشوق کا کردار مثالی اور رسومیاتی طرز کا بھی ہے اور واقعی اور واقعاتی طرز کا بھی۔
۵۔ عشق محض اصولِ حیات نہیں، نظامِ حیات ہے۔
۶۔ کشف کے درجے پر عشق معتبر اور مشاہدے کے درجے پر انسانی تجربے کی صفات کا حامل۔

''بحرِ میرؔ'' کے زیرِ عنوان مصنف نے میرؔ کی ایک بحر پر بحث کی ہے جو انھوں نے کثرت سے استعمال کی ہے۔ انھوں نے ۱۸۳۸ غزلوں میں سے ۱۸۳ غزلیں اس بحر میں لکھی ہیں۔ یہ بحر اس وزن میں ہے:

فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن

اس بحر کی تقطیع عام طور پر بحرِ متقارب میں کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ہندی کی بحر ہے۔ میرؔ سے پہلے علی عادل شاہ شاہیؔ، جعفر زٹلی اور خواجہ عماد الدّین قلندرؔ نے اسے استعمال کیا لیکن:

''میرؔ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے غیر معمولی قوت اور حُسن کے ساتھ اور بہت کثرت سے استعمال کیا ہے۔'' [۱۰]

انھوں نے اس بحر کو جس تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ استعمال کیا ہے، اس کی مثال نہ ہندی میں ہے اور نہ ہی فارسی میں۔ اگرچہ اس بحر سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے والی بحریں ہندی اور فارسی میں موجود ہیں لیکن کوئی بحر ایسی نہیں جو اس کی واحد شکل ہو۔ اگرچہ یہ بحر اس سے پہلے اُردو میں موجود تھی لیکن بہت کم۔ انھوں نے اس بحر کو نہایت کامیابی اور تنوع کے ساتھ برت کر عام کیا۔ اس لیے اسے ''بحرِ میرؔ'' کا نام دینا چاہیے۔

''شعرِ شور انگیز'' کے زیرِ عنوان مصنف بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ ان کے ہاں لہجے کا دھیما پن، نرمی، آواز کی پستی، ٹھہراؤ اور دل کو آہستہ سے چھو لینے والی سرگوشی ہے۔ یہ خیالات ان کو سراپا یاس و حرماں، منفعل اور شکست خوردہ ثابت کرتے ہیں۔ اِنھیں ان کی خاص صفات قرار دے کر اس سے بننے والے لہجے کو غزل کے مثالی شاعر کا لہجہ تصوّر کر لیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ وکٹوریائی نقادوں کی وجہ سے ہوا جنھوں نے کہا کہ شاعری ذاتی تجربے اور داخلی احساس کا اظہار ہے۔ پھر ہم نے یہ تصوّر کر لیا کہ میرؔ کی زندگی یاس و حرماں کا مرقّع ہے لہٰذا ان کی شاعری بھی اس بے نصیبی کا اظہار ہو گی۔ ان کے اکثر نقادوں نے ان کے آہنگ کو دھیما، انفعالی اور نرم رو قرار دیا ہے، جب کہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے:

''ان کے کلام میں جو معنی ہیں، ان کو بھی ہم دھیما، انفعالی اور نرم رو نہیں کہہ سکتے۔'' [۱۱]

ان کا کلام کسی شکست خوردہ، حرماں نصیب اور منفعل شخص کا نہیں ہے بلکہ یہ کلام اس شخص کا ہے جو تجربے اور احساس کی ہر منزل سے گزر چکا ہے۔

میرؔ اٹھارویں صدی کی نئی شعریات ترتیب دینے والے شعراء میں نمایاں ہیں۔ انھوں نے شعر کی نوعیت، ماہیت اور خوبی کے بارے میں پچاس سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ خود ان کا اصرار کہ ان کا کلام پُرشور ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کلام ٹھہرے ہوئے اور نرم آہنگ کا نہیں ہے اور:

> ''میرؔ کا کلام خاص طور پر بہ آوازِ بلند قرأت کے لیے
> مناسب ہے اور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کو پست،
> دھیمے یا نرم لہجے میں نہ پڑھا جائے۔'' ۱۲

ان کے کلام میں ''شور'' اور ''شور انگیز'' کے الفاظ اکثر استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کو ان کے آہنگ کے سلسلے میں کلیدی اہمیت حاصل ہے جس طرح ان کے بارے میں اکثر غلط مفروضوں نے ''میرؔ شناسی'' کی اصل صورت کو سامنے لانے میں رکاوٹ پیدا کی ہے۔ اسی طرح ان کے آہنگ کے بارے میں غلط مفروضوں نے اس کی اصل صورت کو ہمارے سامنے نہیں آنے دیا۔

''شعرِ شورانگیز'' جلد دوم میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ منشائے مصنّف کو متن کے معنی میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔ میرؔ کی شاعری بڑی شاعری ہے جس کی یہ خوبی ہے کہ ہزار مطالعہ کے بعد بھی یوں لگتا ہے کہ یہ مکمل طور پر ہماری گرفت میں نہیں آئی۔ وہ زبان کے ساتھ ہر طرح کی آزادی برت جاتے ہیں لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری اور اس شاعری میں نظر آنے والی شخصیت پر کوئی ایک حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر ان کے دو تین Stereo type ہمارے ہاں رائج ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس کتاب میں ان کا کوئی Stereo type پیش نہیں کیا گیا ہے۔

معنی کی بحث میں مصنّف بیان کرتے ہیں کہ معنی وہ معاشرہ یا نظام متعیّن کرتا ہے جس کے تحت الفاظ استعمال ہو رہے ہوں۔ متن میں شامل کسی لفظ کے معنی سیاق وسباق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قاری خود بھی متعیّن کر سکتا ہے، چاہے وہ غلط ہوں یا صحیح لیکن وہ متن اس کے باوجود بامعنی رہے گا۔ معنی

اس نظام کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو اصول وضوابط کی روشنی میں کوئی معنی متعیّن کرتا ہے۔ اس لیے:

> ''معنی کا وجود ترتیب (یعنی صرف ونحو) سیاق و سباق اور
> مروّج نظام کا تابع ہے۔ مصنّف خود معنی نہیں پیدا کرتا بلکہ
> ایسے سیاق و سباق بناتا ہے اور ایسی ترتیب پیش کرتا ہے اور
> مروّج نظام کے امکانات کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس
> کا کلام بامعنی ہو جاتا ہے۔'' [۱۳]

متن کے معنی متعیّن کرنے میں منشائے مصنّف سے انحراف اس مصنّف کے حق میں بھی بہتر ہے اور خود ہمارے حق میں بھی۔ غالبؔ کے کلام سے جو معنی غالبؔ نے لیے ہیں، ہم ان معنی سے ہٹ کر ان کے کلام سے اچھے معنی دریافت کر سکتے ہیں۔ معنی شعر کے بطن سے دریافت ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم متن کو منشائے مصنّف سے ہٹ کر پڑھیں۔ اگر اس طرح نہ ہو تو غالبؔ اور میرؔ کے ہاں جو کثیر المعنویّت ہم دریافت کر سکتے ہیں، اس کے تمام تر امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ منشائے مصنّف کو مرکزی اہمیت نہ دینے سے متن کی توقیر بڑھتی ہے، کیونکہ اصل اہمیت تو ان معنی کی ہے جو متن سے برآمد ہوتے ہیں۔ سیاق وسباق کے بغیر یا تو لفظ بے معنی ہوتا ہے یا اس کے بہت سے معنی ہوتے ہیں۔ جتنے بھی متن کے معنی سیاق وسباق کے حوالے سے برآمد ہو سکتے ہیں وہ سب معنی درست ہوں گے۔ مصنّف اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کے متن کے کتنے معنی ہیں کیونکہ اس کے علم میں یہ بات نہیں ہوتی کہ اس کا متن کہاں کہاں اور کون کون پڑھے گا۔

مغرب کی قدیم شعریات میں منشائے مصنّف کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ افلاطون کے مطابق شاعر اپنے کلام کے معنی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ شعر گوئی کے وقت اپنے ذہن یعنی قوتِ عقلیہ سے عاری ہوتا ہے۔ ارسطو بھی شاعری میں الہام کا قائل ہے لیکن بعد میں جب مغرب میں شاعری کو ریطوریقا (Rhetoric) کی شاخ سمجھا جانے لگا تو یہ خیال آہستہ آہستہ عام ہوا کہ تعبیر وتشریح کے صحیح پن کی بنیاد منشائے مصنّف ہے لیکن جب شاعری کو ریطوریقا سے الگ قرار دیا جانے لگا تو منشائے مصنّف کی مرکزی اہمیت پھر ختم ہو گئی۔ رومانی تصوّر کے تحت متن میں کوئی خاص معنی ہوتے ہیں جنھیں مصنّف کہیں سے لا کر ڈالتا ہے۔

ہماری شعریات میں عندیۂ مصنف کو کبھی بھی مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ بقول مصنف:

> ''لطف (بلکہ افسوس) یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ میرؔ کے کلام کے وہی معنی بیان کیے جائیں جو میرؔ نے مراد لیے ہوں (یا جن کے بارے میں یہ قرینہ ہو کہ وہ میرؔ نے مراد لیے ہوں گے) وہ میرؔ کے متن میں کثرتِ معنی کو نظر انداز کر کے ذاتی ملکیت کا اصول تو مستحکم کر دیتے ہیں لیکن خود میرؔ کے متن کو مفلس کر دیتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا اس بات پر اصرار کہ دریا کی طوالت اور وسعت اتنی ہی ہے جتنی اس سوتے کی جہاں سے دریا جاری ہوا ہے۔'' ۱۴

''شعرِ شور انگیز (جلد سوم)'' میں کلاسیکی غزل کی شعریات پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف بیان کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں سو برس سے اور مغرب میں اس سے بھی زیادہ عرصے سے یہ خیال رائج ہے کہ ادب کو تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پڑھنا چاہیے لیکن تنقیدی اصولوں کی اہمیت بنیادی نہیں بلکہ ثانوی ہے۔ ایک خیال ہمارے ہاں یہ بھی رہا ہے کہ تنقید ایک طرح کی سائنس ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے، لہٰذا:

> ''ادب کی سائنسی توجیہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ سائنسی توجیہ کو اقدار سے سروکار نہیں ہوتا۔'' ۱۵

اس لیے کسی تحریر کی ادبی توجیہ سائنسی نقطۂ نظر سے ممکن ہی نہیں۔ ادب کی چند خصوصیات کی فہرست بنا کر بھی ہم اچھے ادب کی پہچان اس فہرست کی خصوصیات کو قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ اچھا ادب اگر سادگی کا حامل ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اچھا ادب پیچیدہ ہو۔ اس لیے کسی ایک صفت یا صفات کی ایک فہرست مرتب کر کے ہم ادب کی قدر و قیمت کا تعین ہرگز نہیں کر سکتے۔ بعض حالات میں تو ''ادب''، ''اچھا ادب'' اور ''اہم ادب'' کی تفریق بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا محض تنقیدی نظریات کی روشنی میں ادب کا مطالعہ سودمند نہیں ہوتا۔ ان نظریات کی قدر اس وقت اور بھی مشکوک ہو جاتی ہے جب وہ کسی اور ادب یا کسی اور تہذیب سے مستعار لیے گئے ہوں اور یہ خود اس ادب سے برآمد نہ کیے گئے

ہوں جس کی تفہیم اور تنقید کے لیے انھیں استعمال میں لایا جا رہا ہو۔ کوئی تنقیدی اصول آفاقی نہیں ہوتا، اس لیے بعض اصولوں کو آفاقی قرار دے کر آزاد، حالی، امداد امام اثر اور اس نوع کے تمام اُردو نقادوں نے ہمارے ادب پر ظلم کیا ہے۔ مغربی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں جب اُردو ادب کو پرکھا گیا تو اس میں کئی عیب نظر آئے۔ اس طرح اُردو شاعری کے اصول و روایات کو مسترد یا از کار رفتہ قرار دیا جانے لگا اور تمام نقاد مغربی شعریات کی پیروی کرنے لگے۔ اصل میں اس محرک کے پیچھے حب الوطنی کا جذبہ تھا جس نے ان سے اُردو ادب کو عالمی ادب کے معیار کا ثابت کروانا چاہا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ ہمارے ادب کا بیشتر حصہ اس حد تک تنقیص کی زد میں آیا کہ اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اسے اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور نیچرل شاعری کو ''نیچرل'' ہی ہونا چاہیے۔ یہ صرف اور صرف باہر سے مستعار لیے ہوئے تنقیدی اصولوں کو آفاقی سمجھ لینے کا نتیجہ تھا۔ ہمیں اپنے اصول خود وضع کرنے کی ضرورت تھی جن کی روشنی میں ہم اپنے ادب کے معیار کو پرکھ سکتے، کیونکہ:

> ''ہر تہذیب اپنے طور پر طے کرتی ہے کہ ہم کس چیز کو ادب
> کہیں گے اور بحیثیت ادب کس چیز کو کتنی قیمت دیں گے؟'' ۱۶

کسی ادب کو ''آفاقی تنقیدی اصولوں'' کی روشنی میں پرکھنے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس تہذیب کے حوالے سے ادب کو پرکھیں جس تہذیب میں وہ ادب پیدا ہوا ہے۔ جن متون کو ادبی معاشرہ ادب کہے وہ ادب ہے، جن کو ادبی معاشرہ اچھا ادب کہے، وہ اچھا ادب ہے اور جن کو ادبی معاشرہ بڑا ادب قرار دے وہ بڑا ادب ہے۔

کسی متن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خاص رسومیات (Conventions) کے حوالے سے پڑھا جائے، ہر صنف کی اپنی رسومیات ہوتی ہیں۔ بعض متون میں رسومیاتی عناصر مشترک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر منقبت اور غزل میں وزن، بحر، ردیف، قافیہ، مطلع وغیرہ مشترک ہو سکتے ہیں۔ ان رسومیاتی عناصر کو جاننا ضروری ہے۔ اس لیے متن کے بارے میں فیصلہ کرنا کہ یہ اچھا ہے کہ نہیں، ان قاعدوں کی روشنی میں ہوگا جو اس تہذیب میں مروّج ہیں جس میں وہ متن تخلیق ہوا ہے۔ دوسری زبان یا دوسری تہذیب کے بنائے ہوئے تنقیدی اصول اور متن سازی کے قاعدے کسی اور زبان کے لیے

بھی کارآمد ہو سکتے ہیں لیکن بالکل ان اصولوں کو اپنا کر دیگر تہذیب کے فن پارے کی قدر و قیمت کا تعیّن کرنا ناممکن ہے۔ غیر تہذیب کے اصولوں کو ہم اپنے تہذیبی اصولوں کی تنسیخ کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ سیاسی اور سماجی دباؤ کے تحت ہم نے مغربی اصولوں کی پیروی میں اُردو ادب کو سمجھنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ہم اس ادب کا تعیّن اس شعریات اور رسومیات کی روشنی میں نہ کر سکے جس میں یہ ادب تخلیق ہوا تھا لیکن:

> ''کسی ادب کو سمجھنے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے انھیں تصوّراتِ شعر و تصوّراتِ کائنات کی روشنی میں پڑھا جائے جن کی روشنی میں وہ ادب لکھا گیا تھا۔ لہٰذا کلاسیکی شعریات کی بازیافت کے بغیر ہم کلاسیکی ادب سے پورا معاملہ نہیں کر سکتے۔'' ۱۷

کلاسیکی غزل کی شعریات اب ہم سے محو ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زیادہ تر زبانی اور ملفوظ تھی۔ تقریباً ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کے تمام شعراء کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ نئی شعریات بنا رہے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے اُردو شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن شعراء مختلف طرزوں اور اسالیب میں تجربے کرتے رہے تھے۔ کلاسیکی اُردو غزل کی شعریات تمام کی تمام فارسی سے مستعار نہیں ہے اور نہ ہی یہ تمام ہندوستانی روایت سے مستعار ہے۔ ان میں دونوں کے اجزاء کے ساتھ ساتھ بعض چیزیں ایسی ہیں جو اُردو والوں نے خود بنائیں یا دریافت کیں۔ شعریات سازی کا یہ عمل ولؔی سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ رسومیات کا بھی ایک نظام تھا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ کلاسیکی غزل کی رسومیات تو موجود ہے لیکن شعریات تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس کلاسیکی غزل کی شعریات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس شعریات کے بکھرے ہوئے نقوش جمع کر کے اس کی بازیافت کریں۔ تذکرہ نگاری کی روایت، کلاسیکی اساتذہ کی اصلاحیں اور مکاتیب اس سلسلے میں ہمارے بڑے معاون ہو سکتے ہیں۔ شعراء کے کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی اُردو شعریات کے ان تصوّرات کا ذکر ہے جو ایرانی فارسی یا سبکِ ہندی سے ہمارے ہاں رائج ہوئے۔ ہماری کلاسیکی شاعری کی شعریات

کی بنیاد جن خوبیوں پر ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ ربط

۲۔ روانی

۳۔ مناسبت

۴۔ بندش کی چستی

۵۔ مضمون

۶۔ مضمون (استعارہ)

۷۔ مضمون (کی وسعت)

۸۔ مضمون (کے لیے لفظ 'معنی' کا استعمال)

۹۔ مضمون اور معنی کی دوئیت

۱۰۔ مضمون آفرینی (تازہ خیالی)

۱۱۔ نازک خیالی

۱۲۔ خیال بندی

۱۳۔ معاملہ بندی

۱۴۔ کیفیت

۱۵۔ شور انگیزی

۱۶۔ معنی

۱۷۔ معنی آفرینی

۱۸۔ معنی آفرینی (پیچ داری، تہ داری)

۱۹۔ رعایت (ایہام)

۲۰۔ انشائیہ اسلوب

بقول مصنف:

''یہ وہ چند اصول ہیں جن کی روشنی میں ہماری کلاسیکی شعریات مرتب ہو سکتی ہیں۔ اپنی شعریات، یا اپنے کلاسیکی شعراء کے سامنے جو رہنما اصول تھے، ان کی بازیافت اور ان کی ہی روشنی میں کلاسیکی شاعری کو پڑھنے پر اصرار کا مطلب یہ نہیں کہ تہذیبوں اور دیگر زبانوں میں شاعری کا جو تصور ہے، وہ غلط اور لاطائل ہے۔ مقصود صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ سب تہذیبوں کو اپنے اپنے معیار متعین کرنے کا حق ہے۔'' [۱۸]

''شعرِ شور انگیز (جلد چہارم)'' کے مطابق مصنف لکھتے ہیں کہ ہماری شاعری میں ہجر و حرماں، نارسائی و جفا، معشوق کی دُوری اور اس کی بے مہری وغیرہ کے مضامین کو اہمیت، اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خواہش کو مزید شفاف کرنے کی وجہ سے ہے، کیونکہ ہماری اعلیٰ روایات میں سے وصلِ محبوب سے فراقِ محبوب، اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں عشق کا جو تصوّر بہترین سمجھا گیا اسی پر غزل کے عشقیہ مضامین کی عمارت قائم ہوئی۔ جیسے جیسے اس تصوّر میں گہرائی اور وسعت آتی گئی ہماری غزل کے عشقیہ مضامین کو بھی اسی طرح چار چاند لگتے گئے۔ حتیٰ کہ ہم میرؔ کے کلام میں اپنی پوری تہذیب کو جلوہ گر دیکھتے ہیں اور اس میں تصوّرِ عشق بھی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ موجود ہے۔

میرؔ کے ہاں لفظ کے امکانات زیادہ ہیں۔ ان کے ہاں لفظ ان معنوں میں بھی مستعمل ہیں جو ہمارے ہاں رائج نہیں ہیں:

؎ نہیں ابرو ہی مائل جھک رہی ہے تیغ بھی ایدھر
ہمارے کشت و خوں میں متفق باہم ہیں یہ دونوں

اس شعر میں ''مائل'' بہ معنی جھکا ہوا ہے۔ وہ بہت بڑے شاعر ہیں اور ہر بڑے شاعر کی طرح وہ بھی اپنے قاری کی مکمل گرفت میں نہیں آتے۔

ایک طرح سے دیکھیں تو معنی اور مضمون میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں لیکن معنی اور

مضمون ایک سے نہیں ہیں۔ مضمون اور معنی کی تفریق کا مطلب یہ نہیں کہ معنی کوئی خارجی شے ہے اور مضمون کا تابع نہیں۔ لفظ بیک وقت مضمون اور معنی کا حامل ہوتا ہے۔ تعبیرِ متن کی آسانی کی خاطر ہم مضمون اور معنی کی تفریق قائم کرتے ہیں، کیونکہ:

> ''مضمون اور معنی کی تفریق کے ذریعہ متن سے لطف اندوز ہونے، اس کے ذریعہ پیچیدہ تر اور پیچیدہ ترین باتیں ادا کرنے، اور زبان کی گہرائی اور وسعت میں اضافہ کرنے کے امکانات روشن تر ہو سکتے ہیں۔'' ۱۹

جن شعروں میں کیفیت ہوتی ہے، ان میں معنی اہم نہیں ہوتے لیکن میرؔ تنہا ایسے شاعر ہیں جو کیفیت کے ساتھ معنی کی کثرت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ شاعری میں مضمون اور معنی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''شعر کس چیز کے بارے میں ہے؟ اس سوال کے جواب میں جو کہا جائے گا وہ شعر کا مضمون ہوگا۔ اس چیز کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا جائے گا، وہ شعر کے معنی ہوں گے۔'' ۲۰

کسی شعر میں مضمون کو بیان کرنے کے لیے استعارے یا اس طرح کے کسی جدلیاتی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے مضمون تلاش کرنے کا شوق جب نشے کی صورت اختیار کر جائے تو اسے خیال بندی کہتے ہیں۔ اگرچہ اُردو میں خیال بندی کا عروج اٹھارویں صدی کے آخر سے شروع ہوا لیکن میرؔ کے ہاں بھی اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ بیان کا مضمون ایک ہونے کے باوجود اس کے معنی مختلف ہو سکتے ہیں اور معنی کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ مخاطب کون ہے؟ معنی آفرینی کی ایک طرز کا دارومدار انشائیہ اور خبریہ کی تفریق پر ہے۔

استعارہ ایسا آلہ نہیں جو اضافی ہے بلکہ یہ شاعری کے باطنی محاسن کو نمایاں کرتا ہے۔ بعض اوقات لغوی معنی نامناسب ہوتا ہے۔ مثلاً ''میرا گاؤں گنگا پر ہے'' اس سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ

میرا گاؤں گنگا کے پانی پر ہے، تو نامناسب ہے، بلکہ استعاراتی معنی گنگا کے کنارے پر لیں گے۔ استعاراتی معنی سے اگر اور معنی نکالیں تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ میرا گاؤں مقدس ہے۔ اس عمل کو ''دھونی'' کا عمل کہا گیا ہے۔ اس معنی کا اور استعاراتی معنی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

میرؔ نے استعارے کو لغوی معنی میں استعمال کر کے اس سے پھر استعارہ بنایا ہے:

؎ وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

خاک چھاننا استعارہ ہے لیکن میرؔ نے اس کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ آسمان نے خاک چھان کر سب سے اچھی مٹی سے ان لوگوں کو بنایا ہے۔ یہ لغوی معنی ہیں، پھر ان سے استعارہ بنایا کہ آسمان نے چھانٹ چھانٹ کر مٹی نکالی اور ان لوگوں کو بنایا۔ استعارہ کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ:

> ''استعارہ اپنی تہذیب اور اپنے تہذیبی رسوم و مفروضات میں
> جس قدر ڈوبا ہوا ہوگا، اتنا ہی تو انگر ہوگا اور اس میں ٹھہرنے کی
> قوت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔'' [۲۱]

محض بامعنی متن کو معنی آفرینی کا حامل نہیں کہہ سکتے، اس لیے معنی آفرینی کے حامل متن میں عام سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔ رعایتِ لفظی سے کلام میں زور پیدا ہوتا ہے اور زور کا ایک تفاعل معنی بھی ہے۔ ہمارے ہاں اب اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن کلاسیکی شعراء اس کے بغیر منہ نہیں کھولتے۔ مضمون آفرینی کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں جب کہ معنی آفرینی کے لیے قاعدے مقرر ہو سکتے ہیں۔ معنی آفرینی کے لیے زبان پر قدرت، اس کے امکانات کا زندہ احساس، مربوط مگر پیچیدہ فکر اور طاقت ورتخیل درکار ہوتے ہیں۔ میرؔ کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

> ''میرؔ کے یہاں مضمون آفرینی میں خیال بندی کا عنصر کم تھا
> لیکن ان کے یہاں کیفیت زیادہ تھی اور معنی آفرینی میں وہ
> غالبؔ سے بھی آگے تھے۔'' [۲۲]

معنی آفرینی کے لیے تجریدی رنگ اور ابہام دونوں صفات ضروری ہیں لیکن میرؔ نے اس

قاعدے کو غلط کر دکھایا، کیونکہ ان کے ہاں تجریدی رنگ بہت کم ہے۔ ان کے ہاں اظہار کی نارسائی نہیں اور انھیں کبھی لفظوں کی کمی یا کمزوری محسوس نہ ہوئی، کیونکہ:

''میؔر ان چند بڑے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے لفظ کی
نامحری، اظہار کی ناکامی، قوتِ بیان کی محدودیت وغیرہ کی
شکایت نہیں کی ہے۔'' ۲۳

متن وہی بہتر ہے جو کثیرالمعنوی ہے۔ معنی آفرینی کے ذریعے مصنف کو اپنی تخلیقی قوت کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ میؔر نے معنی آفرینی کے لیے جو حربے استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں:

''۱۔ انشائیہ کا کثرت سے استعمال اور
۲۔ انشائیہ میں بھی معنی کے ان امکانات کو بروئے کار لانا جن
کی خبر شعراء کو عام طور پر نہیں ہوتی۔
۳۔ بات کو زیادہ تر عمومی اور مبہم رکھنا لیکن اس کو عامیانہ پن
سے دُور رکھنا۔
۴۔ چھوٹے چھوٹے الفاظ، لیکن ایسے الفاظ کا استعمال جن میں خود ہی
کثرتِ معنی ہے۔'' ۲۴

تصوّرِ کائنات اور تہذیب کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ایک تہذیب کئی مذاہب اور نظریہ ہائے حیات میں مشترک ہوسکتی ہے۔ اس لیے تصوّرِ کائنات بھی مختلف مذاہب میں مشترک ہوسکتا ہے۔ شاعری بنیادی طور پر تصوّرِ کائنات کا اظہار کرتی ہے۔ جب مختلف شعراء کے ہاں تصوّرِ کائنات مشترک ہو تو ان کا کلام آپس میں مشابہ ہوگا اور اگر تصوّرِ کائنات کے ساتھ ساتھ رسومیاتِ فن بھی مشترک ہوں، تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ شعراء ایک ہی سلسلے کے ہیں۔ بقول مصنف:

''اگر شعر کی رسومیات اور تصوّرِ کائنات دو شاعروں کے
درمیان مشترک ہو تو ان کی شاعری میں آپسی مفہومیت
''Mutual Comprehensibility'' ہوتی ہے چاہے
ان کا تعلق مختلف ماحول اور پس منظر سے کیوں نہ ہو۔'' ۲۵

سنسکرت اور عربی شعریات میں استعارے کی بحث کو نشانیات "Semiology" کے تحت بھی رکھا جاتا ہے۔ نشانیات کا بنیادی اصول یہی ہے کہ شے اور نشان میں فرق نہیں۔ سبکِ ہندی کی شاعری میں چاہے وہ فارسی ہو یا اُردو ''تمثیل'' یا ''دلیل'' اسی لیے اہم ہے کہ حقیقت اور استعارہ ایک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں حقیقت کو استعارے پر دلیل لاتے ہیں۔

ہماری کلاسیکی غزل میں جو تصورِ کائنات ملتا ہے، اس میں انسان اعانتِ خداوندی کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں جو نظریۂ کائنات ہے، اس کی رو سے کائنات میں معنی موجود ہیں اور زمانہ گزشتہ سے ان کو پہچانا گیا ہے۔ جب کائنات میں فرد کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں اور فرد کوئی نئے معنی دریافت یا ایجاد نہیں کر سکتا تو اشیاء کی انفرادی حیثیت کے بجائے عمومی حیثیت سامنے آئی مثلاً گل سے مراد ہر قسم کا پھول لیا گیا۔ اسی اعتبار سے عاشق کی زندگی، معاملات، معشوق کی شخصیت، اس کا حسن یہ سب چیزیں انفرادی تفصیل کے بجائے اجمالی تعمیم کے ساتھ بیان ہوئیں۔ ہمارے تصورِ کائنات میں آفاق کو انفس پر فوقیت دینے کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اشیاء کو بیان کرنے میں کثرت کا انداز کارفرما ہوا یعنی جب اشیاء کی انفرادی پہچان متعین نہیں کرنا ہے تو ان کی مجموعی پہچان قائم کرنے کے لیے ہر بات میں شدت پیدا کی جائے۔ اگر بہار ہے تو سب بہاروں سے بڑھ کر اور اگر دردِ جدائی ہے تو سب سے بڑھ کر۔ میرؔ کے کلام میں تصورِ کائنات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کا کلیات پڑھ کر ہمیں ان کی تہذیب کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا، ان کے تصورِ کائنات کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا لیکن میرؔ کی شخصیت کے بارے میں ہمیں بہت کم معلوم ہوگا۔'' ۲۶

''مزامیر یعنی انتخاب کلام میرؔ مع مقدمہ و مقالہ'' نواب جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی نے مرتب کیا۔ انتخاب سے پہلے مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ اور ڈاکٹر امرناتھ جھا کا لکھا ہوا مقالہ بہ عنوان ''میر تقی میرؔ'' شامل ہیں۔

مقدّ ے میں مصنف لکھتے ہیں کہ میرؔ کا کلام جواہر کا وہ گنجینہ ہے جس سے ہر اہلِ نظر بقدرِ ذوق فیض اور لذّت اُٹھا سکتا ہے۔ ان کے کلام کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تصوّف کے حوالے سے ان کی عظمت تسلیم تو کی جاتی ہے لیکن دردؔ سے کم۔ اس کی وجہ دردؔ کا صوفیانہ ماحول ہے لیکن میرؔ کے والد بھی مانے ہوئے درویش تھے۔

میرؔ، ایک فن کار کی حیثیت سے شاعری میں جن اصولوں کے پابند تھے، ان کا ذکر تذکرہ ''نکات الشعراء'' میں انھوں نے کر دیا ہے۔ مرتّب نے ''ذکرِ میرؔ'' کے حوالے سے حالات و واقعات کو درست تسلیم کرتے ہوئے ان کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان حالات و واقعات کا ان کی شاعری پر براہ راست اثر ہے۔ کیونکہ:

> ''یہ زندگی اور ایسے حالات تھے جس میں ان کی شاعری کا نشوونما ہوا اور جس نے اُن کی شاعری کو تاثیر کا طلسم بنا دیا۔'' ۲۷

مصنّف نے مولوی عبدالحق کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنے والد کے اصل نام کا کہیں پر ذکر نہیں کیا۔ اس اختلاف کو ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہوئے انھوں نے ''ذکرِ میرؔ'' کے اس صفحے کی نشاندہی بھی کر دی ہے جہاں پر میرؔ کے والد کا نام ''محمد علی'' درج ہے۔

میرؔ کی شاعری تمام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ انھوں نے ہمہ گیر تخیّل اور قوتِ اختراع کی آخری حدوں کو چھونے کے باوجود حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع کی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس لفظی سادگی کے باوجود ان کی شاعری میں معانی کا ایک دریا موجزن ہے۔ اُردو میں صرف وہی ایک شاعر ہیں جنھوں نے پاکیزہ عشق کے گیت گائے ہیں۔ ان کے ہاں عشق میں وضعِ احتیاط دونوں طرف سے دیدہ درائی کی مانع ہے۔ ان کی محبّت میں بناوٹی ناز نخرے اور بے جا غرور و تمکنت بھی ناروا ہے۔ اس لیے یہ عشق مساوات کی توقّع رکھتا ہے۔

ے باہم سلوک تھا تو اُٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

ایسی محبّت، پرخلوص برتاؤ کی توقع رکھتی ہے۔ عام اُردو شاعری نے صرف عاشق کو نہیں بلکہ تمام بنی نوع آدم کو ذلیل قرار دیا ہے۔ میرؔ کے سامنے ہمیشہ انسان کی عظمت رہی۔

؎ آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تُو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

اُردو شاعری میں صوتی تراکیب کا فقدان ہے لیکن میرؔ کی شاعری کا یہ معجزہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کی شاعری بہترین صوتی تراکیب کا نمونہ بن گئی ہے۔

؎ کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

یہ غلط ہے کہ وہ گوشہ نشین شاعر تھے اور انھوں نے مناظرِ فطرت کا مطالعہ نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے مناظرِ فطرت کی مصوّری ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی، انھوں نے دربدر کی خاک چھانی تھی، اس لیے ان کی شاعری میں مناظرِ فطرت کی عکاسی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

؎ دامانِ کوہ میں جو مَیں ڈاڑھ مار رویا
اک ابر واں سے اُٹھ کر بے اختیار رویا

بقول مصنّف:

''اگر شاعری فطرت کی نقالی نہیں بلکہ ترجمانی ہے تو آج کل کے بہت سے ''فطرت نگار'' شاعرانِ خوش گفتار گمراہ ثابت ہوں گے۔ فطرت ان کی نامحرمی پر نوحہ خواں ہوگی اور سہرا نظرباز میرؔ کے سر رہے گا۔'' [۲۸]

میرؔ کی شاعری میں ''ادا نگاری'' ہے۔ عریانی، ابتذال اور حیاسوزی سے بچ کر ادانگاری کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ انھوں نے اس مرحلے پر بھی فن کاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے اس قبیل کے شعر پڑھ کر روحانی لذّت تو ہوتی ہے لیکن کسی قسم کا نفسانی اشتعال نہیں ہوتا:

؎ لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

میرؔ کی شاعری کی خوبیوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے، کیونکہ:

''حسن و عشق اور ان کے متعلقات کا تو ذکر ہی کیا زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوّری میرؔ نے بہترین الفاظ اور مؤثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو۔'' ۲۹

ان کے تصوّف سے متعلق جو اشعار ہیں ان میں حقائق و معارف کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جسے نظم نہ کیا گیا ہو۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی کی بحر میں غزل کہی ہے:

سب شرمِ جبینِ یار سے پانی ہے
ہر چند کہ گل شگفتہ پیشانی ہے
کل سیل سا جوشاں جو ادھر آیا میرؔ
سب بولے کہ یہ فقیر سیلانی ہے

اُردو میں واسوخت کے موجد بھی وہی ہیں، انھوں نے واسوخت کی طرز میں غزلیں بھی کہی ہیں:

؎ خوب رُو اب نہیں ہیں گندم گوں
میرؔ ہندوستاں میں کال پڑا

ان کے کلام میں خوش نما فارسی تراکیب ہیں۔ ان کے بعد مومنؔ اور غالبؔ نے یہ راستہ اختیار کیا اور تو اور:

''وہ طرز جو غالبؔ سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی داغ بیل، میرؔ ڈال گئے تھے۔'' ۳۰

آثرؔ لکھنوی کے اس انتخاب میں ڈاکٹر امرناتھ جھا کا میرؔ پر لکھا گیا مقالہ شامل ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ان کا زمانہ وہ تھا جب اُردو زبان کی تعمیر ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود کسی دور میں بھی ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر امرناتھ جھا کی تحقیق کے مطابق ان کا سنِ پیدائش ۱۷۱۸ء اور سالِ وفات ۱۸۰۸ء ہے جو کہ عام طور پر میرؔ شناسوں کی اکثریتی رائے کے خلاف ہے۔ انھوں نے میرؔ کے حالاتِ زندگی کی خوشہ چینی مولانا عبدالباری آسیؔ کے نوشتہ مقدمہ کلیاتِ میرؔ مطبوعہ

نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء سے کی ہے۔

میؔر کے کلام میں بکثرت وہ الفاظ ملتے ہیں جو ہندو اور مسلمان یکساں طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کے اور ان کے معاصرین کے ہاں ایسی نحوی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جو اب متروک ہیں۔ اُنھوں نے اپنا تخلص بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں بعض اشعار میں لفظ ''جی'' یا ''صاحب'' کے اضافے نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

؎ میؔر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ان کو اپنی شاعرانہ جلالت کا پورا علم تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے اشعار آنے والی نسلیں عملاً فراموش نہ کریں گی۔

؎ بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

کیونکہ:

''میؔر کو قوت کے ساتھ اظہارِ خیال کی قدرت ملی تھی۔ وہ ذکی الحس تھا، تخیل میں وسعت و ہمہ گیری تھی، تنوع تھا، تلوّن تھا اور وہ ادائے مطلب میں سادگی سے کام لیتا ہے۔ اس کی بات دل سے نکلتی اور سامع کے دل میں جگہ کر لیتی ہے۔'' ۱۳۱

ان کے ہاں جامع اور پُرمغز اشعار بکثرت ہیں جن میں آفاقی صداقت یا تعمیم کا بیان ہے لیکن ان کے ہاں منظم اور مربوط فلسفۂ حیات نہیں ہے۔ ان کے تمام اشعار کی قدرِ مشترک محزونیت ہے لیکن دردمندی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دنیوی زیرکی و ہوش مندی بھی موجود ہے۔ ان کی دردمندی اور پژمردہ خاطری حقیقت سے لبریز ہے۔ صداقت اُن کی شاعری کو عام سطح سے بلند کر دیتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں آنسوؤں کے بجائے صرف آنسوؤں کا شبہ رہ جاتا ہے۔ ان کے کلیات میں مرثیے، مخمس، رباعیاں، مثنویاں، ہجو اور واسوخت بھی ہیں لیکن ان کی شاعری کا کوئی ذکر اس وقت تک مکمل نہیں

ہوسکتا جب تک ساقی و میخانہ اور میکش و محتسب کا تذکرہ نہ ہو۔

''مزامیر'' کے مطابق میرؔ کی عظمت تصوّف کے حوالے سے بھی ہے لیکن دردؔ کو ان پر اس حوالے سے فوقیت حاصل ہے۔ انھوں نے ''نکات الشعراء'' میں شاعری کے جن اصولوں کا ذکر کیا ہے، ان پر وہ کاربند بھی رہے ہیں۔ ہمہ گیر تخیل کے باوجود انھوں نے حقیقت کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ اگرچہ ان کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ ہے لیکن اس میں معانی کی کثرت ہے۔ ان کا عشق پاکیزہ عشق ہے اور وہ بنی نوع آدم کی عظمت کے قائل ہیں۔ وہ گوشہ نشین شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے دربدر کی خاک چھاننے کے ساتھ ساتھ فطرت کی بہترین عکاسی بھی کی ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ انھوں نے ادا نگاری کو عریانی اور فحاشی کے بغیر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس طرح روحانی لذّت تو ملتی ہے لیکن نفسانی اشتعال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگرچہ میرؔ کے زمانے میں اردو زبان تعمیری مراحل سے گزر رہی تھی لیکن اس زبان کے استعمال کے باوجود ہر دور میں ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ میرؔ کو اپنی غزل کی جلالت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ ادائے مطلب میں سادگی سے کام لیتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی باقاعدہ فلسفۂ حیات نہیں۔ محزونی ان کے اشعار کی مشترک قدر ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دنیوی، زیرکی اور ہوش مندی بھی پائی جاتی ہے۔

''انتخابِ میرؔ'' از مولوی نورالرحمٰن میں میرؔ کے حالاتِ زندگی کے بعد ''مقدمہ'' میں مصنّف لکھتے ہیں کہ جس طرح اُردو زبان میں ہندی، فارسی اور عربی وغیرہ کے الفاظ شامل ہیں، اسی طرح اُردو شاعری میں ہندوستانی، ایرانی اور عربی خیالات جمع ہیں۔ اُردو شاعری پر فارسی شاعری کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ فارسی شاعری کی ابتداء چوتھی صدی ہجری سے قبل ہوئی اور اُردو شاعری کی ابتداء گیارہویں صدی ہجری میں، جب کہ کمالِ نوعی دونوں کو حاصل ہے لیکن:

> ''یہ کمال فارسی نے دس یا نو صدیوں میں حاصل کیا اور اُردو نے تین میں۔'' ۳۲

بے شک آج اُردو شاعری مکمل نظر آتی ہے لیکن اس میں شاعری سے مراد صرف ایشیائی

شاعری ہے جو قدیم شاعری، غزل اور قصیدہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ غزل میں جذباتِ اصلی کی مصوّری، وارداتِ قلبی کی ترجمانی، تخّیل کی نزاکت اور محاکات کی لطافت ہوتی ہے اور اس میں میؔر سب سے بڑھ کر ہیں۔ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی شاعری زندہ ہے۔ بہت سے نقادوں نے ان کی سخن سنجی کی داد دی ہے۔ بے شک یہ اپنے اپنے دور کے مجدّد تھے لیکن انھوں نے ان کے سامنے سرِتسلیم خم کیا ہے۔ میؔر کے مفصّل حالات تذکروں میں شامل ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سیّد تھے۔ طبیعت میں تیزی اور غصہ تھا۔ اکبرآباد وطن تھا۔ دلّی وطن ثانی تھا لیکن انھیں دلّی سے بڑی محبت تھی۔ عمر کا آخری حصہ لکھنؤ میں گزارا۔ اس کے باوجود لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ سے بیزار رہے۔ کسی امیر کی کبھی مدح نہ کی۔ دولت کی ہمیشہ مذمّت کرتے رہے اور بعض شعراء سے ان کی نوک جھونک بھی رہتی تھی۔

میؔر کو زبان کی اصلاح اور تحفّظ کا بڑا خیال تھا، وہ اپنے آپ کو اہلِ زبان سمجھتے تھے اور تھے بھی۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے بعض الفاظ کو اپنا بنا کر استعمال کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا اصلی تلفّظ باقی نہیں رہا۔ انھوں نے بول چال میں غلط مروّج تلفّظ کے ساتھ الفاظ کو شاعری میں صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

؎ میؔر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

عمداً کا ''مٖ'' بول چال کی زبان میں متحرک ہے جب کہ صحیح بالسکون ہے۔

محاورہ کے حسن کے بارے میں مصنّف کا خیال ہے کہ:

''زبان کا لطف اور محاورہ کا حسن میؔر صاحب کے ہاں بہت ہے اور اس کو وہ اس خوبی سے نبھاتے ہیں کہ تغزّل کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔'' ۳۳

ضرب الامثال کے استعمال کے حوالے سے اگر میؔر کا کلام دیکھا جائے تو اُردو زبان میں اس سے بہتر مثالیں بہت مشکل سے ملیں گی۔ محاکات میں ان کو اس حد تک کمال حاصل ہے کہ حالات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ انھوں نے فارسی تراکیب اور دلکش

محاورات کو اُردو میں بڑی خوبصورتی سے ڈھالا ہے اور کہیں انھیں دوسرے شعراء کی طرح بجنسہٖ لے لیا ہے۔ ان کے ہاں حسرت و یاس، دل کی بربادی، دنیا کی بے ثباتی، نصائح و حکم اور رندانہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں رندانہ مضامین شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے پائے جاتے ہیں وگرنہ وہ بڑے پرہیزگار تھے۔

مولوی نورالرحمٰن کے مطابق میرؔ کی عمر سو سال تھی اور وہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ جبکہ زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ وہ ۱۱۳۶ھ یا ۱۱۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور نوے سال کی عمر تک اس جہانِ فانی میں رہے۔

''میر تقی میرؔ۔۔۔ حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام'' امیر حسن نورانی کی تصنیف ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کا پورا نام ''میر محمد تقی'' اور والد کا نام ''محمد علی'' تھا۔ سال پیدائش ۱۷۲۳ء ہے۔ انھیں شروع ہی سے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ دلّی آ گئے۔ ان کے حلیے اور لباس کے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ صاحب دبلے پتلے آدمی تھے۔ قد میانہ اور رنگ گندمی تھا، گھنی گول داڑھی چہرے پر خوش نما معلوم ہوتی تھی۔ آواز میں نرمی تھی۔ مزاج میں سنجیدگی اور متانت بہت تھی۔ باتیں رُک رُک کر کرتے تھے۔ چہرے پر غور و فکر کے آثار نمایاں رہتے تھے۔ اس زمانے کے رئیسوں اور شریفوں جیسا لباس زیب تن کرتے تھے۔ کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، کمربند کے بجائے چوڑا رومال، مشروع کا پائجامہ، نوک دار جوتا، ہاتھ میں جریب اور کمر میں سیدھی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔'' ۳۴

عادات و اطوار کے لحاظ سے وہ نہایت خوش اخلاق، دوست نواز اور وضع دار آدمی تھے۔ ان کے ہاں متانت اور سنجیدگی تھی، باتیں کم کرتے تھے لیکن زود رنج تھے۔ صاف گو اتنے تھے کہ دل میں جو بات ہوتی، وہی زبان پر آتی تھی۔

میؔر جب دلّی آئے تو صمصام الدّولہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ نادر شاہ درانی نے جب دلّی پر حملہ کیا تو صمصام الدّولہ مارے گئے اور میؔر کی ملازمت ختم ہو گئی۔ اس لیے وہ دوبارہ آگرہ آ گئے۔ کچھ دن آگرہ میں رہنے کے بعد دوبارہ دلّی گئے اور آرزؔو کے ہاں مہمان ٹھہرے جو ان کے بھائی کے خالو تھے جنھوں نے ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا اور انھیں جنون ہو گیا۔ سیّد سعادت خاں نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ اسی زمانے میں رعایت خان کی ملازمت اختیار کی جو کچھ دنوں بعد ترک کر دی اور نواب بہادر کے ہاں ملازمت کر لی۔ جب نواب بہادر قتل ہو گئے تو کچھ عرصہ بعد انھوں نے مہاناراِئن دیوان کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں دلّی خانہ جنگیوں کا مرکز بن گیا اور اسی دوران وہ چند دنوں کے لیے دوبارہ آگرہ بھی گئے لیکن پھر دلّی آ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی، اس لیے نواب آصف الدّولہ نے سفر کے لیے خرچ بھیج کر انھیں لکھنؤ بلایا اور درباری ملازمین میں شامل کر لیا۔ انھوں نے کافی مدّت لکھنؤ میں بسر کی مگر ان کو لکھنؤ سے محبّت نہ ہو سکی۔ وہ دلّی کو ہمیشہ یاد کرتے رہے۔

میؔر کے زمانے پر بحث کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ میؔر نے جب ہوش سنبھالا تو سارے ملک میں انتشار اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور دلّی پر تباہی و بربادی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ شریفوں کو اپنی عزت کا ہر وقت خوف دامن گیر تھا۔ ان حالات اور معاشی تنگی نے ان کو مغموم اور فکرمند بنا دیا۔ اس کے ساتھ ملکی شورشوں نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا اور وہ رنج وغم کی تصویر بن کر رہ گئے۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں نوے سال کی عمر میں وفات پائی اور اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن کیے گئے جہاں پر ان کی قبر کا کوئی نشان اب باقی نہیں ہے۔ میؔر کی شاعری کے متعلق مصنّف لکھتے ہیں:

> ''میؔر رنگِ تغزل میں آپ اپنی نظیر تھے۔ میؔر کی زندگی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں غم اور مایوسی کا اثر غالب ہے۔ سوز اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ عشق و محبت کے کوچے بھی میؔر کے دیکھے بھالے تھے۔ انھوں نے محبت کے چرکے سہے تھے۔ اسی لیے اس کی کیفیتوں کو بڑی صداقت اور خلوص سے بیان کیا ہے۔'' ۳۵

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے میؔر کے کلام کا جو انتخاب ''انتخاب کلام میؔر مع مقدّمہ'' کے نام سے کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ میؔر ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں وہ عالم گیر حُسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں، اس لیے ان کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا۔ وہ اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد علی متقی ایک متوکل اور گوشہ نشین درویش تھے۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ میؔر دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ میؔر اور آرزؔو کے تعلق کے حوالے سے مصنّف نے ''نکات الشعراء'' کے بجائے ''ذکرِ میؔر'' کے واقعات سے اتفاق کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میؔر صاحب اور خان آرزؔو کے تعلقات بے حد ناگوار اور تلخ تھے۔ ان کی تربیّت اور شاگردی کی روایت افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔'' ۳۶

ممکن ہے میؔر نے خان آرزؔو کی محبّت سے بھی کچھ فائدہ اٹھایا ہو لیکن شعر کا ذوق ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے وہ کسی کی صحبت یا شاگردی سے مستغنی تھے۔ میؔر کی زندگی سے متعلق واقعات سے وہ اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی مصائب و آلام کا سلسلہ تھی جو لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا۔ جب دلّی پر تباہی آئی تو اس کے بعد ۱۷۸۲ء میں نواب آصف الدّولہ کے بلانے پر وہ لکھنؤ چلے گئے اور باقی عمر لکھنؤ ہی میں گزاری۔ لکھنؤ میں ان کو بڑی عزت ملی اور لوگ دُور دُور سے ان کا کلام سننے کے لیے آتے۔ وہ اپنے کمال سے خود بھی واقف تھے:

؎ جہاں سے دیکھیے یک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

ان کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں:

> ''الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب، زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ میؔر صاحب کے

کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا
کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی
ہے جو لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی زبان کی فصاحت اور
سادگی، سوز و گداز، مضامین کی جدّت اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں
ہیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی
شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو
اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں
جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں، یہ
خاص انداز میرؔ صاحب کا ہے۔'' ۳۷

میرؔ کے والد بہت بڑے درویش تھے۔ جن کی صحبت نے انھیں درویش نہیں بھی تو درویش منش ضرور بنا دیا۔ ان کا کلام فصاحت و شستگی کا حامل ضرور ہے لیکن پڑھنے والے کے دل پر مایوسانہ اثر کرتا ہے، کیونکہ شگفتگی اور زندہ دلی اُن کی تقدیر میں نہیں تھی۔ وہ سراپا یاس و حرماں تھے۔ یہی حال ان کے کلام کا ہے، کیونکہ:

''اُن کا کلام اُن کی طبیعت و سیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور
غالبًا یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت و حقیقت سے خالی نہیں۔'' ۳۸

خان آرزوؔ کی بے مروّتی، دل آزار سلوک اور اپنی بے بسی کی وجہ سے انھیں جنون ہو گیا۔ اس کیفیت کو انھوں نے اپنی مثنوی ''خواب و خیال'' میں بیان کیا ہے۔ ان کے کلام میں فضول لفاظی نہیں اور نہ ہی اس میں دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور خلافِ عادت امور ہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا کلام بلحاظِ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے۔ کلام کی تاثیر کے حوالے سے ان کا رتبہ اُردو شعراء میں سب سے اعلیٰ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں رطب و یابس بھی ہے۔ ان کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوا ہے۔

میرؔ نے فرسودہ مضامین کو ایک نیاپن دیا ہے ان کے کلام کی خوبیوں کی وجہ سے ان کا کوئی

ہمعصران کے مقام تک نہیں پہنچ سکا۔ البتہ دؔرد ایسے شاعر ہیں جو کلام کی خصوصیات کے حوالے سے میؔر کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں بھی وہ گھلاوٹ، وہ سلاست و سادگی کے ساتھ سوز و گداز، تخیل کی وہ شان جو شاعری کی جان ہے، اس درجے کی نہیں جیسی میؔر کے ہاں ہے۔ میؔر انیس فصاحت میں بلند درجہ اور سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہ رکھتے ہوئے بھی میؔر کے مقام کو نہیں پا سکے۔

میؔر کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار کی بھی کمی نہیں لیکن اندازِ بیان وہی سادہ ہے۔ وہ نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین بیان کر جاتے ہیں۔

ے سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ان کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ، ان میں اندوہ و الم اور ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ظرافت ان کے کلام میں مطلق نہیں، چند ظریفانہ اشعار ہیں لیکن اتنے مبتذل کہ ان سے بدمذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں فارسیت کا رنگ زیادہ ہونے کے باوجود صاف اور ستھرے اشعار کی بھی کثرت ہے۔ انھوں نے بہت سے فارسی الفاظ کو اپنی صرف ونحو کے خراد پر چڑھا کر اُردو بنا لیا ہے۔

میؔر کا اصل رنگ غزل اور مثنوی ہی میں پایا جاتا ہے لیکن وہ غزل کے بادشاہ ہیں اور اس صنف کے حوالے سے اُن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بعض فارسی اشعار کے انھوں نے ترجمے بھی کیے ہیں لیکن اس ترجمے کا حُسن اصل سے بھی بڑھ گیا ہے:

ے دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی (سعدؔی)

ے پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے (میؔر)

میؔر کے کلام پر ان کی طبیعت اور سیرت کا تمام شاعروں سے زیادہ اثر تھا۔ ان کی سیرت اُن کے کلام سے کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔ ان کے صبر و استقلال، قناعت و بے نیازی، غیرت اور وضع داری

انھیں کمالِ انسانیت پر پہنچا کر فرشتوں سے بڑھا دیتی ہیں۔ ان کے کمال کی قدر اس زمانے میں ان کے کردار کی وجہ سے ہوئی۔ ان کا اچھوں اچھوں نے احترام کیا۔ وہ اپنے کمال کے سامنے کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور جا و بے جا بد دماغی کر بیٹھتے تھے۔ ان کی قسمت میں آرام و راحت، زندہ دلی اور مسرت نہیں تھی لیکن ان حالات کے باوجود انھوں نے خودداری کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کا کلام اور سیرت دونوں قابلِ مطالعہ ہیں جنھوں نے مل کر ان کا رتبہ اردو شعراء میں نہایت بلند کر دیا ہے۔

ان کی شاعری کی قدر ان کے زمانے میں بے انتہا ہوئی لیکن بعد کی شاعری پر ان کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اہلِ لکھنؤ ان کی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود اس رنگ کو اس لیے اختیار نہ کر سکے کہ ان کا معاشرہ تصنّع کا شکار تھا اور ادب معاشرے ہی کا عکس ہوتا ہے۔ جب اس معاشرے پر سے تصنّع کا اثر کچھ زائل ہوا تو میر مجروحؔ اور مولانا حالیؔ کے کلام میں کچھ کچھ میرؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس آئے یا نہ آئے لیکن ان کا کلام پھر بھی اسی شوق و ذوق سے پڑھا جائے گا۔

مولوی عبدالحق کے مطابق میرؔ کے والد متوکّل انسان تھے جو گوشہ نشین رہے۔ آرزوؔ اور میرؔ کے تعلقات بے حد ناگوار اور تلخ تھے۔ ان کی زندگی مصائب و آلام سے بھرپور تھی جس کی وجہ سے انھیں شگفتگی اور زندہ دلی نصیب نہ ہوئی۔ ان کا کلام تاثیر کے لحاظ سے اُردو شعراء میں سب سے اعلیٰ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں رطب و یابس کا وجود بھی ہے۔ ان کی سیرت ان کے کلام سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ اس لیے اپنے زمانے میں ان کی عزت، کلام اور سیرت دونوں کی وجہ سے ہوئی۔ مجروحؔ اور حالیؔ کی شاعری پر میرؔ کی شاعری کا کچھ کچھ اثر ضرور ہے۔

''دیوانِ میرؔ'' مرتبہ علی سردار جعفری کے دیباچے میں مرتب لکھتے ہیں کہ میرؔ کی عظمت کا کوئی منکر نہیں ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں خون کی ہولی کھیلی گئی تو لوگوں کو ان کے کلام میں اپنا درد محسوس ہوا۔ اس کے بعد اسے ہندوستان اور پاکستان کے رہنے والوں نے کلیجے سے لگا لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے کئی الفاظ بدل گئے ہیں اور بعض دفعہ تو کم تر درجے کے شعراء کے شعر کلامِ میرؔ میں داخل ہو گئے ہیں۔ نقادوں نے جب اس سے دھوکا کھایا تو انھوں نے ان کے کلام کو سمجھنے کا آسان طریقہ

''بہتر نشتروں کا شاعر'' رائج کیا۔ لوگوں نے ان کے کلام میں صرف ''آہ'' کو دیکھا ہے جب کہ ''واہ'' کے حصے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان کی شاعری جتنی سادہ اور دل نشین ہے، اتنی ہی ٹیڑھی، بانکی، ترچھی اور تیکھی بھی ہے۔ ان کے ہاں جتنی نرمی ہے، اتنی ہی تلخی بھی ہے۔ ان کے کلام میں جو جھنجھلاہٹ ہے، وہ ان کے کلام میں غم کے سمندر کی وجہ سے ہے۔ یہ غم ان کا محض ذاتی غم نہیں بلکہ کائناتی ہے۔ انھوں نے بادشاہوں اور امراء کو خوش کیا تو محض قصیدوں اور مثنویوں سے لیکن غزل کا دامن داغدار نہیں ہونے دیا۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے، کیونکہ وہ اپنے عہد میں رونما ہونے والے حالات میں ذاتی طور پر شریک تھے۔

میرؔ کی شاعری نے زبان کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اُردو زبان مقامی بولیوں سے آزاد ہو کر ایک مستند اور ہندوستان گیر زبان بن گئی ہے۔ بقول مرتّب:

> ''میرؔ اور ان کے ہم عصر شعراء ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعروں میں ڈھال کر خوب صورت اور ادبی بنا رہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر اظہار و بیان کے لیے وسعتیں پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ کر رہے تھے اور محاوروں کا ترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جا رہے تھے۔'' ۳۹

میرؔ کی شاعری پر ولیؔ کی شاعری کے اثرات ہیں لیکن ان کی شاعری ولیؔ کی شاعری کی طرح معصومیّت اور معشوق نوازی تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ ان کے ہاں حسن و عشق کے موضوعات اور تنقیدِ حیات گھل مل گئے ہیں۔ انھوں نے فارسی غزل کی روایت سے دامن بچا کر ہندوستانی لب و لہجے کو ترجیح دی ہے اور یہ عوامی لہجہ ان کے بعد نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں منتقل ہوا۔

علی سردار جعفری ترقی پسند نقاد ہیں۔ انھوں نے میرؔ کی شاعری کے سماجی پہلوؤں میں بھی دلچسپی لی ہے۔ انھوں نے ہندی کے قارئین کے لیے میرؔ کا کلام دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر اس ایڈیشن کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ میرؔ کی عظمت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے زبان کی ترقی میں بھی

اہم کردار ادا کیا۔ ان کے کلام میں کم تر درجے کے شاعروں کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ نقادوں نے میؔر کی شاعری کے دردیہ پہلو پر زیادہ توجہ دی ہے جبکہ ان کے ہاں نشاطیہ رنگ بھی کم نہیں ہے۔

"کلیاتِ میؔر" مرتبہ عبدالباری آسی میں مصنف لکھتے ہیں کہ میؔر کے والد کا نام محمد علی یا عبداللہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو سیّد کہتے تھے اور سیّد ہی مشہور تھے۔ ان کا سالِ پیدائش ۱۱۳۵ھ جب کہ سالِ وفات ۱۲۲۵ھ بمطابق ۱۸۰۸ء ہے۔ والد کی وفات کے بعد انھوں نے دلّی کی طرف جو سفر کیا اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ دلّی کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہ واپس آ گئے اور جب دوبارہ دلّی گئے تو آرزؔو کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ میؔر کے آرزؔو سے تعلقات ان کی بیٹی سے عشق کی وجہ سے خراب ہوئے اور اسی وجہ سے ان کے دماغ پر بھی اثر پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آرزؔو کے ساتھ تعلقات کی خرابی کی وجہ مذہبی اختلافات بھی ہو سکتے ہیں۔

میؔر نے کئی لوگوں سے علم حاصل کیا اور فارسی میں ایک ادیب کا درجہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عربی میں مطوّل تک استعداد حاصل کر لی۔ ان کے ذوقِ شعر کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

> "میؔر فطری شاعر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دل میں ذوقِ شعر ازلی تھا۔" [۱۴۰]

میؔر، آرزؔو کے شاگرد بھی تھے لیکن اس کا انھوں نے "ذکرِ میؔر" میں اظہار نہیں کیا۔ انھوں نے دلّی کے پرآشوب دور میں زندگی گزاری اور زمانے کے تلخ حقائق کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس کے باوجود کہ دلّی پر تباہی آئی، وہ ادبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ دلّی کی تباہی کے بعد جب ہر حوالے سے حالات ان کے مخالف ہو گئے تو وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ بقول مصنف:

> "ہم عصروں کی مخالفت، دلّی کی تباہی و بربادی، معیشت کی فکر، احبا و اعزا کی جدائی، آئے دن کی مصیبت نے میؔر صاحب کو نہ صرف دل برداشتہ بلکہ عزلت گزین اور صحیح معنی میں گوشہ نشین بنا دیا۔" [۱۴۱]

اسی اثنا میں ان کی خوش قسمتی یا حسنِ اتفاق کہ نواب آصف الدّولہ نے انھیں لکھنؤ بلا لیا۔ لکھنؤ میں ان کی وہی قدرومنزلت ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن وہ ہمیشہ دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے۔ عادات و اطوار کے حوالے سے وہ نہایت خوددار، غیّور، سنجیدہ اور دوستوں کے قدردان تھے لیکن ہر ایک کے ساتھ اختلاط نہیں بڑھاتے تھے۔ اس لیے مغرور معلوم ہوتے تھے۔ ان کے مزاج میں استغنا حد سے زیادہ تھا۔ وہ اپنی خودداری کے سامنے بڑی سے بڑی دولت کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کی وضع سپاہیانہ تھی۔ اسی وجہ سے ہر افتاد کو مردانہ وار برداشت کیا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ان کی دنیا سے نفرت بڑھتی گئی۔ ان کے ہاں غرور، تکبّر اور تنگ مزاجی کے جس رویّے کا احساس ہوتا تھا، اس کی وجوہات یہ تھیں:

۱۔ زمانے کے پے در پے مصائب کا سامنا

۲۔ جنون، جس کے اثرات صحت یاب ہونے کے باوجود باقی رہے

۳۔ حد درجہ کا احساسِ کمال

۴۔ درویشانہ ماحول میں پرورش

بحیثیت شاعر ہر نقاد نے ان کی شاعری کی تعریف کی ہے بلکہ انھوں نے خود بھی اپنے کلام کے بارے میں رائے دی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ باکمال شاعر ہی نہیں، کامل نقاد بھی تھے۔ شاعری میں جو رتبہ ان کو حاصل ہے، اس رتبے تک بعد میں آنے والے تمام شعراء اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود نہ پہنچ سکے۔ مصنّف نے اس عظمت کا سبب ان کے کلام کی جن خوبیوں کو دیا ہے وہ یہ ہیں:

> ”(۱) کیفیاتِ حسن و عشق، وارداتِ محبتِ حقیقی و مجازی (۲) نفسیات۔ فلسفہ حیات (۳) ندرتِ بیان، اسلوبِ بیان (۴) آلام و مصائب کے تلخ تجربات اور ان کے اظہار کی قدرت (۵) عاجزانہ یا عاشقانہ طنزیات جو اکثر اشعار کی تہ میں موجود ہیں (۶) تخیّل کی بلندی (۷) اکثر عام اور پیش پا افتادہ مضامین سے احتراز (۸) زبان کی سادگی، سلاست (۹) روزمرہ اور محاورات کی صفائی (۱۰) الفاظ میں موسیقیت اور ترنّم کے ساتھ روانی (۱۱) آورد سے

احتراز آمد کی پابندی (۱۲) تلمیحات دلنشین (۱۳) معلوماتِ عامہ کی وسعت (۱۴) کہیں کہیں تناسب الفاظ جو ایہام کی حد تک پہونچتا ہے (۱۵) فارسی ترکیبوں کا نہایت برمحل استعمال (۱۶) بعض جگہ بدیع استعارے اور نازک تشبیہیں (۱۷) کہیں کہیں ہلکی سی متصوفانہ روش (۱۸) ایسی ظرافت جس کو زہرخند سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے (۱۹) بے باکی اور صاف گوئی (۲۰) نہایت دل کش اور رواں بحروں کا انتخاب (۲۱) دنیا کے سراپا زوال اور فانی ہونے کے عبرت ناک مرقعے۔'' ۴۲

اصنافِ کلامِ میرؔ کا ذکر کرتے ہوئے مصنّف بیان کرتے ہیں کہ ان کی غزلیات بحیثیت مجموعی سوز و گداز سے پُر ہیں لیکن زمانے کی عام روش نے امارد پرستی اور شیخ و زاہد کی ہجو رکیک سے ان کی غزلوں کو بھی پاک نہیں رہنے دیا لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز ہیں اور دردؔ کے سوا ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ قصائد میں وہ سوداؔ اور ذوقؔ کی طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ اگر چہ رباعیات بھی انھوں نے کہی ہیں لیکن انھیں بھی کوئی نمایاں جگہ نہیں دی جا سکتی، کیونکہ وہ ان کے مصرفِ صحیح کے پابند نہیں رہے۔ مخمّس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند کو اکثر انھوں نے معتقداتِ مذہبی کے لیے مخصوص کیا ہے۔ واسوخت کا موجد میرؔ کو بتایا جاتا ہے لیکن مصنّف نے اُردو اور فارسی میں اس کے نمونوں کا ذکر کیا ہے۔ ہفت بند کے بارے میں بھی مصنّف کا خیال ہے کہ ممکن ہے یہ اُردو میں نئی چیز ہو، اگر چہ یہ منقبت کے لیے مخصوص ہے لیکن نہایت عمدہ ہے۔ مثنوی کے وہ موجد ہیں اور اس قسم کے قصوں کو شاید انھوں نے ہی اُردو میں پہلے نظم کیا ہے۔ ان کے اکثر معاصرین نے بھی مثنویاں لکھی ہیں جن کے بعد ان کی استادی کے احترام کے سوائے کوئی خاص امتیازی شان ان میں باقی نہیں رہی لیکن ان کی مثنویاں جن کے بارے میں خیال ہے کہ ادنیٰ درجے کی ہیں، وہ بھی نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں بلکہ جن مثنویات میں تفصیلات کی گنجائش تھی، ان کو دیکھ کر تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مثنوی کے وہ بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔ مدحیات میں ان کا درجہ سوداؔ سے بلند نہیں۔ ہجویات کے حوالے سے دیکھا جائے تو بدترین ہجو وہ ہے جس میں ذاتیات کے جھگڑے، مذہبی تعصّبات اور

فواحش موجود ہوں۔ یہ بات سوؔدا کے ہاں بہت زیادہ ہے جب کہ میؔر کا دامن زیادہ تر ان باتوں سے پاک ہے۔ مصنف نے میؔر کی جن تصانیف کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ کلیاتِ نظم اُردو:
جس میں غزلیات کے چھے دیوان، مثنویاں، تضمینیں، قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، قصائد وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ نکات الشعراء

۳۔ ذکرِ میؔر

۴۔ فیضِ میؔر

۵۔ مجموعہ مراثی (یہ مجموعہ قلمی پیمانہ $\frac{۱۷}{۲۷}$ پر ۱۲۰ صفحات پر ہے)

۶۔ دیوان فارسی

میؔر کی فارسی شاعری، اُردو شاعری کے پائے کی نہیں لیکن پھر بھی انھیں ہندوستان کے اچھے فارسی گو شعراء کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے میؔر کے ان دوستوں کا ذکر کیا ہے جو شاعر تھے، ساتھ ساتھ ان کے شاگردوں اور حریفوں کا بھی ذکر ہے۔ میؔر کے اخلاف و اعزاء کی فہرست یہ ہے:

۱۔ دو بیٹے: میر عسکری عرف میر کلو عرؔش، میر فیض علی فیضؔ۔

۲۔ ایک بیٹی: المتخلص بیگمؔ۔

۳۔ میر محمد رضی: حقیقی بھائی

۴۔ محمد حسن، محمد محسن: سوتیلے بھائی

۵۔ خان آرزوؔ: سوتیلے ماموں یا خالو

۶۔ محمد حسین کلیمؔ: بہنوئی

۷۔ تجلیؔ: بھانجا اور داماد

۸۔ محمد محسن: برادر زادہ

مولانا عبدالباری آسی نے میر کا سالِ وفات ۱۸۰۸ء لکھا ہے جبکہ اکثر میر شناسوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے مذہبی اعتقادات کے حوالے سے مصنف نے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی، صرف میر کے کہنے اور مشہور ہونے کے بموجب انھیں سیّد تسلیم کیا ہے۔ آرزو کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی کا سبب میر کے عشق کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی اعتقادات کو بھی گردانا ہے۔ میر اگر چہ فطری شاعر تھے لیکن اس کے باوجود وہ آرزو کے شاگرد تھے جس کا اظہار انھوں نے آرزو کے ساتھ اختلافات کی بنیاد پر نہیں کیا۔

''کلیاتِ میر'' ظلِ عباس عباسی کا مرتب کردہ ہے۔ اس کو تصحیح و اضافہ کے ساتھ احمد محفوظ نے پیش کیا جس کی نگرانی شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ تمہید میں شمس الرحمٰن فاروقی نے محمد حسن عسکری کی اس بات کو سراہا ہے کہ ہر بڑے شاعر کا منکر ہے لیکن میر کا منکر ڈھونڈنے سے ہی ملے گا۔ اردو شاعری محض فارسی شاعری کا تتبع نہیں ہے۔ میر کے ہاں مقامی اور آفاقی حقیقتیں ایک ہونے لگتی ہیں۔

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

انھوں نے جس طرح روزمرہ بول چال کی زبان کو شعر کی زبان کا رتبہ دیا اسی طرح انھوں نے بے رنگ زندگی کو مابعدالطبیعاتی اور ماورائی دنیاؤں کے عالم میں بدل دیا۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''میر کو جتنی اور جیسی دلچسپی اس بظاہر سادہ اور سرسری، غیر دانشورانہ غیر تعقلانہ زندگی اور اس کے مظاہر سے ہے وہ کسی اور شاعر کو نہیں اور اس زندگی اور اس کے مظاہر سے جتنے معنی میر نے نکالے ہیں وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھے۔'' ۴۳

میر کے بہتر نشتروں کے انتخاب کی مخالفت کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ میر، نظیر اکبرآبادی مصحفی، آتش، ذوق اور غالب کی طرح انتخاب کے شاعر نہیں بلکہ میر، انیس اور اقبال کی طرح کلیات کے شاعر ہیں۔ میر کے اشعار میں ڈھیلی سست بندش نہ ہوگی، دولخت شعر نہیں ملے گا، بھرتی کے الفاظ میر کے

ہاں بڑی تلاش کے بعد اِکا دُکا ملیں گے۔ کمزور یا نامناسب تشبیہیں اور استعارے نہیں ہیں۔ کم روانی والا شعر تو میرؔ کے ہاں ساری عمر کی تلاش کے بعد بھی نہیں ملے گا۔

میرؔ کے زمانے میں جو شعر کی خوبی کے معیار تھے ہم نے میرؔ کی شاعری کو ان پر پرکھا ہی نہیں۔ میرؔ کے بارے میں غلط تنقیدی آراء کی وجہ سے ہم نے میرؔ کا کلیات پڑھا ہی نہیں۔ آثرؔ لکھنوی، محمد حسن عسکری، سردار جعفری اور ناصر کاظمی کے انتخابات نے میرؔ کے بارے میں صحیح تر تنقیدی رویّوں کو پروان چڑھانے میں بڑی مدد دی ہے لیکن میرؔ پھر بھی انتخاب کا نہیں، کلیات کا شاعر ہے۔

میرؔ ہر کس و ناکس سے اپنی عظمت کا لوہا منوانے میں اس لیے کامیاب رہے ہیں کہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے مطالب نکالے ہیں۔ ''تعارف'' کے زیرِعنوان رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ناسخؔ کا جو تھوڑا بہت لحاظ میں کرتا ہوں وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے یہ کہ دیا کہ ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں'' میرؔ کے کلام کی کسی نے پیروڈی نہیں کی۔ اُن کے کلام کی تاثیر عالمگیر ہے۔ وہ صرف ہمارے ہی محبوب شاعر نہیں بلکہ تمام دوسرے افراد اور ممالک کے یکساں محبوب شاعر ہیں۔ ان کی زبان منفرد و ممتاز ہے۔

میرؔ نے دوسرے شعراء کی طرح دوسری زبانوں کے الفاظ، تراکیب، بندش محاورہ، روزمرہ یا انواع و اقسام کے علوم و فنون یا نعروں کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے صرف اردو اور اپنے مخصوص لب و لہجہ سے کام لیا ہے۔ میرؔ کی زبان حسن و عشق کے ہر تصوّر کو واضح کرتی ہے اور اسے دلنشین بنا دیتی ہے۔ میرؔ کی زبان کی تقلید کرنے والوں کا بھی ہم احترام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی زبان میں منافقت نہیں ہوسکتی۔

قاضی عبدالودود نے ''مختصر حالاتِ زندگی'' کے زیرِعنوان مقالے کو پانچ ابواب: (۱) آگرہ (۲) دہلی، (۳) کمبھیر وغیرہ (۴) دہلی میں دوبارہ قیام اور (۵) لکھنؤ میں تقسیم کیا ہے۔

مصنّف نے میرؔ کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت ذکرِ میرؔ سے مدد لی ہے لیکن جہاں جہاں اختلافِ رائے محسوس کیا اسے بھی حاشیے میں وضاحتی نوٹ کے ساتھ دے دیا ہے۔

میرؔ نے اپنے بزرگوں کے بارے میں فاطمیت کا دعویٰ کیا ہے جس سے مصنّف نے اختلاف کرتے ہوئے انھیں صدیقی تسلیم کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنّف نے میرؔ کے اس دعویٰ سے بھی

اختلاف کیا ہے کہ ان کے آباؤاجداد فوجداری نواح آگرہ پر فائز تھے۔ میر کے والد کا نام محمد علی تھا۔ ان کی پہلی بیوی خان آرزو کی بہن تھی۔ دوسری بیوی جو میر کی ماں تھی، مصنف نے اس کے بارے میں گمان کیا ہے کہ وہ اس وقت کے معیارِ شرافت پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔

میر کے والد کے وہ واقعات جن کا ذکر ''ذکرِ میر'' میں ہے، مصنف نے انھیں کو آگے بڑھایا ہے لیکن بعض ایک مقامات پر میر کے بیان کردہ واقعات سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں میر کی اختراع قرار دیا ہے۔ امان اللہ جب فوت ہوئے تو میر کی عمر دس سال تھی۔ میر نے اپنے سوتیلے بھائی کے حوالے سے اپنے باپ کے جو الفاظ درج کیے ہیں مصنف کا خیال ہے کہ میر نے راست گفتاری سے کام نہیں لیا۔ صمصام الدولہ کے پاس میر کا عرضی پر دستخط کرنے کے حوالے سے بھی مصنف اس بات سے اختلاف کرتا ہے کہ میر وہاں پر زور سے ہنسے۔

''دہلی میں قیام'' کے حوالے سے مصنف کا خیال یہ ہے کہ میر خان آرزو کے ہاں مقیم ہوئے۔ جب میر کچھ کہنے کے قابل ہوئے تو میر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے ماموں کو خط لکھا کہ میر ''فتنۂ روزگار'' ہے۔ اس کے بعد خان آرزو نے میر سے بدسلوکی شروع کر دی۔ مصنف نے اس بات سے مکمل اتفاق نہیں کیا کیونکہ فریق ثانی کا بیان ان کے سامنے نہیں جس کی بنیاد پر میر کے قول کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے لیکن ان کا خیال یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اس حد تک دشمنی ہرگز نہیں کی کہ ان کی جان لینے کے درپے تھے۔

آرزو کے رویّے کی وجہ سے میر پر وحشت طاری ہوگئی اور فخرالدین کی بیوی جو علی متقی کی مرید تھی۔ میر کے علاج پر بہت روپیہ صرف کیا۔ میر، آرزو کے سلوک سے تنگ آ کر ان کے گھر سے نکل آئے اور رعایت خاں کے پاس آ گئے اور تنگدستی سے نجات پائی۔ رعایت خاں کی اس فرمائش پر کہ وہ اپنے اشعار گویّے کو سکھلائے۔ میر اس پر راضی نہ تھے۔ انھوں نے چند شعر قوال بچے کو سکھا تو دیے لیکن اس قدر بددل ہو گئے کہ خانہ نشین ہو گئے اور استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد میر، جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاں ملازم ہو گئے۔ جاوید خاں کو صفدر جنگ نے قتل کرایا تو میر بیکار ہو گئے۔

''کمبھیر وغیرہ'' کے زیرِعنوان مصنف نے بیان کیا ہے کہ میر نے آرزو کی ہمسائیگی چھوڑ دی۔

راجہ جگل کشور، میرؔ کو اپنے گھر لے گئے۔ انھیں کی وساطت سے میرؔ، راجہ ناگرمل کے ملازم ہو گئے۔ درّانی کے حملے کے بعد راجہ جگل کشور کی بیوی کے ہمراہ برسانہ گئے اور وہاں سے کمبھیر پہنچے۔ یہ راجہ سورج مل کے قلعوں میں سے ایک تھا، اس عہد میں راجہ ناگرمل نے اسے اپنا مستقر بنا لیا تھا اور میرؔ بھی وہاں اس کے زیرِ سایہ رہے۔ پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کے بعد راجہ ناگرمل میرؔ کو ساتھ لے کر دلّی گئے۔ راجہ ناگرمل دوسری بار آگرہ گئے تو میرؔ پھر ان کے ساتھ ساتھ پندرہ دن قیام کے بعد کمبھیر واپس آ گئے لیکن میرؔ کی راجہ کے ساتھ بھی نہ بن آئی اور ان سے علیٰحدہ ہو گئے۔

''دہلی میں دوبارہ قیام'' کے زیرِ عنوان مصنّف لکھتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد میرؔ رائے بہادر سنگھ راجہ ناگرمل سے ملے اور حقیقت حال بیان کی اور انھوں نے مقدور بھر ان کی مدد کی۔ اس بار میرؔ جب دلّی آئے تو سوداؔ، قائمؔ، سوزؔ وہاں پر نہیں تھے بلکہ دردؔ، مظہرؔ اور حاتمؔ تھے۔ میرؔ کا اگر کوئی حریف تھا تو وہ صرف حاتمؔ۔

''لکھنؤ'' کے زیرِ عنوان مصنّف بیان کرتے ہیں کہ سوداؔ کی وفات کے بعد آصف الدّولہ کو خیال آیا کہ میرؔ کو بلوانا چاہیے۔ میرؔ گئے، آصف الدّولہ سے ملاقات ہوئی انھوں نے اپنا کلام سنایا اور میرؔ کا کلام سنا اور پھر میرؔ نواب کے ملازمین میں داخل ہو گئے اور صاحبِ سفینۂ ہندی کا بیان ہے کہ ماہانہ تنخواہ دو سو روپے تھی۔

میرؔ کے لکھنؤ میں شادی کرنے کے خیال سے مصنّف متفق ہیں کیونکہ دوسرے بیٹے حسن عسکری (عرش) اور بڑے بیٹے فیض علی فیضؔ کی عمروں میں بڑا فرق ہے اور ان کا ایک ماں سے ہونا خلافِ قیاس ہے۔ انھیں آصف الدّولہ کے زمانے میں مشاہرہ برابر ملتا رہا لیکن یہ مشاہرہ سعادت علی خاں کے عہد میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد مصنّف نے اس دور کی کچھ مثنویوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک آئینہ دار کی مذمّت میں ہے۔ مثنوی دم الفضول، معاملاتِ عشق اور نہنگ نامہ بھی اسی عہد کی مثنوی ہے۔

''میرؔ کی آپ بیتی'' ترجمہ نثار احمد فاروقی، اس کلیات میں شامل ہے اور اس پر وضاحتی نوٹ بھی دیے گئے ہیں۔ شیخ کلیم اور اکبر آبادی کو میرؔ نے اولیائے کاملین میں سے لکھا ہے جبکہ ان کے ملفوظات وقائع حالات وغیرہ نہیں ملتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے آدمی نہ تھے۔ میرؔ نے جہاں پر والد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ علی متقی کے خطاب سے ممتاز ہوئے وہاں پر یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ

خطاب کس نے دیا جبکہ ان کا نام میر محمد علی تھا۔ ان کے والد کے معاویہ کے بارے میں عقائد سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ میرؔ کے والد سنی تھے لیکن بعد میں شیعیت کی طرف مائل ہو گئے۔ میرؔ کے والد نے بیٹے کو عشق کا پیغام دیا لیکن عشق کی خصوصیات میرؔ کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتیں۔

میرؔ امان اللہ کا، جوان کی محبت میں گرفتار ہونا اور پھر اس جوان کا آنا اور میر امان اللہ کا اسے ''جوانِ عزیز'' کے نام سے مخاطب کرنا اور میرؔ کا ''ذکرِ میرؔ'' میں لکھنا کہ وہ عالم میں مشہور ہوا۔ مصنف اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میرؔ نے اس کا اصلی نام تک ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی ''ذکرِ میرؔ'' کے علاوہ میر امان اللہ اور علی متقی کا کہیں نام ملتا ہے۔

میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں ''درشانِ اوست'' لکھ کر ''لولاك لما خلقت الافلاك '' کا جس طرح حوالہ دیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی ہے لیکن اسے حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے، اکثر علمائے حدیث نے اسے موضوع بتایا ہے۔ میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں نصرت یار خان کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ صوبہ دار تھا جبکہ نصرت یار خان کا آگرہ کا صوبہ دار ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہاں پر میرؔ کے حافظہ نے صحیح کام نہیں کیا۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''جہاں میرؔ نے بہت اختصار و اجمال سے کچھ اپنے خاندان کا بیان کیا ہے، رمز و کنائے کے انداز میں اپنے والد کے حالات اور کلمات لکھے ہیں؛ ان کے ہمعصر درویشوں کی باتیں بیان کی ہیں، ان میں سے بیشتر میرؔ کے اپنے ذہن کی ایجاد ہیں۔'' ۴۴

میرؔ جب دلّی آتے ہیں تو ان کا انداز آپ بیتی لکھتے وقت سیاسی اور تاریخی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ میرؔ نے دوبارہ تیس سال کے بعد اپنا آگرہ سے جانا لکھا ہے لیکن مصنف کے خیال کے مطابق میرؔ بائیس، تیئس برس کی عمر میں تیسری بار آگرہ گئے ہیں۔ مصنف میرؔ کی آپ بیتی کے آخری حصے کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی آپ بیتی کا آخری حصہ ایک ڈائری کی شکل میں ہے جس میں واقعات اشاراتی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر ذرا

سی محنت کی جائے تو ان عبارتوں کو تاریخ کے اعتبار سے بھی
مدوّن کیا جا سکتا ہے۔'' ۴۵؎

ظلِ عباس عباسی نے ''میر کا ذکر تذکروں میں'' کے زیرِ عنوان ان تذکروں کا ذکر کیا ہے جن میں میر کے بارے میں آراء شامل ہیں۔ ان تذکروں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں شامل آراء کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن انھوں نے ان تذکروں میں شامل آراء کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے۔

''میر کے مطالعہ کی اہمیت'' کے زیرِ عنوان آل احمد سرور بیان کرتے ہیں کہ اُردو شعر و ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود ہمارے اکثر شعراء کے دواوین یا تو دستیاب ہی نہیں یا ان میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں صحیح اشاعت کا بڑی حد تک اہتمام کیا گیا ہے۔

میر کی عظمت کے متعلق کچھ کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ہر دور نے انھیں عظیم شاعر تسلیم کیا ہے اور مشکل اس لیے کہ تقلیدی رنگ غالب آ گیا اور یہ ادب کی ترقی کے لیے مضر ہے۔ اس لیے میر کی مسلمہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے دورِ حاضر کے جامع تنقیدی اصولوں کی روشنی میں میر کو سمجھنا ضروری ہے۔

میر کے حالات و واقعات کو صرف اور صرف ''ذکرِ میر'' کے حوالے سے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں تسلیم کر لینا درست نہیں۔ تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ میر کی زندگی اور کلام کے حوالے سے جو پہلو ابھی تک تشنہ ہیں ان کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

۱۔ میر اور خان آرزو کے بگاڑ کی وجہ۔

۲۔ ''ذکرِ میر'' اور ''نکات الشعراء'' میں آرزو کے متعلق متضاد باتیں۔

۳۔ امراء کا متوسّل رہنے کے باوجود اپنی درویشی پر زور کس لیے؟

۴۔ گھریلو ماحول، اکبرآباد کی زندگی، دلّی میں عنفوانِ شباب کا زمانہ، دیوانگی، امراء سے مراسم، لکھنؤ کی زندگی، آصف الدولہ اور ان کے معاملات، معاصرین سے تعلقات۔

۵۔ میر کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ۔

مصنف میرؔ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں جن حقائق تک پہنچے ہیں ان کے مطابق میرؔ کو بچپن میں مہربان چچا اور شفیق باپ کی موت کی وجہ سے محرومی کا احساس ہوا۔ بھائی نے اچھا سلوک نہ کیا۔ محرومی اور ظلم کا احساس اکٹھا ہو گیا۔ دلّی میں خان آرزوؔ اور میرؔ کے مزاج میں فرق کی وجہ سے وہ خان آرزوؔ کے گھر سے رخصت ہو گئے۔ خان آرزوؔ کے ہاں رہتے ہوئے جو چوٹیں انھیں لگیں تھیں انھیں ساتھ لیے ہوئے اپنی انانیت کے سہارے زندگی کے خارزار میں نکل کھڑے ہوئے۔ میرؔ دیوانے نہیں تھے لیکن انھیں دیوانگی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ باپ اور چچا سے انھیں چند اخلاقی اور متصوفانہ تصورات ملے تھے۔ وہ اعصاب زدہ ضرور تھے لیکن وہ زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے لیکن تخیل کی مدد سے اس پر پردہ تو ڈال سکتے تھے۔ دلّی کی معاشرت کو سینے سے لگا کر لکھنؤ کی جنت پر حقارت سے نظر تو ڈال سکتے تھے۔ دلّی کی بربادی، انسانیت اور تہذیب کی بربادی اور مٹتے اخلاق و اقدار کو محسوس تو کر سکتے تھے۔ میرؔ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان نکات کا سمجھنا ضروری ہے۔

میرؔ کی شاعری اس کی اہمیت اور قدر و منزلت کے متعلق اختلاف نہیں ہے لیکن خصوصیات کے تعین اور مدارج کے متعلق جزوی اختلافات موجود ہیں۔ شروع میں میرؔ کی عظمت کا احساس دلانے میں جو نقاد شامل ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق، وحیدالدّین سلیم، جعفر علی خاں اثرؔ اور مجنوں گورکھپوری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے میرؔ کی سادگی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے جبکہ مصنف کے خیال میں:

> ''سادگی یا رنگینی سے پہلے خیال کی ندرت اور اظہار کی کیفیت ضروری ہے۔ یہ کیفیت جب سادگی لیے ہوتی ہے تو زیادہ عام فہم ہوتی ہے۔۔۔ میرؔ کی شاعری بھی ایک بت ہزار شیوہ کی طرح ہے۔ وہ ہمیں جو بصیرت عطا کرتے ہیں اس کی کئی تہیں ہیں۔'' ۴۶

میرؔ کی شاعری میں وہ احساس ہے جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی شاعری ماضی کے دھندلکے کو چیر کر ہمیں جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ ہمارے حال اور مستقبل دونوں میں رہنمائی کر سکتی ہے۔

میرؔ کی ذاتی زندگی اور ماحول، دونوں میں بڑے بڑے طوفان ہیں۔ یہی ان کی شخصیت ہے اور ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے ہاں عشق کا تصوّر دھندلا نہیں بلکہ ایک شعلۂ بے باک ہے۔ ان کا عشق جنسی ہیجان کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جنسی جذبہ ترفع حاصل کر لیتا ہے اور ان کی شخصی اور ذاتی محرومیاں اور ناکامیاں ایک دور کی ناکامیاں اور محرومیاں بن جاتی ہیں اور ذات کائنات کی مظہر بن جاتی ہے۔ میرؔ کے ہاں تینوں تہذیبی ادارے بازار، خانقاہ اور دربار اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ تمام سماجی حقیقتیں جلوہ گر ہوگئی ہیں۔

میرؔ کی شاعری میں پست و بلند کی اصطلاح گمراہ کن ہے۔ کیونکہ کسی بھی بڑے شاعر کی شاعری جمالیاتی حوالے سے پستی اور بلندی سے مبرّا نہیں اور اگر اس سے مراد اخلاق ہے تو:

> ''اخلاقی اعتبار سے میرؔ کے یہاں جو خیالات قابلِ اعتراض ہیں
> وہ اس دور کی عام کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں اور صرف میرؔ کو اس
> وجہ سے ہدفِ ملامت بنانا صحیح نہیں۔'' ۲۷

میرؔ کی شاعری کو ہر بڑے شاعر کی شاعری کی طرح ایک اصطلاح میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان کے ہاں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور ایک حسّاس اور خوددار شخص کا خاموش گریہ ملتا ہے۔

میرؔ نے شاعری میں الفاظ کو معلوماتی اظہار کے لیے نہیں بلکہ تاثراتی اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ جذبات آفرینی شاعر کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتی ہے۔ بڑی شاعری جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اور ان کی تنقید بھی کرتی ہے۔ میرؔ کی داخلیّت تمام تر داخلی نہیں بلکہ خارجی بھی ہے۔ ان کے ہاں ذکر بھی ہے لیکن شاعرانہ اظہار اس حد تک ہے کہ اس کا حسن فکر کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں فن بھی ہے۔ فکر اور فن کو محدود معنوں میں استعمال کرنے کی وجہ سے ہم میرؔ کے فکر اور فن کی عظمت کو واضح نہیں کر سکے۔

میرؔ ٹھیٹھ بول چال کے الفاظ بے تکلّفی اور روانی سے استعمال کرتے ہیں۔ ہندی اور فارسی الفاظ کو اس خوبی سے ملاتے ہیں کہ وہ بے جوڑ معلوم نہیں ہوتے۔ فارسی تراکیب کے باوجود ثقالت نہیں۔ اضافتوں کے پہاڑ روئی کے گالے معلوم ہوتے ہیں اور سادگی میں پُرکاری ہے۔ میرؔ کے ہاں بار بار آنے

والے الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب ان کی روح کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ وہ فارسی کے محاوروں اور فقروں کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں کہ اس ترجمے میں اصل کی نسبت زیادہ وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں کڑک اور گرج کہیں نہیں لیکن دلکشی اور دلآویزی جابجا نظر آتی ہے۔

میؔر اپنے دور کی پیداوار ہیں لیکن ان کی شاعری کی اپیل آفاقی ہے۔ میؔر قنوطی نہیں بلکہ انھوں نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے۔ میؔر کی شاعری کے بارے میں مصنّف کا خیال ہے کہ:

> ''میؔر نے شاعری کو جولب و لہجہ دیا ہے اور صلابت کے بجائے لطافت پر توجہ، آواز میں گونج اور گرج کے بجائے نرمی پر اصرار، جذبات کے تند و تیز بہاؤ کے بجائے ضبط فغاں اور ساز زیرلبی پر جو زور دیا ہے وہ بڑی بھرپور اور مستقل کیفیت رکھنے والی شاعری کا ہے۔'' ۴۸؎

فراقؔ گورکھپوری نے ''میؔر کی عالمگیر مقبولیّت'' کے زیرِعنوان لکھا ہے کہ میؔر کی عالمگیر مقبولیّت اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے:

> ''ہمارے داخل ترین محسوسات کی اتنی فطری مصوّری اور وہ بھی کم سے کم الفاظ میں، سادہ سے سادہ الفاظ میں، معمولی سے معمولی الفاظ میں اُردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا۔'' ۴۹؎

میؔر کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں بحرِ حیات کی وسعتیں اور گہرائیاں ہیں۔ وہ جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری عالمگیر شاعری بن جاتی ہے اور ان کے ہاں معمولی بات بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ کے لیے مجسّم پیار تھے۔ ان کے ہاں پائے جانے والے سوز و گداز کا مقابلہ کوئی شاعر بھی نہیں کر سکتا۔ ان کے لہجے کا دھیما پن، حیات و کائنات کی عظمت اور رعب و جلال کا مظہر ہے۔

محمد حسن عسکری ''میر جی'' میں لکھتے ہیں کہ میؔر کے ہاں زندگی کے متعلق جس قسم اور جس کیفیت

کا شعور پایا جاتا ہے وہ انگریزی کے شاعروں کے ہاں بھی نہیں ہے۔ کائنات کے سامنے فرد کی ہیچ مقداری کا احساس میرؔ کے ہاں اس طرح پایا جاتا ہے:

؎ کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

اپنی بے چارگی تسلیم کرنے کے بعد میرؔ بھی اپنے ہتھیار ڈال دینے میں تامّل محسوس نہیں کرتے لیکن وہ اپنی خودی کو عام انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بقول مصنّف:

"میرؔ قدم قدم پر اپنا دوسرے انسانوں سے مقابلہ کرتے ہیں، اُن کے معیار سے اپنے آپ کو جانچنے میں، اور اس معیار کے مطابق ان کی انفرادیت میں جو خامیاں نکلتی ہیں انھیں بڑی جرأت سے تسلیم کر لیتے ہیں اور تمام چیزوں کے باوجود اپنی اصلیت اور جس حقیقت کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کی اہمیت اور برتری سے ذرا بھی بدظن یا غافل نہیں ہوتے۔" ۵۰

میرؔ ایک ایسی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں جہاں پر ان کے علاوہ اور انسان بھی رہتے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔

؎ ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میرؔ عاشق سے زیادہ انسان ہیں۔ وہ اپنے ساتھ کوئی ایسی رعایت نہیں چاہتے جو دوسرے انسانوں سے نہ کی جا سکتی ہو۔ حتیٰ کہ وہ محبوب کے سامنے بھی اپنے آپ کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کرتے ہیں اور ان کا محبوب بھی عام انسان ہی ہے۔

میرؔ کو حسرت و یاس کا شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے ہاں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ انھیں غم ہے تو یہ ساری دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں پر انھیں ایک طرف تنہائی کا احساس ہے وہاں پر انھیں دوسری طرف موت کے آگے انسان کی بے حقیقتی کا بھی پورا یقین ہے۔ اس کے باوجود:

"میرؔ زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تسلیم و رضا اور
صبر و قرار کی تلقین کرتے ہیں۔" ۵۱

میرؔ نے زندگی کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی خودی کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دینی چاہیے اور یہ رائے کسی یاس پرست انسان کی نہیں ہو سکتی۔

گوپی چند نارنگ "اسلوبیاتِ میرؔ" میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کا مزاج اپنے پیشروؤں سے مختلف تھا اور اپنے انفرادی لہجے اور طرزِ گفتار کا انھیں شدید احساس بھی تھا۔ عام طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ:

"میرؔ کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ میرؔ کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اردو کا ہے، لیکن لفظوں
کے سر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میرؔ کا لہجہ
ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میرؔ کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً
محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے۔" ۵۲

میرؔ کی نحوی ساختیں، جملوں سے قریب ہیں، ان کی سادگی محض نظر کا دھوکا ہے۔ بالعموم نحوی سادگی کو، معنوی سادگی بھی سمجھ لیا گیا جو کہ غلط ہے۔ میرؔ نے لہجۂ عام کو اپنایا لیکن اسے لہجۂ عام کی سطح پر استعمال نہیں کیا ہے، عام زبان کے صرف ظاہری معنی ہوتے ہیں لیکن شاعری کی زبان کے خارجی معنی کے ساتھ ساتھ داخلی معنی بھی ہوتے ہیں۔

؎ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میرؔ کے ہاں سادگی پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ ان کے ہاں شعری اسلوب کے دوسرے بہت سے پہلو نظرانداز ہو گئے ہیں۔

"چوں خمیر آمد بدستِ نانبا" میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ میرؔ ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں کیونکہ ان کے ہاں انسانی رشتوں کے تعلّق کا اظہار سب سے زیادہ ہوا ہے۔ جنسی مضامین کے بیان

میں بھی میرؔ کے ہاں انسانی تعلقات کے حوالے سے بہت زیادہ خوبصورتیاں موجود ہیں۔ عام طور پر جنسی مضامین پر مبنی اشعار میں اگر معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کی کثرت ہوتو اصل مضمون پھیکا پڑ جاتا ہے لیکن:

> ''میرؔ اس معاملے میں غیر معمولی ہیں کہ وہ یہاں بھی اکثر و بیشتر مضمون آفرینی یا کثرتِ معنی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ استعارے کا ہر اسلوب جانتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو رعایتِ لفظی میں کمال حاصل ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ حتی الامکان شعر کو بیانیہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔'' ۵۳ؔ

؎ وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

میرؔ میں زندگی کے تمام تجربات کو حاصل کرنے اور ان تجربات کو شعر کی سطح پر قبول کرنے کی صلاحیت حیرت انگیز حد تک تھی۔ وہ ہر بات کو شعر میں کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ تہذیب کا ہر مظہر شعر کی سطح پر برتا جا سکتا ہے۔

مکتبہ عالیہ لاہور کے شائع کردہ ''کلیاتِ میرؔ'' کی جلد دوم میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا لکھا ہوا مقدّمہ ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ خدائے سخن میرؔ آگرہ میں ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر محمد علی اور لقب میر علی متقی تھا۔ میرؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ درویشانہ تھا۔ بچپن کے ماحول نے ان پر نفسیاتی اثرات مرتب کیے جس کی وجہ سے ان میں ضد اور اپنی بات منوانے کی عادت جڑ پکڑ گئی۔ ایک وقت آیا کہ ناز پروردہ میرؔ پر مصیبتوں اور پریشانیوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور انھیں چچا امانؔ اللہ اور والد کی وفات کے بعد مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مصائب کی وجہ سے ان کی ضدّی طبیعت احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے۔

والد کی وفات کے بعد میرؔ دلّی گئے، پھر اکبرآباد آئے، دوبارہ دلّی گئے۔ وہاں بھی زیادہ دیر حالات ٹھیک نہ رہے اور تنگدستی اور کسمپرسی سے الجھتے الجھتے جنون کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور وہ نو مہینے

تک اس بیماری میں مبتلا رہے۔ دلّی میں قیام کے دوران میرؔ کے مذہبی خیالات بدلے اور وہ تفضیلی سنّی سے شیعہ ہو گئے جس کی بنیاد پر آرزوؔ سے جھگڑا ہوا اور وہ الگ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مختلف سرداروں اور مہاراجوں کے ساتھ رہے۔ جب نوابوں کا ساتھ بھی نہ رہا تو میرؔ دلّی آ کر گوشہ نشین ہو گئے اور تقریباً بارہ سال اسی حالت میں گزارے۔ اس کے بعد نواب آصف الدّولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ گئے جہاں پر انھیں روزگار کی طرف سے سکون میسّر ہوا لیکن ان کے مزاج میں جو برتری کا احساس تھا وہ پہلے سے کچھ اور بڑھ گیا۔ بقول مصنّف:

> ''بچپن سے میرؔ کو احساسِ کمتری نے ضرورت سے زیادہ خوددار، حساس، زود رنج اور تنک مزاج بنا دیا تھا۔ ان کو حالات ایسے ملے جن میں جگہ جگہ پر چرکے لگتے تھے، ذلّت کا احساس ہوتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ردِّعمل میں اور بھی نازک مزاج ہو گئے، اشعار کی مقبولیت، کمال کا اعتراف، سرداروں کی قدرافزائی نے ان کے دماغ کو اور اونچا کر دیا، ان کی خودداری، خودپسندی ان حدوں تک پہنچ گئی جسے غرور اور نخوت کہنا چاہیے۔'' ۵۴

میرؔ کی شخصیت کی تعمیر میں تیسرے اہم جز وتعلیم اور روحانی فضا کا کردار ہے جو انھیں بچپن میں ملی۔ اس کے مطابق دنیا کی قدر و قیمت زیادہ نہیں۔ جس شخص کی مزاجی حالت ایسی ہو اسے مسرّت اور قہقہے نہیں مل سکتے۔ محبت اور دنیا پر ان کا نقطۂ نظر قنوطی تھا لیکن اس کے باوجود وہ خود تڑپ کر دوسروں کو تڑپانا جانتے ہیں اور ان کے پاس وہ ہنر ہے کہ اپنے احساس کی شدّت پورے گداز کے ساتھ لفظوں میں بھر دیتے ہیں۔ شادی اور اولاد کے ضمن میں ڈاکٹر صفدر آہ کی تحقیق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میرؔ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا فیض علی پیدا ہوا جبکہ دوسری بیوی سے محمد عسکری عرف میر کلو عرش پیدا ہوئے اور میرؔ ۱۸۱۰ء کو فوت ہوئے۔ لکھنؤ سٹی (چھوٹی لائن) اسٹیشن کے پاس دفن ہوئے تھے لیکن اب ان کی قبر کا صحیح نشان نہیں ملتا۔ تصانیف میں نکات الشعراء، فیضِ میرؔ، کلیاتِ میرؔ (فارسی) اور کلیاتِ میرؔ (اُردو) شامل ہیں۔

مقدّمہ نگار نے ''مرثیے'' کے زیرِعنوان میؔر کے لکھے گئے مرثیوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''میؔر نے اپنے مرثیوں میں گریہ خیز پہلو بہت پیدا کیے ہیں اور کربلا کے واقعات میں سے دردانگیز مناظر منتخب کر کے انھیں بار بار نظم کیا ہے۔'' ۵۵

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مرثیوں میں اپنے زمانے کے رسوم اور معاشرت کے عناصر بھی داخل کر دیے ہیں۔

اس کلیات کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں میؔر کے مرثیے بھی شامل کیے گئے ہیں کیونکہ بقول مصنّف ہندوستان میں شائع ہونے والے اس سے پہلے کلیاتِ میؔر میں ان کے مرثیوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

''فرہنگ کلام میؔر: دیوان اوّل مع تنقیدی مقدّمہ'' شاہینہ تبسم کی کاوش ہے۔ دیوان اوّل کی اس فرہنگ میں پیش لفظ میں مصنفہ میؔر کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

> ''محمدتقی میؔر جیسا تخلیق کار الفاظ و لغت اور قواعدِ زبان کا تابع نہیں بلکہ الفاظ و لغت اور قواعد زبان اس کے تابع دار بن کر رہتے ہیں جس کی جنبشِ قلم سے آسمان اور آفتاب کے معنی بدل جاتے ہیں۔'' ۵۶

میؔر کی شعری زبان ایک طرف اپنے تمام پیش روشعراء کی زبان سے یکسر مختلف ہے اور دوسری طرف بعد میں آنے والے شعراء کی زبان سے بھی بے حد منفرد اور مختلف ہے۔ کیونکہ اس عہد کا لسانی مزاج ہی کچھ اور تھا لیکن اس مزاج کی تشکیل و تکمیل میں خود میؔر کا بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ شعری زبان کے معاملے میں جہاں ایک طرف زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے، وہاں دوسری طرف بڑے حسّاس بھی تھے۔ وہ اُردو کو خاص دلّی کی زبان سمجھتے تھے۔ محاورۂ دلّی ہی ان کے نزدیک ''محاورۂ اہلِ اُردو'' تھا۔

ؔ سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

انھوں نے شعری زبان کے فطری اور نامیاتی عناصر کو اہمیت دی ہے۔ ان کی شاعری میں خیال، جذبے یا کیفیت کے اظہار کے لیے مناسب ترین الفاظ ملتے ہیں لیکن ان کے الفاظ صرف لغوی معنوں کی حدوں میں بیٹھ رہنے پر اکتفا نہیں کرتے اور نہ ہی زبان کے قواعد کی پرواہ کرتے ہیں۔ سنسکرت زبان کے اثرات برصغیر پاک و ہند کی زبانوں پر بہت زیادہ ہیں۔ میرؔ کے ہاں بھی سنسکرت الفاظ کا استعمال دو طرح سے ہے۔

۱۔ اپنی اصلی صورت میں یعنی تت سم

۲۔ صوتی تغیرات کی زد میں آ کر تبدیل شدہ الفاظ یعنی تد بھو

انھوں نے ان لفظوں کے صوتی حسن سے اپنے کلام میں سادگی، بے ساختگی اور دل کشی پیدا کی ہے۔

کلامِ میرؔ میں عام طور پر فارسی مرکبات و تراکیب کا استعمال ملتا ہے، لیکن فارسی مرکبات و تراکیب کے استعمال کے باوجود ان کے کلام پر فارسیت کا اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان تراکیب کا تناسب ان کے کلام میں ایسا نہیں جو اسے اُردو سے اتنا دُور کر دے کہ اس پر فارسی کا گمان ہونے لگے۔ ان کے ہاں فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج سے مرکّب الفاظ وضع کرنے کا عمل بھی ملتا ہے۔

؎ تلوار کس کے خون میں سرڈوب ہے تری
یہ کس اجل رسیدہ کے سر پر ستم ہوا

انھوں نے فارسی اور ہندی زبانوں کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری میں عربی الفاظ، مرکبات، تراکیب اور فقروں کا استعمال بھی خوب کیا ہے، لیکن ہندی اور فارسی کے مقابلے میں یہ استعمال کم ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے الفاظ بھی ہیں جو ان کے عہد میں مستعمل تھے اور فصیح سمجھے جاتے تھے لیکن اب اُردو میں متروکات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ہندی محاورات اور فارسی محاورات کی طرز پر گھڑے ہوئے اُردو کے محاورات کا استعمال ہوا ہے لیکن:

> ''میرؔ کے کلام میں محاورات کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ ملتا ہے۔ میرؔ اپنے عہد کے گنگا جمنی محاورات کو اس حسن و خوبی سے اپنے تخلیقی عمل کا جزو بنا لیتے ہیں کہ کہیں بھی غرابت یا گرانی محسوس نہیں ہوتی۔'' ۵۷

میؔر کے ہاں سنسکرت کے ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو خفیف سی صوتی تبدیلی کے بعد اُردو زبان کا جزو بن گئے ہیں:

ع جو بن پڑے ہے ٹک تو ہمارا ہی داؤ ہے

داؤ — دانو

ان کے ہاں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو تلفظ تو وہی رکھتے ہیں جو دوسری زبان میں ہے لیکن معنی بدل جاتے ہیں:

ے اُداسیاں تھیں مری خانقاہ میں قابلِ سیر
صنم کدے میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے

سیر: عربی میں چلنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن میؔر نے اسے دید کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کلامِ میؔر میں کہیں کہیں جمع سے واحد کے معنی لیے گئے ہیں:

ع نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اُردو کے جن شعراء نے زبان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آزادیاں برتی ہیں اور زبردست لسانی کارنامے سرانجام دیے ہیں اُن میں میؔر کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

میؔر نے حروفِ جار کو حذف بھی کیا ہے:

ع اے عمرِ گزشتہ میں تری قدر نہ جانی

ان کی شاعری میں ''فکِ اضافت'' بھی پایا جاتا ہے جو فارسی اور ہندی اثرات کا نتیجہ ہے:

ع اسیری نے چمن سے میری دل گرمی کو دھو ڈالا

انھوں نے محبوب کے لیے بدمعاش، خون خوار، نکیلے اور خونی عالم جیسے منفرد اور مخصوص استعارے استعمال کیے ہیں۔ ان کے کلام میں موجودہ زمانے کے برعکس بہت سے مذکر الفاظ کو مؤنث اور مونث الفاظ کو مذکر باندھا گیا ہے:

ے سُنا جاتا ہے شہرِ عشق کے بیچ
مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں

میرؔ کی شاعری کی زبان کا مجموعی طور پر جائزہ لیتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

''میرؔ کی شاعری کی زبان فارسی، ہندی اور کسی حد تک عربی زبانوں سے استفادہ کرنے کے باوجود بنیادی طور پر جس اسلوب کو جنم دیتی ہے۔ اس پر ان مذکورہ زبانوں میں سے کسی خاص زبان کی چھاپ نہیں لگنے دیتی بلکہ ان زبانوں کے الفاظ وتراکیب کو اُردو زبان کے مخصوص مزاج اور قالب میں سمو کر بالکل نیا طرز وانداز اختیار کر لیتی ہے۔'' ۵۸

مصنفہ نے میرؔ کے کلام کا فرہنگ تیار کرتے وقت زبان کے حوالے سے ان کی جن خوبیوں کا ذِکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ محاورۂ دلّی ہی مستند ہے۔

۲۔ مناسب ترین الفاظ کا استعمال۔

۳۔ سنسکرت کے الفاظ کا استعمال۔

۴۔ فارسی مرکبات وتراکیب کا خوبصورت استعمال۔

۵۔ ہندی محاورات کا استعمال۔

۶۔ دوسری زبان کے الفاظ اُسی تلفظ کے ساتھ لیکن معنی مختلف۔

۷۔ حروفِ جار کا حذف اور فکِ اضافت۔

۸۔ موجودہ زمانے کے برعکس مذکّر الفاظ کا مؤنث اور مؤنث الفاظ کا مذکّر استعمال۔

المختصر میرؔ نے کئی زبانوں سے استفادہ کرنے کے بعد اُردو زبان کو نیا طرز اور مخصوص انداز دیا۔

''انتخابِ کلام میرؔ'' مرتبہ حامدی کاشمیری میں انھوں نے میرؔ کی عظمت کو دیگر شعراء کی شاعری کے حوالے سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشان دہی بھی کی ہے کہ ان کی تحسین شناسی غیر تشفی بخش اور ادھوری ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس رویّے کی وجوہات بھی بیان کر دی ہیں

جنھوں نے ''میر شناسی'' کے رجحان کو پنپنے نہ دیا۔ مرتب نے موجودہ صدی میں ''میر شناسی'' کے رجحان کو سراہا ہے۔ اس انتخاب سے ان کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، اس کے مطابق وہ جامع الکمالات شاعر ہیں اور غزل کے ساتھ ساتھ دیگر مروجہ نظمیہ اصناف پر بھی تصرّف رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے تخلیقی فنکار ہیں جو لسانی اظہارات پر حاوی ہیں۔

''بدن نامۂ میر'' ایم۔اے یزدانی کا مرتب کردہ کلامِ میر ہے۔ اس انتخاب کی انفرادیت یہ ہے کہ مرتب نے میر کے کلام میں سے ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسانی بدن سے ہے۔ اس انتخاب میں انسانی اعضاء کے حوالے سے اشعار کو یکجا کیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں مرتب ان کے غم کو ہمہ گیر غم ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے نزدیک غمِ میر کو فردِ واحد کا غم اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ وحدت اصل میں کثرت کے ہر رنگ پر محیط ہے۔ اس لیے کہ یہ غم کسی ایک بشر کا غم نہیں بلکہ نوعِ بشر کا غم ہے۔ ذاتی اس لیے دکھائی دیتا ہے کہ شاعر نے جملہ نوعِ انساں کے غم کو اپنا غم بنا لیا ہے۔'' ۵۹

مرتب نے بدن کے حوالے سے اشعار درج کرنے سے پہلے ان کے کلام پر بدن کے حوالے سے بھرپور بحث کی ہے۔ انھوں نے ان کے تمام دواوین میں تعداد غزلیات، تعداد اشعار اور اعضائے بدن والے اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے جس کے مطابق ان کے چھے دواوین میں کل ۱۳۵۷۸ اشعار ہیں۔ ان میں سے اعضائے بدن والے اشعار کی تعداد ۶۷۴۶ ہے۔ یہ ترتیب کے لحاظ سے بڑی انفرادیت کا حامل انتخاب ہے۔

ناصر کاظمی نے میر کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے۔ اس میں انھوں نے انتخاب کلام سے پہلے اپنے زمانے اور میر کے زمانے کے درمیان تعلق کا کھوج لگا کر میر کی پذیرائی کی ہے۔ انھوں

نے ان کے سیاسی اور سماجی ماحول کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ میؔر کا پس منظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سارے پس منظر کی روشنی میں میؔر صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔ انھوں نے نوے سال کی طویل زندگی میں عالم، نقاد، عشق پیشہ، بادشاہوں کے ہم نشیں، درویش، ایک بڑے شاعر، غرض ایک بھرپور شخصیت کی حیثیت سے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ شاید اسی لیے ان کا فنی کارنامہ آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتا ہے۔'' ۶۰

ناصؔر کاظمی کا یہ انتخاب رسالہ ''سویرا'' لاہور شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ میں ''جان پہچان'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

''نکات الشعراء'' از میر تقی میؔر کے مرتب مولوی عبدالحق اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ اب تک جتنے دستیاب تذکرے ہیں۔ ان میں ''نکات الشعراء'' کو تقدم حاصل ہے۔ میؔر کے علاوہ اس دور کے تذکرہ نویس قائؔم اور خاکسؔار بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کا تذکرہ سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ ''نکات الشعراء'' کا سنۂ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔

گردیزی نے اپنا تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے جواب میں لکھا اور اسی سال دو تذکرے تالیف ہوئے:

۱۔ تحفۃ الشعراء از فضل بیگ قاقسال
۲۔ گلشنِ گفتار از خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی

لیکن ان تذکروں کا علم میؔر کو ہرگز نہیں تھا۔ ''نکات الشعراء'' کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

''یہ تذکرہ اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں ہے، اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر

منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے
تذکروں میں نہیں آئے گی۔ دوسرے ایجاز کے ساتھ اس کی
عبارت میں شگفتگی اور پختگی بھی ہے۔" ۲۱

اُردو ادب سے متعلق بعض باتیں سب سے پہلے اسی تذکرے سے معلوم ہوئی ہیں جیسے:

۱۔ جو ریختہ شیخ سعدؔی سے منسوب تھا، میرؔ نے اس کی تردید کی اور اسے سعدؔی دکھنی کا قرار دیا۔

۲۔ میرزا جانِ جاناں کا نام جو عام طور پر مشہور ہے وہ اصل میں جانِ جاں ہے۔

میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں آرزؔو کا ذکر ادب اور احترام سے کیا ہے جب کہ ''ذکرِ میرؔ'' میں آرزؔو کی بدسلوکی، بے مروّتی اور دل آزاری کی داستان ہے۔ یہ متضاد بیانات اس لیے ہیں کہ تذکرہ عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے تھا جس میں انھوں نے ذاتی جھگڑوں کو نہیں چھیڑا جب کہ ''ذکرِ میرؔ'' میں انھوں نے اپنے حالات بے کم و کاست بیان کر دیے ہیں۔

میرؔ کی شہرت اگرچہ غزل کی وجہ سے ہے لیکن ان کی نثر کی دو کتابیں ''نکات الشعراء'' اور ''ذکرِ میرؔ'' اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ ان دو کتابوں سے ایسی معلومات تک دسترس ہوتی ہے جن کا وجود کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔ ''نکات الشعراء'' دلّی میں لکھا گیا اور اس میں سوائے دکن کے چند شعراء اور بعض قدیم ریختہ گو شعراء کے باقی سب کے سب دلّی کے شعراء ہیں۔ جب یہ تذکرہ لکھا گیا اس وقت میرؔ کی عمر ۲۹ برس تھی۔

''مثنویاتِ میرؔ بخطِ میرؔ'' کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مرتّب کیا ہے۔ اس انتخاب میں میرؔ کی درج ذیل چار مثنویاں شامل ہیں:

۱۔ جنگ نامہ (نواب آصف الدّولہ اور روہیلوں کی جنگ)

یہ مثنوی میرؔ کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔

۲۔ مثنوی در بیان ہولی

۳۔ مثنوی در بیان بز (نامکمل)

۴۔ مثنوی عشقیہ

اس انتخاب میں یہ مثنویات ایک صفحے پر بخطِ میر اور اس صفحے کے سامنے دوسرے صفحے پر صاف تحریر کی گئی ہیں تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے۔ اس انتخاب کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا مقدّمہ ہے جس میں ان مثنویات کو اہتمام کے ساتھ چھپوانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ میر کا ہر پرستار ان کے اپنے خط میں ان کا کلام پڑھنے اور دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ یہ انتخاب اس حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ''میر شناسی'' میں ایک بہترین اضافہ تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

''میر شناسی'' کی کوششیں جہاں پر تذکرہ نگاری، مکمل کتب، جزوی کتب، دیباچہ جات اور مقدّمہ جات کے حوالے سے ہوئیں وہاں پر ادبی رسائل نے بھی ان کوششوں میں مزید اضافہ کیا۔ ادبی رسائل کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشیں اپنے معیار کے حوالے سے بہترین کوششیں شمار کی جانی چاہئیں، کیونکہ وہ مضامین جو اشاعت کے تقاضے پورے نہ کریں، انھیں معیاری ادبی رسائل میں چھپنے کے لیے جگہ نہیں مل سکتی۔

ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین میں ''میر شناسی'' کی کوششیں جس انداز سے ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ میر کی زندگی کے حوالے سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین

۲۔ میر کے فن کے حوالے سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین

ان ادبی رسائل کے مضامین میں میر کی زندگی اور فن کے حوالے سے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان ادبی رسائل کے کردار کو ''میر شناسی'' کے حوالے سے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میؔر پر شائع ہونے والے مضامین کی ایک منتخب فہرست درج کی جاتی ہے جس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادبی رسائل کی ''میؔر شناسی'' کے حوالے سے کوششوں کا جائزہ لیا جائے گا:

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
میر تقی میؔر کی سیرت نکات الشعراء میں	خواجہ احمد فاروقی	آج کل، دلّی اکتوبر ۱۹۵۱ء
تذکرۂ میؔر، میر تقی میؔر کے تذکرہ نکات الشعراء کا اُردو ترجمہ	ایم۔ کے۔ فاطمی	آج کل، دلّی فروری ۱۹۶۴ء
میؔر کی عالم گیر مقبولیت	فراق گورکھ پوری	آج کل، دلّی مارچ ۱۹۶۷ء
میؔر کی فارسی غزل	اختر علی	آج کل، دلّی جولائی ۱۹۶۷ء
میؔر کا تصوّرِ دردمندی	دانش صفی حیدر	ادبِ لطیف، لاہور فروری/مارچ ۱۹۵۴ء
میؔر کا احساسِ شہریت	عبداللہ سیّد	ادبِ لطیف، لاہور سالنامہ ۱۹۶۳ء
میر تقی میؔر اور سوؔدا	طالب علی طالبؔ الہ آبادی	ادبی دنیا، لاہور جنوری ۱۹۳۴ء
اُردو غزل کا ارتقاء: میؔر، سوؔدا، دردؔ، سوؔز	اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی	ادبی دنیا، لاہور اکتوبر ۱۹۴۹ء
آدھ گھنٹہ میؔر کے ساتھ	نصیر احمد ڈار	ادبی دنیا، لاہور جون ۱۹۵۰ء
میؔر کی باتیں	اثؔر لکھنوی	ادبی دنیا، لاہور اگست ۱۹۵۰ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
میر تقی میر	اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی	ادبی دنیا، لاہور شمارہ نمبر ۳، ۱۹۵۶ء
میر اور مرثیہ گوئی	زرینہ فانی	ادبی دنیا، لاہور ستمبر ۱۹۶۵ء
میر کا انداز	سیّد عبداللہ	اُردو، کراچی اکتوبر ۱۹۴۹ء
میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا ایک مآخذ	ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان	اُردو، کراچی اپریل ۱۹۵۱ء
میر کے قبولِ عام کی بنیادیں	سیّد عبداللہ	اُردو، کراچی جولائی ۱۹۵۴ء
میر کا ایک قصیدہ	کلب علی خان فائق	اُردو، کراچی جنوری ۱۹۶۸ء
ذکرِ میر	مولوی عبدالحق	اُردو، دکن جنوری ۱۹۲۶ء
اساتذہ کی اصلاحیں	صفدر مرزا پوری	اُردو، دکن جولائی ۱۹۳۱ء
دیوانِ میر کا ایک مخصوص نسخہ اور میر کے متعلق معلومات میں خاص اضافہ	عبدالباری آسی	اُردو، دکن جنوری ۱۹۳۸ء
اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدّین احمد	اُردو، دکن جنوری ۱۹۴۱ء
دبستانِ میر کے خلاف ردِ عمل	ڈاکٹر سیّد عبداللہ	اُردو، دکن اپریل ۱۹۴۲ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
میر تقی میر کا رنگِ طبیعت	ڈاکٹر سیّد عبداللہ	اُردو، دکن جولائی۱۹۴۹ء
میر تقی میر: حیات اور شاعری	خواجہ احمد فاروقی	اُردو، علی گڑھ اپریل۱۹۵۵ء
میر کا تاریخی ماحول	خواجہ احمد فاروقی	اُردو، علی گڑھ اکتوبر۱۹۵۰ء
میر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ	محمود الٰہی	اُردو ادب، علی گڑھ شمارہ۴، ۱۹۶۲ء
خدائے سخن: میر تقی میر	ادریس صدیقی	افکار، کراچی فروری۱۹۶۴ء
میر کی شخصیت	ابنِ فرید	الشجاع، کراچی نومبر۱۹۵۵ء
میر کا سیاسی وسماجی ماحول	ڈاکٹر محمد عمر	برہان، دلّی جنوری۱۹۵۲ء تا جون ۱۹۶۵ء
میر کا نشاطیہ لب ولہجہ	عطاء الرحمان قاضی	تخلیقی ادب، اسلام آباد مارچ۲۰۰۴ء
میر وفراق کا تقابل ناممکن قرار دیا گیا ہے	نثار احمد فاروقی	تہذیب، پٹنہ اکتوبر۱۹۵۳ء
میر کی داستانِ عشق	ہوش ترمذی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جولائی۱۹۶۵ء
میر اور ان کی غزل پر ایک اجمالی تعارف	محمد ذاکر	جامعہ، دلّی ستمبر۱۹۶۵ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام وسنۂ اشاعت
میرؔ: ایک عظیم شاعر	منظر اعظمی	جامعہ، دلّی جولائی ۱۹۶۷ء
مثنویاتِ میرؔ پر ایک نظر	رضیہ محسنی	جامعہ، دلّی جولائی ۱۹۶۷ء
غم پسند شاعر: میرؔ	رخسانہ سعید	خاتون، دکن ۱۹۶۷ء
میرؔ نمبر		دلّی کالج اُردو میگزین ۱۹۶۲ء
میرؔ کی نازک مزاجی	حسن آراء	رہنمائے تعلیم، دلّی جنوری ۱۹۲۶ء
میرؔ صاحب	نظر کامرانی	زاویے سالنامہ ۱۹۶۶ء
میر تقی میرؔ	چکبست لکھنوی	زمانہ، کانپور جولائی ۱۹۱۶ء
میرؔ دہلوی	عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی	زمانہ، کانپور جولائی ۱۹۱۹ء
کلامِ میرؔ	بابو شیام موہن لال جگر	زمانہ، کانپور جون ۱۹۲۹ء
خدائے سخن: حضرت میرؔ	مسعود حسن رضوی	زمانہ، کانپور دسمبر ۱۹۳۲ء
میرؔ کے مرثیے	وقار عظیم سیّد	زمانہ، کانپور مارچ ۱۹۳۴ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
میؔر کا کلام	مرزا یگانہ چنگیزی	زمانہ، کانپور جون ۱۹۴۰ء
میؔر کا نظریۂ معاشرت	ممتاز احمد	ساقی، کراچی جون ۱۹۵۸ء
ساقی، میؔر نمبر	مرتبہ: محمد حسن عسکری	ساقی میر نمبر، کراچی ستمبر ۱۹۵۸ء
میؔر کی مثنوی خواب و خیال	علیم اللہ عالی	صبحِ نو، پٹنہ اپریل ۱۹۶۶ء
میؔر کی شاعری اور نئی تحقیق	خیر بہوروی	صبحِ نو، پٹنہ ستمبر ۱۹۶۶ء
میر تقی میؔر کا کلیاتِ فارسی	اکبرالدّین صدیقی	سب رس، مئی ۱۹۶۳ء
میؔر اور سوؔدا کا دور	ثناء الحق	سب رس، جولائی ۱۹۶۶ء
میں اور میؔر	عبداللہ سیّد	سویرا، لاہور شمارہ ۲۳
میؔر ادبی معرکے میں	کلب علی خان فائق	صحیفہ، سہ ماہی، لاہور شمارہ ۲، ستمبر ۱۹۵۷ء
یقیںؔ: ستم زدہ میؔر	مشرف انصاری	صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۶۱ء
کلیاتِ میؔر پر ایک نظر	کلب علی خان فائق	صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۶۲ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
میرؔ کی عشقیہ مثنویاں	ڈاکٹر گیان چند	فروغِ اُردو، لکھنؤ ۱۹۶۶ء
سوغاتِ غزل	وصی الحسن	فروغِ اُردو، لکھنؤ ۱۹۶۶ء
میرؔ کی غزل میں واعظ کا مقام	قمر احسن اعظمی	فیض الاسلام، راولپنڈی اپریل ۱۹۶۷ء
انتخابِ میرؔ	ڈاکٹر محمد حسن (انتخاب)	کتاب نما، جلد ۱۲، شمارہ ۵، مئی ۱۹۷۱ء
تقلیدِ میرؔ یا شارع عام	سیّد عبداللہ	ماہِ نو، کراچی دسمبر ۱۹۵۴ء
میرؔ کی عشقیہ شاعری	گیان چند	ماہِ نو، کراچی مارچ ۱۹۶۳ء
ایک زمین میں دو اُستاد	مسیح الزماں	مشرب، کراچی سالنامہ ۱۹۵۴ء
میرؔ کا فارسی کلام	ابواللّیث صدیقی	معارف، علی گڑھ جون ۱۹۴۳ء
میرؔ کی داستان	ولی الرحمٰن	معارف، علی گڑھ جون ۱۹۵۸ء
میرؔ کا تصوّرِ عشق	عطا محمد	نقوش، لاہور اکتوبر ۱۹۴۹ء
میرؔ کا اسلوبِ قصیدہ گوئی	عشرت رحمانی	نقوش، لاہور مئی/جون ۱۹۵۳ء

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
کچھ میرؔ کے بارے میں	قاضی عبدالودود	نقوش، لاہور اگست ر ستمبر ۱۹۵۳ء
نقوش، غزل نمبر		نقوش، غزل نمبر، لاہور مئی ر جون ۱۹۵۴ء
میرؔ کا فنی شعور	ڈاکٹر عبادت بریلوی	نقوش، لاہور ستمبر ر اکتوبر ۱۹۵۴ء
میر تقی میرؔ	عبداللہ قریشی	نقوش: طنز و مزاح نمبر، لاہور جنوری ر فروری ۱۹۵۹ء
کیا میرؔ کی شاعری میں فکر و نظر کی کمی ہے؟	آثرؔ لکھنوی	نقوش: خاص نمبر، لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء
میرؔ کے کلام میں طنز و مزاح	غلام احمد فرقت	نقوش، لاہور اکتوبر ۱۹۶۲ء
میرؔ کی مثنوی شعلۂ شوق کا مآخذ	نثار احمد فاروقی	نقوش، لاہور اکتوبر ۱۹۶۲ء
میرؔ کی مثنویوں کا تہذیبی پس منظر	ڈاکٹر تنویر احمد خان علوی	نقوش، لاہور مارچ ۱۹۶۳ء
نقوش		نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور جون ۱۹۶۴ء
میرؔ کا آرٹ	نثار احمد فاروقی	نقوش: خاص نمبر، لاہور اکتوبر ر نومبر ر دسمبر ۱۹۶۶ء

ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت	مضمون نگار	مضمون
نقوش، لاہور میر تقی میر نمبر ا، شمارہ ۱۲۵ ۱۹۸۰ء		میر تقی میر نمبر 1۔ شمارہ ۱۲۵
نقوش، لاہور میر تقی میر نمبر ۲، شمارہ ۱۲۶ ۱۹۸۰ء		میر تقی میر نمبر 2۔ شمارہ ۱۲۶
نقوش، لاہور ادبی معرکے نمبر ا، شمارہ ۱۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء		ادبی معرکے نمبر 1۔ شمارہ ۱۲۷
نقوش، لاہور ادبی معرکے نمبر ۲، شمارہ ۱۲۷ ۱۹۸۱ء		ادبی معرکے نمبر 2۔ شمارہ ۱۲۷
نقوش، لاہور ادبی معرکے نمبر ۳، شمارہ ۱۳۱ ۱۹۸۳ء		میر تقی میر نمبر 3۔ شمارہ ۱۳۱
نگار، بھوپال جنوری ۱۹۳۵ء	نیاز فتح پوری	اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ
نگار، کراچی دسمبر ۱۹۵۰ء	پروفیسر عطاء الرحمان	میر اور راسخ
نگار، کراچی جولائی ۱۹۵۵ء	گیان چند	میر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

مضمون	مضمون نگار	ادبی مجلہ مع مقام و سنۂ اشاعت
ڈاکٹر فاروقی اور میر تقی میرؔ	کنور لطافت علی خان	نگار، کراچی اگست ۱۹۵۵ء
غالبؔ اور تقلید میرؔ	محمد عظیم فیروز آبادی	نگار، کراچی مئی ۱۹۵۶ء
میرؔ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی: ''کدخدائی بشن سنگھ''	گیان چند	نگار، کراچی دسمبر ۱۹۵۶ء

''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کی فہرست کو دیکھا جائے تو ان مضامین کو جن دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ میرؔ کی زندگی پر مضامین

۲۔ میرؔ کے فن پر مضامین

میرؔ کی زندگی کے حوالے سے شائع ہونے والے مضامین میں ان کی زندگی کے ہر گوشے کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بے شک یہ کوششیں اس حد تک نہیں ہیں کہ اب ان کی زندگی کے بارے میں کسی پہلو کو سامنے لایا ہی نہیں جا سکتا لیکن بڑی حد تک ان کی شخصی تصویر ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے حوالے سے ہمارے سامنے آ جاتی ہے جیسے:

میر تقی میرؔ کی سیرت نکات الشعراء میں از خواجہ احمد فاروقی

میر تقی میرؔ از اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری از خواجہ احمد فاروقی

میرؔ کا تاریخی ماحول از خواجہ احمد فاروقی

میرؔ کی شخصیت از ابن فرید

میرؔ کا سیاسی و سماجی ماحول از ڈاکٹر محمد عمر

میرؔ: لکھنؤ میں	از	نظر محمد
میرؔ کے حالاتِ زندگی	از	قاضی عبدالودود
حیاتِ میرؔ	از	کلب علی خان فائق
میرؔ کا سفر لکھنؤ	از	ڈاکٹر عبدالحق
تلامذۂ میرؔ	از	فاضل زیدی
میرؔ کا مدفن	از	نادم سیتاپوری

ان مضامین میں میرؔ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر مضمون نگاروں نے ان کی زندگی کے حوالے سے ان کی آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' کو بنیاد بنایا ہے لیکن ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کی مدد سے میرؔ کی زندگی کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی نشان دہی اور اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ ان کی زندگی کے حوالے سے نقاد اختلافِ رائے کا شکار رہے ہیں لیکن ایک آدھ کے سوا، تاریخِ وفات پر سبھی کا اتفاق ہے۔ اگرچہ تاریخِ پیدائش کے حوالے سے اتفاق نہیں پایا جاتا لیکن زیادہ تر کی رائے یہ ہے کہ وہ ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ انھیں ساری زندگی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کی شاعری پر بھی اثر ڈالا۔ انھوں نے لکھنؤ میں ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ وہ جس جگہ دفن کیے گئے ہیں وہاں پر اب ان کی قبر کا نشان تک باقی نہیں ہے۔

دوسرا بہت بڑا موضوع جو ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا رہا ہے وہ میرؔ کا فن ہے۔ ان کے فن کے حوالے سے ان کی شاعری کو تنقیدی انداز سے پرکھ کر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ ایسے مضامین کے عنوانات کچھ اس طرح سے ہیں:

میرؔ کی عالم گیر مقبولیت	از	فراق گورکھ پوری
میرؔ کا تصوّرِ دردمندی	از	دانش صفی حیدر
میرؔ کا انداز	از	سیّد عبداللہ
میرؔ کا نشاطیہ لب ولہجہ	از	عطاء الرحمٰن قاضی
میرؔ: ایک عظیم شاعر	از	منظر اعظمی

کلامِ میرؔ	از	بابو شیام موہن لال جگر
میرؔ کا کلام	از	مرزا یگانہ چنگیزی
میرؔ کی شاعری اور نئی تحقیق	از	خیر بہوروی
میرؔ کی عشقیہ شاعری	از	گیان چند
خصوصیات کلامِ میرؔ	از	ایم۔اے۔شمیم

ایسے تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں ان کے کلام کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان کے کلام کی خوبیاں ہر مضمون نگار نے تسلیم کی ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان کے کلام کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ان مضامین کو دیکھا جائے تو میرؔ کی جو شاعرانہ تصویر بنتی ہے، اس کے مطابق اُردو شاعری میں ان کے درجے تک کوئی شاعر نہیں پہنچ سکا کیونکہ انھوں نے بول چال کی زبان میں ایسی غزل لکھی ہے جو تمام تر ادبی حسن کی حامل ہے لیکن دیگر اصنافِ شاعری میں بہت زیادہ خوبیاں ہونے کے باوجود ہم انھیں تمام شعراء سے بہتر قرار نہیں دے سکتے۔

ان مضامین میں ''میرؔ شناسی'' کے ساتھ میرؔ شکنی کا رویّہ بھی نظر آتا ہے لیکن یہ رویّہ کسی تحریک کی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ ایسے مضامین لکھنے والوں نے میرؔ کی ذات اور شاعری پر الزامات لگائے ہیں لیکن لوگوں کو یہ ان کی ذات اور شاعری کے حوالے سے بدگمان کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

جامعات میں ہونے والا تحقیقی و تنقیدی کام مقالہ جات کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ طالب علمانہ کاوشیں ہیں لیکن انھیں نظر انداز اس لیے نہیں کر سکتے کہ تحقیق کرنے والے طلبا و طالبات کو اپنے شعبہ جات کے قابل ترین اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ میر تقی میرؔ کے حوالے سے ہونے والا یہ تحقیقی و تنقیدی کام جہاں پر میرؔ کی زندگی کو مختلف زاویوں سے ہمارے سامنے لاتا ہے وہاں پر ان کے فن کی تفہیم میں بھی معاون ہے۔ اب ہم ایک نظر ان مقالہ جات کے منتخب عنوانات پر ڈالتے ہیں تاکہ ہمیں مجموعی طور پر میرؔ کے حوالے سے ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کام کا اندازہ ہو سکے:

عنوان	مقالہ نگار
اُردو شاعری میں غم کے تین نمائندے: میرؔ، غالبؔ، فانیؔ	اختری بیگم
اُردو شاعری میں المیہ تصوّرات	اسلم انصاری
میرؔ کا فلسفۂ حسن	اسماء عزمی
میرؔ کی شعری لسانیات (غزلوں کی روشنی میں)	افضال حسین قاضی
شاعری کا دبستانِ دہلی و دبستانِ لکھنؤ ایک غیر حقیقی تقسیم	باقر علی شاہ
میرؔ کی شاعری کے انگریزی تراجم	بشریٰ شریف
کلامِ میرؔ کا فنی تجزیہ	ثریا اختر
میرؔ کی غیر غزلیہ شاعری	ثریا شاہین
میر [تقی میر] کا عروضی مطالعہ	حمیداللہ خان
میرؔ کے اُردو اور فارسی کلام کا تقابلی جائزہ	حمیرا ارشاد
میرؔ کی امیجری	دُرِّ شہوار
اشاریہ کلیاتِ میرؔ (جلد پنجم، ششم)	راحیلہ بشیر
اشاریہ تراکیب غزلیاتِ میرؔ، فرہنگ دو دیوان (دوسرا + چوتھا)	رخسانہ جبین
پاکستان میں غزل پر میرؔ کے اثرات: ناصرؔ، شہرت، باقیؔ اور انشاؔ کے حوالے سے	رخسانہ رشید
میرؔ، سوداؔ، دردؔ، اشاریہ	سعادت ظفر
کلیاتِ میرؔ کا موضوعاتی مطالعہ	سمعیہ مقبول
میر تقی میرؔ کی مثنویات کا اسلوبی مطالعہ	شاہد پرویز
میر تقی میرؔ کی شخصیت اور شاعری کا نفسیاتی مطالعہ	شاہین نقوی
میر تقی میرؔ کی شخصیت اور شاعری کا نفسیاتی مطالعہ	شاہین نقوی
میر تقی میرؔ کی سوانح اور شخصیت: ان کی شاعری کے آئینے میں	شائستہ لطیف
(کلامِ) میرؔ میں صنائع لفظی و معنوی	شفیق الرحمٰن
(جدید اُردو غزل میں) میرؔ کی روایت	شفیقہ پروین

عنـــــــوان	مقـالـه نـگار
میرؔ [تقی میر] کا غم	صفیہ حیات
میرؔ کی شاعری کا فنّی مطالعہ	عارف حسن خاں
میرؔ کی شاعری کے انتخابات، تنقیدی جائزہ	عذرا نسیم
اشاریہ کلّیاتِ میرؔ (جلد اوّل + دوم)	عمران اختر
اشاریہ کلّیاتِ میرؔ (جلد سوم + چہارم)	فاطمہ جمشید
اشاریہ تراکیب میر تقی میرؔ	فریدہ یاسمین
تراکیب میر تقی میرؔ و فرہنگ	فیض احمد بلوچ
میرؔ کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ	قمر جبیں
اردو ادب کی مختصر تاریخوں کا تنقیدی جائزہ	محمد اشرف
تدوین غزلیاتِ میرؔ (دیوان اوّل تا ششم)	محمد ساجد خان
اردو شعراء و ادباء کی خودنوشتیں ۱۹۹۰ء تک	محمد صفدر رانا
میر تقی میرؔ کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے	محمد ہارون قادر
میر تقی میرؔ: مثنوی نگار	محمد یار گوندل
میرؔ اور سوداؔ کے عہد کی شاعری میں اخلاقی تصوّرات، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	مطلوب عالم
میرؔ کی امیجری	ممتاز عرشی
پیرویٔ میرؔ	میمونہ بیگم
میرؔ کی شاعری کا استعاراتی نظام	میمونہ بیگم
تراکیب میر تقی میرؔ و فرہنگ	ناہید فاطمہ
میرؔ کی امیجری	نسرین گل تاج
میرؔ: ایک مطالعہ	نواب حسین سیّد
میر تقی میرؔ کا تصوّرِ شعر	یاسمین حبیب
میرؔ کی شاعری میں فکری عناصر	یاسمین رعنا

یہ مقالہ جات پس منظری مطالعے کے ساتھ ''میرؔ شناسی'' میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ ان کا غالب رجحان میرؔ کے فن کے مختلف پہلوؤں کو تحقیقی اور تنقیدی انداز میں سامنے لانا ہے۔ جہاں پر اُن کے فن کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا گیا ہے وہاں پر ان کی شخصیت کے حوالے سے نہ صرف بحث کی گئی ہے بلکہ نفسیاتی حوالے سے بھی اُن کو سمجھنے کی کوشش ہوئی ہے۔

اختری بیگم نے اُردو شاعری میں غم کے تین نمائندوں میرؔ، غالبؔ اور فانیؔ کے فلسفۂ غم کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرؔ کا غم صرف ذات کا غم نہیں تھا بلکہ اس نے پوری کائنات کے غم کی نمائندگی کی ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیں پست حوصلہ نہیں کرتا بلکہ حوصلے کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اردو شاعری میں المیہ تصورات میں اسلم انصاری نے میرؔ کو سب سے بڑا المیہ نگار شاعر ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسماء عزمی چونکہ بنیادی طور پر فلسفہ کی طالبہ ہیں اس لیے انھوں نے میرؔ کے فلسفۂ حسن کے فلسفیانہ پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

افضال حسین قاضی نے اپنے مقالے میں میرؔ کی شعری لسانیات پر بحث کرتے ہوئے ان کی شاعری کی لسانی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ باقر علی شاہ نے دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلّی کی تقسیم کو غیر حقیقی تقسیم قرار دیتے ہوئے دونوں دبستانوں کی مشترک صفات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ بشریٰ شریف نے میرؔ کی شاعری کے انگریزی تراجم کو سامنے لا کر میرؔ شناسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اس سے عالمی سطح پر میرؔ کی پذیرائی بڑی حد تک نمایاں ہوتی ہے۔ ثریا اختر نے میرؔ کی شاعری کی فنی خوبیوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ ثریا شاہین نے میرؔ کی غیر غزلیہ شاعری کو موضوع بناتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ صرف ان کی غزلیں ہی بہت سی خصوصیات کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کا غزلوں کے علاوہ دیگر اصنافِ شاعری میں کلام بھی بہت سا حُسن لیے ہوئے ہے۔

حمیرا ارشاد نے میرؔ کے اُردو اور فارسی کلام کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے جہاں پر ان کے اُردو کلام کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے وہاں پر ان کے فارسی کلام کی خوبیوں کو بھی سامنے لاتے ہوئے ان کی شاعری کے دونوں انداز کا تقابل کر کے ''میرؔ شناسی'' کا ایک اور پہلو متعارف کرایا ہے۔ حمیداللہ خان نے میرؔ کی شاعری کا عروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔ دُرِّ شہوار نے ان کے ہاں امیجری کو متحرک امیجری قرار دیا ہے۔

راحیلہ بشیر اور رخسانہ جبین نے اشارہ اور فرہنگ مرتب کر کے کلامِ میرؔ کی تفہیم کو آسان کر دیا ہے۔ رخسانہ رشید نے ناصرؔ، شہرتؔ، باقیؔ اور انشاؔ کی غزل پر میرؔ کی غزل کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ سمعیہ مقبول نے کلامِ میرؔ کی تفہیم موضوعات کے حوالے سے کی ہے اور شاہد پرویز نے میرؔ کی مثنویات کی اسلوبی خوبیوں کو بڑی حد تک نمایاں کیا ہے۔

شاہین نقوی نے نفسیاتی حوالے سے میرؔ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کو اس انداز سے پیش کیا ہے جو عام محققین کے انداز سے ہٹ کر ہے۔ اس میں ان کے لاشعور کے اثرات جو ان کی شخصیت اور شاعری پر اثر انداز ہوئے اُن کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاہین نقوی نے ہی اپنے دوسرے مقالے میں میرؔ کا نفسیاتی مطالعہ پیش کر کے ان کی زندگی پر پس پردہ محرکات کی نشاندہی کی ہے۔ شائستہ لطیف نے ان کی سوانح اور شخصیت کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شفیق الرحمٰن نے کلامِ میرؔ میں لفظی و معنوی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔ شفیقہ پروین نے شاعری کی اس روایت کو موضوع بنایا ہے جسے میرؔ کی روایت کا نام دیا گیا ہے۔ اس روایت نے جدید اُردو غزل پر جو اثرات مرتّب کیے ہیں انھیں اس مقالے میں نمایاں کیا گیا ہے۔ صفیہ حیات نے میرؔ کے فلسفۂ غم کو موضوع بناتے ہوئے اس غم کو وسیع تر تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے اور اس غم کو اس غم سے جدا غم قرار دیا ہے جو انسان کے ہاں انفعالی رویّے پیدا کرتا ہے۔

عارف حسن خان نے بھی میرؔ کی شاعری کے فنی پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ قمر جبیں نے میرؔ کی شاعری کو نفسیاتی حوالے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ عذرا جبین نے میرؔ کی شاعری کے انتخابات سامنے لا کر ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ جبکہ عمران اختر، فاطمہ جمشید، فریدہ یاسمین اور فیض احمد بلوچ نے میرؔ کے کلام کا اشاریہ اور فرہنگ مرتب کر کے کلامِ میرؔ کی بہتر تفہیم کے اسباب مہیا کیے ہیں۔ محمد صفدر رانا نے میرؔ کی خودنوشت ''ذکرِ میرؔ'' کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو نمایاں کیا ہے۔ محمد ہارون قادر نے ان کے کلام کو ان کی زندگی کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ محمد یار گوندل نے میرؔ کی مثنوی نگاری کے حوالے سے خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔ مطلوب عالم نے میرؔ کی شاعری میں اخلاقی تصورات اور ممتاز عرشی

نے میرؔ کی امیجری کو نمایاں کیا ہے۔ میمونہ بیگم نے ان کی شاعری کے استعاراتی نظام پر بڑی مدلل بحث کی ہے۔ نسرین گل تاج نے میرؔ کی امیجری کے حوالے سے اپنے مقالے میں بحث کرتے ہوئے اسے متحرک امیجری قرار دیا ہے۔

نواب حسین سیّد نے میرؔ کو مجموعی طور پر زیر بحث لاتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یاسمین حبیب نے میرؔ کا تصوّرِ شعر واضح کرتے ہوئے ان کی تنقیدی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ جبکہ یاسمین رعنا نے ان کی شاعری کے بارے میں عام تاثر کہ اس میں فکر کی کمی ہے کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی شاعری میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ فکری عناصر کی نشاندہی کی ہے۔

''میرؔ شناسی'' کا جو عمل تذکرہ نگاری کی روایت سے شروع ہوا، مختلف صورتوں میں سفر طے کرتا ہوا یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات کی روایت میں بھی سامنے آیا۔ ان مقالہ جات نے بھی ''میرؔ شناسی'' میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے میرؔ کی شاعری اور شخصیت کو بڑی حد تک واضح کیا ہے۔ ان کی بدولت میرؔ کی ایک ایسی تصویر سامنے آئی جس میں کئی رنگ بھر دیے گئے ہیں لیکن ابھی تک ان کی اس تصویر میں کئی رنگ بھرنے باقی ہیں۔ اگر یہ کوششیں جاری رہیں تو اس تصویر کی تکمیل میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔

''میرؔ شناسی'' کے متفرّق حوالوں کو مدِّنظر رکھا جائے تو ان متفرق حوالوں سے میرؔ کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے:

''شعرِ شور انگیز'' میں ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ کو مشرقی شعریات کے حوالے سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے میرؔ اور غالبؔ کے اسلوب مختلف ہونے کے باوجود انھیں ایک ہی طرح کا شاعر اس لیے قرار دیا ہے کہ دونوں کی شعریات ایک ہی ہے۔ میرؔ کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ انھوں نے روزمرہ یا خالص زبان میں شاعری کی ہے۔ جب کہ انھوں نے کئی طرح کے لسانی اور شاعرانہ وسائل کا استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں گھریلو پن کا احساس اس لیے ہوتا ہے کہ ان کی زبان کے استعمالات اب عوام کی سطح پر ہیں۔ ان کو عاشق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کا عاشق روایتی عاشق ہے جس کے انسانی رشتوں کے ساتھ تعلّق ہیں۔ اس عاشق کے انسانی رشتوں کے ساتھ تعلّق

کے اظہار کی وجہ سے میرؔ ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے کردار حقیقی جب کہ معشوق اپنی مرضی کا مالک ہے۔ ان کے جنسی مضامین میں بھی گہرائی ہے۔ عشق ان کے ہاں مرکزی نقطہ ہے اسی لیے وہ عشق اور زندگی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

میرؔ کی شاعری دھیمی، انفعالی اور نرم رو نہیں ہے بلکہ اس میں ایک شور ہے۔ یہ شاعری بڑی شاعری ہے جو بار بار پڑھنے کے باوجود ہماری گرفت میں نہیں آتی۔ میرؔ کو کثیرالمعنویت کے حوالے سے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے کلام کو منشائے مصنف سے ہٹ کر پڑھیں۔ ادب کی سائنسی توجیہ ہو ہی نہیں سکتی اس لیے اس کو ان تہذیبی اقدار کے حوالے سے سمجھنا ضروری ہوتا ہے جن اقدار میں یہ ادب تخلیق ہوا ہو۔ اگر ہم کلاسیکی غزل کے مقام کا صحیح تعیّن کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس غزل کو اس کی شعریات اور رسومیات کے حوالے سے دیکھنا ہوگا۔ ان کے ہاں معنی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ انھوں نے استعارے کو لغوی معنی میں استعمال کر کے اسے پھر استعارہ بنایا ہے۔

''مزامیر'' از آثرؔ لکھنوی کے مطابق میرؔ کی عظمت تصوّف کے حوالے سے بھی ہے لیکن دردؔ سے کم۔ انھوں نے شاعری کے جن اصولوں کا ذکر کیا ہے، ان پر خود کاربند بھی رہے ہیں۔ ان کی شاعری پر حالات و واقعات کا اثر بھی ہے۔ سہل ممتنع کے باوجود ان کے ہاں معنی کی کثرت اور ہمہ گیر تخیل کے باوجود حقیقت بھی موجود ہے۔ وہ گوشہ نشین شاعر نہیں تھے۔ ان کے ہاں ادا نگاری، فحاشی کے بغیر پائی جاتی ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی کی بحر میں غزل کہی ہے۔

اسی انتخاب میں ڈاکٹر امرناتھ جھا کے مقالے میں میرؔ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے جس زمانے میں شاعری کی اس زمانے میں زبان کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہر دور میں ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ ادائے مطلب میں سادگی سے کام لیتے تھے اور اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی مربوط فلسفۂ حیات نہیں۔ ''محزونیت'' ان کی شاعری کی قدرِ مشترک ہے۔

''انتخابِ میرؔ'' از مولوی نورالرحمٰن میں مصنف لکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں ہندوستانی، ایرانی اور عربی خیالات جمع ہیں۔ اُن کی شاعری کی عظمت کو انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے جو اپنے اپنے وقت کے مجدّد تھے۔ ان کی طبیعت میں غصہ تھا۔ وہ دلّی سے بڑی محبت رکھتے تھے لیکن لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ سے بیزار

رہے۔ انھیں زبان کی اصلاح اور تحفظ کا بڑا خیال تھا۔ اس لیے انھوں نے عربی اور فارسی کے بعض الفاظ کو اپنا بنا کر استعمال کیا ہے۔ محاکات میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں رندانہ مضامین شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے ہیں ورنہ وہ بڑے پرہیز گار تھے۔

امیر حسن نورانی ''میر تقی میر، حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام'' میں لکھتے ہیں کہ ان کا پورا نام میر محمد تقی تھا۔ وہ ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ انھیں شروع ہی سے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ آگرہ سے دلّی آ گئے۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے وہ نہایت خوش اخلاق، دوست نواز اور وضع دار آدمی تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن زود رنج تھے۔ جب دلّی میں حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن ان کی شہرت سے متاثر ہو کر آصف الدّولہ نے انھیں لکھنؤ بلا لیا اور درباری ملازمین میں شامل کر لیا۔ انھوں نے کافی مدّت لکھنؤ میں گزاری لیکن انھیں لکھنؤ سے محبت نہ ہو سکی۔ معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے وہ رنج و غم کی تصویر بن گئے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ''انتخابِ کلامِ میر مع مقدمہ'' میں لکھتے ہیں کہ میر کا کلام عالم گیر حسن کا حامل ہے۔ ان کے آرزو کے ساتھ تعلقات ناخوشگوار تھے۔ ان کی ساری زندگی مصائب و آلام میں گزری۔ شگفتگی اور زندہ دلی ان کے نصیب میں نہ تھی۔ ان کا کلام اردو شعراء میں تاثیر کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں رطب و یابس بھی ہے۔ میر کی اپنے زمانے میں عزت ان کی سیرت اور کلام دونوں کی وجہ سے ہوئی۔ بعد کی شاعری پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا البتہ مجروح اور حالی پر ان کا کچھ کچھ اثر موجود ہے۔

علی سردار جعفری کے مرتب کردہ ''دیوانِ میر'' کے دیباچے کے مطابق میر کے کلام میں لوگوں کو اپنا درد محسوس ہوا جس کی وجہ سے انھوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں کم تر درجے کے شعراء کا کلام بھی شامل ہو گیا۔ ان کی شاعری سادہ اور دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ بانکی اور ترچھی بھی ہے۔ ان کا غم کائناتی ہے اور ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ میر کی شاعری نے زبان کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا اور اسے مقامی بولیوں سے آزاد کروا کے ہندوستان گیر زبان بنایا۔ ولی کی شاعری کے ان پر اثرات ضرور ہیں لیکن انھوں نے ولی کی طرح اپنی

شاعری کو صرف محبوب تک محدود نہیں رکھا۔ اگرچہ ان کی شاعری کے درد یہ پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے لیکن ان کے ہاں نشاطیہ رنگ کی بھی کمی نہیں ہے۔

''دیوانِ میرؔ'' مرتبہ عبدالباری آسیؔ میں مرتب نے اکثر میرؔ شناسوں کی رائے کے خلاف میرؔ کا سالِ وفات ۱۸۰۸ء درست قرار دیا ہے۔ جب کہ اکثر میرؔ شناسوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ اگرچہ وہ فطری شاعر تھے لیکن اس کے باوجود وہ آرزوؔ کے شاگرد تھے۔ آرزوؔ اور ان کے تعلقات کے خراب ہونے کی وجہ عشق بنی۔ دلّی کی تباہی کا انھوں نے قریب سے مشاہدہ کیا۔ آصف الدّ ولہ نے انھیں لکھنؤ بلا لیا جہاں ان کی بڑی قدردانی ہوئی۔ ان کی شاعری کی تعریف ہر نقاد نے کی ہے۔

''فرہنگ کلامِ میرؔ: دیوان اوّل مع تنقیدی مقدّمہ'' میں شاہینہ تبسم لکھتی ہیں کہ زبان کے حوالے سے میرؔ نے محاورۂ دلّی ہی کو مستند سمجھا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کا مناسب ترین استعمال ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں سنسکرت الفاظ، فارسی مرکبات وتراکیب اور ہندی محاورات کا خوبصورت استعمال اس طرح ہوا ہے کہ یہ اُردو زبان کے لیے اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ انھوں نے زبان کا آزادانہ استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس زبان کے حوالے سے ان کے ہاں کوئی بدصورتی نہیں پائی جاتی۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کئی زبانوں سے استفادہ کر کے اردو زبان کو نیا طرز اور مخصوص انداز دیا۔

حامدی کاشمیری کے مرتب کردہ ''انتخاب کلامِ میرؔ'' کے مطابق میرؔ کی تحسین شناسی ابھی تک ادھوری ہے جب کہ وہ جامع الکمالات شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھیں لسانی اظہارات پر مکمل قدرت حاصل تھی۔

ایم۔اے یزدانیؔ کا مرتب کردہ کلامِ میرؔ ''بدن نامۂ میرؔ'' کے نام سے ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے اشعار کو انسانی جسم کے اعضا کے مطابق مرتب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کا غم کسی ایک بشر کا غم نہیں ہے بلکہ یہ غم نوعِ بشر کا ہے۔

ناصرؔ کاظمی نے میرؔ کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اس میں انھوں نے میرؔ کے ذاتی، سیاسی اور سماجی ماحول کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے اور ان کے

زمانے کے درمیان تعلق کا کھوج لگایا ہے۔

مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ تذکرۂ میر ''نکات الشعراء'' کے مطابق اردو شعراء کے تمام دستیاب تذکروں میں ''نکات الشعراء'' کو تقدّم ہے۔ اس میں مصنفانہ اور بے باکانہ تنقید ہے۔ اس کی عبارت میں ایجاز کے ساتھ شگفتگی اور پختگی ہے۔ اُردو ادب سے متعلق بعض باتیں سب سے پہلے اس تذکرے کی مدد سے ہمارے علم میں آئیں۔ انھوں نے ۲۹ سال کی عمر میں اس تذکرے کو لکھا۔

''مثنویاتِ میرؔ بخطِ میرؔ'' کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مرتب کیا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں میرؔ کے رسم الخط کو سامنے لایا گیا ہے۔

انتخابات کے دیباچوں اور مقدّموں کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل کے مضامین نے بھی ''میرؔ شناسی'' میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ مضامین میرؔ کی زندگی اور فن کو سامنے لانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ میرؔ کی زندگی پر لکھے جانے والے مضامین نے اگرچہ ان کی زندگی کے ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اب بھی ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف حوالوں سے سامنے لایا جا سکتا ہے۔

میرؔ کے فن کے حوالے سے لکھے جانے والے مضامین میں ان کی شاعری کو تحقیقی اور تنقیدی انداز سے پرکھتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے لایا گیا ہے، جس کے مطابق اُردو ادب میں ان کے درجے کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ ان کی غزل تمام تر ادبی حسن کی حامل ہے جب کہ دیگر اصنافِ شاعری میں انھوں نے طبع آزمائی تو ضرور کی لیکن وہ ان میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکے۔ ان مضامین میں ''میرؔ شناسی'' کے ساتھ ساتھ میرؔ شکنی کا رویّہ بھی نظر آتا ہے لیکن یہ رویّہ کوئی رجحان یا تحریک پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

جامعات کی سطح پر ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات بھی ''میرؔ شناسی'' کا ایک انداز لیے ہوئے ہیں اس لیے انھیں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ان مقالہ جات کی کوششیں طالب علمانہ سطح پر ہوتی ہیں لیکن ماہرینِ مضمون کی نگرانی ان کی قدر کو بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ ان مقالہ جات میں میرؔ کی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی اور تنقیدی انداز میں بحث کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے گئے لیکن ان کا غالب رجحان میرؔ کے فن کی طرف ہی رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز (جلد اوّل)، ترقیٔ اردو بیورو نئی دلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۴

۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۔ ایضاً، ص ۶۱

۴۔ ایضاً، ص ۶۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۱۲۔ ایضاً، ص

۱۳۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز (جلد دوم)، ترقیٔ اردو بیورو نئی دلی، ۱۹۹۱ء، ص ۴۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۵۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز (جلد سوم)، ترقیٔ اردو بیورو نئی دلی، ۱۹۹۲ء، ص ۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۹۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز (جلد چہارم)، ترقی اردو بیورو نئی دلی، ۱۹۹۱ء، ص ۸۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۲۳۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز (جلد چہارم)، ص۱۳۳۔۱۳۴

۲۴۔ ایضاً، ص۲۵۱

۲۵۔ ایضاً، ص۱۶۴

۲۶۔ ایضاً، ص۱۷۶۔۱۷۷

۲۷۔ نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، مزامیر یعنی انتخاب کلامِ میر مع مقدمہ و مقالہ، کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، ۱۹۴۷ء، ص۲۴

۲۸۔ ایضاً، ص۴۰

۲۹۔ ایضاً، ص۵۰

۳۰۔ ایضاً، ص۶۷۔۶۸

۳۱۔ ایضاً، ص۶۴۔۶۵

۳۲۔ میر تقی میر، انتخابِ میر، مقدمہ مولوی نورالرحمٰن، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۴۵ء، ص۱۳

۳۳۔ ایضاً، ص۲۸

۳۴۔ امیر حسن نورانی، میر تقی میر، حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام، راجہ رام کمار بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص۸۔۹

۳۵۔ ایضاً، ص۱۶

۳۶۔ ڈاکٹر عبدالحق، انتخابِ کلامِ میر مع مقدمہ، انجمن ترقیِ اردو ہند دہلی، ۱۹۴۵ء، ص۴

۳۷۔ ایضاً، ص۱۴

۳۸۔ ایضاً، ص۱۶

۳۹۔ میر تقی میر، دیوانِ میر، مرتبہ علی سردار جعفری، ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی، ۱۹۶۰ء، ص۲۹

۴۰۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ عبدالباری آسی، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۲۵

۴۱۔ ایضاً، ص۳۰

۴۲۔ ایضاً، ص۴۴

۴۳۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ ظلِ عباس عباسی، قومی کونسل برائے ترقیِ زبان اردو نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۱۶

۴۴۔ ایضاً، ص۵۴

۴۵۔ ایضاً، ص۵۶

۴۶۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ ظلِ عباس عباسی، ص۲۷
۴۷۔ ایضاً، ص۴۷
۴۸۔ ایضاً، ص۸۰
۴۹۔ ایضاً، ص۸۵
۵۰۔ ایضاً، ص۹۳
۵۱۔ ایضاً، ص۴۹
۵۲۔ ایضاً، ص۱۰۳
۵۳۔ ایضاً، ص۱۳۸
۵۴۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ (جلد دوم)، مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء، ص و، ہ
۵۵۔ ایضاً، ص ل
۵۶۔ شاہدہ تبسم، فرہنگ کلامِ میرؔ (دیوان اوّل) مع مقدمہ، معیار پبلیکیشنز نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص۱۰
۵۷۔ ایضاً، ص۳۳
۵۸۔ ایضاً، ص۴۷
۵۹۔ ایم۔اے۔ یزدانی، بدن نامۂ میرؔ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۵
۶۰۔ ناصر کاظمی، جان پہچان (انتخاب کلامِ میرؔ) مشمولہ رسالہ ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱، ص۲۷۱
۶۱۔ میر تقی میرؔ، نکات الشعراء، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کراچی، اشاعت ثانی ۱۹۷۹ء، ص۶



باب پنجم

میرؔ شناسی: عصرِ حاضر میں

حاصلِ بحث

''میرؔ شناسی''، عصرِ حاضر میں: حاصلِ بحث

''میرؔ شناسی'' ایک ایسی روایت کا نام ہے جس میں نقادوں نے میرؔ کی زندگی اور فن کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس روایت کے ابتدائی نقوش میرؔ کی زندگی ہی میں نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے گئے۔ اس طرح عصرِ حاضر تک ہونے والی ''میرؔ شناسی'' کی کوششوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم عصرِ حاضر میں اس سے حاصل ہونے والے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔

''میرؔ شناسی'' کی سب سے پہلی صورت وہ ہے جو میرؔ کی اپنی ذات اور اپنے کلام کے حوالے سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگر چہ یہ صورت اپنی ستائش کا انداز لیے ہوئے شاعرانہ تعلّی پر مشتمل ہے لیکن آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنی شاعری کے بارے میں میرؔ کی اپنی رائے بڑی حد تک صحیح تھی۔ انسان جتنا بڑا فن کار ہوتا ہے، اتنا ہی بڑا نقاد بھی ہوتا ہے۔ اپنی تخلیق سامنے لاتے وقت اس کے ذہن میں پہلے سے مرتب کردہ کچھ اصول و ضوابط ضرور ہوتے ہیں جن کی روشنی میں وہ تخلیق کو سامنے لاتا ہے۔ میرؔ نے تو باقاعدہ تنقید کے نظری مباحث پیش کر کے اور ان اصولوں کی خود پیروی کر کے اچھا نقاد ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اس لیے ان کی اپنے کلام کے بارے میں رائے کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اپنے کلام کی اہمیت کے بارے میں اشارے اس طرح سے ہیں:

ے کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

ے اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمین تھام لیا

ے دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

ے حُسن تو ہے ہی کرو لطفِ زُباں بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

میرؔ کے تنقیدی مزاج کو سمجھنے میں ان کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' بھی معاون ہے۔ انھوں نے دیگر شعراء کی عظمت کا تعیّن کرتے وقت جن شاعرانہ اصولوں کو مدِّ نظر رکھا ہے، ان اصولوں کی روشنی میں انھوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے کلام کی تخلیق بھی کی ہے۔

''نکات الشعراء'' اور ان کے کلام کی روشنی میں ہم ''میرؔ شناسی'' کی اس کوشش تک پہنچ سکتے ہیں جو ان کے فن کے حوالے سے ہوئی ہے لیکن اُن کی شخصیت کے حوالے سے ان کے کلام کے اشاروں کے ساتھ ساتھ ان کی آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' بھی کسی حد تک معاون ہے۔ ''ذکرِ میرؔ'' اگرچہ خودشناسی سے زیادہ آباشناسی کو سامنے لاتی ہے لیکن پھر بھی ان کی شخصیت کے خطوط بڑی حد تک نمایاں ہو جاتے ہیں۔ میرؔ کی اپنی ذات اور فن کے بارے میں آراء اگرچہ خودستائشی کا انداز لیے ہوئے ہیں لیکن انھیں خطوط کی روشنی میں بعد میں آنے والے نقادوں نے ''میرؔ شناسی'' کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

''میرؔ شناسی'' صرف میرؔ کی ذات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ان کے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء نے اپنے اشعار کی مدد سے ان کے کلام کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔ ان میں ایسے شعراء بھی شامل ہیں جو اپنے وقت کے مجدّد سمجھے جاتے ہیں لیکن میرؔ کے بارے میں ان کا رویّہ تحسینی انداز کا حامل تھا:

ے سوداؔ تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

ے نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

؎ ریختہ کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے ہم عصر شعراء سے لے کر آج تک کے شعراء کا ان کے کلام کی خوبیوں کو نمایاں کرنا صرف تحسینی رویّہ نہیں بلکہ اعترافِ عظمت کے ساتھ ساتھ ''میرؔ شناسی'' کا ایک انداز بھی ہے۔ ''میرؔ شناسی'' کی وہ کوشش جو ان کی اپنی ذات سے شروع ہوئی تھی، ہم عصر شعراء تک پہنچ گئی۔ ان شعراء کی آراء باقاعدہ تحقیقی وتنقیدی کاوشیں نہیں ہیں۔ میرؔ کی زندگی میں باقاعدہ تحقیقی اور تنقیدی روایت نہیں تھی۔ اگر کسی حد تک اس زمانے میں تحقیقی اور تنقیدی کاوش میں کسی چیز کو شمار کر سکتے ہیں تو وہ ادبی تذکرے تھے۔ ادبی تذکرے بیاض کی ترقی یافتہ شکل تھے جنھوں نے شعراء کے کلام کے انتخاب کے ساتھ ساتھ شاعر کے حالاتِ زندگی اور کلام کی خوبیوں یا خامیوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی۔ تذکرے اختصار کے حامل ہوتے تھے اور ان کا انداز نیم سوانحی، نیم تاریخی اور نیم تنقیدی ہوتا تھا۔ تذکرہ نگاری کی یہ روایت اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک رہی۔ اس روایت کے تحت لکھے جانے والے اردو شعراء کے سڑسٹھ تذکروں میں سے زیادہ تر تذکروں میں ''میرؔ شناسی'' کی کوشش کی گئی اور ہر تذکرہ نگار نے ان کی ذات اور کلام کو اپنے اپنے انداز میں سمجھا۔ تذکروں کی تنقید کا انداز تاثراتی ہوتا تھا۔ اس لیے ان کی تنقید آج کے تنقیدی معیار پر پوری نہیں اُترتی، جس ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں یہ تذکرے لکھے گئے، اس میں موضوع اور مواد سے زیادہ توجّہ ظاہری صورت پر دی جاتی تھی۔

فتح علی حسینی ''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں لکھتے ہیں کہ ان کی طبیعت معنی ایجاد تھی اور آرزوؔ نے ان کے شعر کہنے کی استعداد کو بڑھایا۔ قیام الدّین قائمؔ نے ''مخزنِ نکات'' میں انھیں معجز طراز، کرامت تحریر اور شاعر درست قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا خیال ہے کہ انھوں نے شاعری کی جن انواع میں طبع آزمائی کی ہے ان میں شستگی و رفتگی پائی جاتی ہے۔ تذکرہ ''طبقات الشعراء'' کے مصنف قدرت اللہ شوقؔ کے خیال کے مطابق اگرچہ وہ سادہ گو ہیں لیکن اس سادہ گوئی میں تہ داری اور پرکاری موجود ہے۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خوش فکر اور محاورہ دان شاعر ہیں۔

لچھمی نرائن شفیق نے ''چمنستانِ شعراء'' میں انھیں معنی کی سلطنت کا شہنشاہ کہا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں خوبصورت الفاظ پیش کیے ہیں۔ میر حسن ''تذکرہ شعرائے اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی فکر بلند تھی اور طبع رواں وہ نثر اور نظم دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ غلام حسین شورش نے انھیں ''تذکرۂ شورش'' میں شاعرِ بے نظیر تو تسلیم کیا ہے لیکن اُن کی سیادت کو تسلیم نہیں کیا۔ امیرالدین امراللہ نے تذکرہ ''مسرت افزا'' میرؔ اور ''نکات الشعراء'' پر الزامات لگانے کے لیے لکھا جس میں ان کا خیال ہے کہ میرؔ فطرتاً مغرور تھے اور سب شاعروں کی عیب جوئی ان کا کام تھا۔ ''نکات الشعراء'' میں بھی انھوں نے شاعروں کا ذکر تحقیر کے ساتھ کیا ہے۔ ان کا شعروں کا انتخاب بالکل ناپسندیدہ اور بے رتبہ ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے میرؔ کو سخن کے میدان کا میرؔ تسلیم کیا ہے۔ مردان علی خان مبتلاؔ ''گلشنِ سخن'' میں لکھتے ہیں کہ وہ غزل گوئی میں بے مثل ہیں اور اس میدان میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

غلام ہمدانی مصحفیؔ نے ''تذکرہ ہندی گویاں'' میں انھیں غزل اور مثنوی میں مرزا سوداؔ سے بہتر جبکہ ہجو اور قصیدہ میں سوداؔ کو میرؔ پر فضیلت دی ہے۔ وہ اپنے دوسرے تذکرے ''تذکرہ عقدِ ثریا'' میں ان کو متوکل انسان قرار دیتے ہیں جس نے مال داروں کے آگے اپنا ہاتھ کبھی نہیں پھیلایا لیکن عمائدینِ سلطنت اور شاعروں نے ان کی بڑی قدر کی۔ وہ کسی کو اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ عزیز و اقارب کا خیال تھا کہ وہ کج خلق، مغرور، خود پسند اور غیر منصف تھے۔ ان کا فارسی کلام بھی ریختہ سے کم درجے کا حامل نہیں لیکن وہ مشہور اپنے اُردو کلام کی وجہ سے ہیں۔ مرزا علی لطفؔ ''گلشنِ ہند'' میں لکھتے ہیں کہ وہ معجزنما قلم رکھتے تھے اور غزل میں ''ید بیضا'' کے حامل تھے۔ غزل میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے جب کہ قصیدہ میں سوداؔ کو کمال حاصل ہے۔

''عمدۂ منتخبہ'' کے مصنف اعظم الدولہ سرورؔ کے خیال کے مطابق میرؔ کے اشعار کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ وہ مسلّم الثبوت شاعر تھے۔ ان کی استادی کے سبھی قائل تھے۔ ان کی شاعری کا دردیہ انداز کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ اگرچہ ان کی شاعری کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان کے درجے تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ قدرت اللہ قاسمؔ نے ''مجموعۂ نغز'' میں انھیں مغرور اور متکبّر لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے انھیں باغِ فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور سخن طرازی کا شہ سوار بھی قرار دیا

ہے۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' لکھتے وقت اسی تذکرے سے مدد لی ہے۔

''گلشنِ بے خار'' میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ان کے کلام کا دردیہ پہلو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سو دردناک آہیں تاثیر کے لحاظ سے ان کے ایک مصرعے کے بھی برابر نہیں ہیں۔ ان کی غزل بلند درجہ کی حامل ہے جبکہ قصیدہ ان کی غزل کے برابر مقام حاصل نہ کر سکا۔ سعادت خان ناصر نے ''تذکرہ خوش معرکۂ زیبا'' میں انھیں خودسر اور بدمزاج ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ وہ میر کے عشق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کے بعد آئینۂ خورشید میں انھیں کسی کی تصویر نظر آنے لگی۔ ''گلستان بے خزاں'' کے مصنف قطب الدین باطن کے مطابق میر کے کلام میں فصاحت اور بلاغت ہے۔ ان کے عاشقانہ مضامین بھی فکر کے حامل ہیں۔ ان کا لب و لہجہ ایسا ہے جس کے ساتھ گفتگو کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔

کریم الدین رفیلن کے تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' میں انھیں غزل اور مثنوی میں سب سے اچھا شاعر گردانا گیا ہے جب کہ قصیدہ گوئی میں سودا کو ان پر فضیلت دی گئی ہے۔ سید محسن علی نے ''سراپا سخن'' میں انھیں میر عبداللہ کا بیٹا اور آرزو کا شاگرد لکھا ہے۔ ''گلشنِ ہمیشہ بہار'' کے مصنف نصراللہ خاں خویشگی نے انھیں شاعرِ فصیح قرار دے کر نظم و نثر میں قابلِ احترام گردانا ہے۔ محمد حسین خان نے ''ریاض الفردوس'' میں انھیں ایسا شاعر قرار دیا ہے جس پر تمام شعراء کو فخر ہے۔ عبدالغفور نساخ نے بھی ''قطعۂ منتخبہ'' میں میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے اور انھیں غزل اور مثنوی میں لاثانی شاعر قرار دیا ہے۔ اپنے دوسرے تذکرے ''سخنِ شعراء'' میں بھی انھیں غزل اور مثنوی کا مسلّم الثبوت استاد قرار دیا گیا ہے اور ان کے کلام کے دردیہ پہلو کی تعریف کی گئی ہے۔ ''تذکرۂ نادری'' میں کلب حسین نادر نے انھیں عدیم المثال اور مستند شاعر قرار دیا ہے۔ سید علی حسن خان ''بزمِ سخن'' میں انھیں مسلّم الثبوت استاد قرار دیتے ہوئے غزل اور مثنوی میں بے نظیر شاعر مانتے ہیں۔ بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرے ''سفینۂ ہندی'' میں انھیں ایک دو بار دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علومِ رسمی کے بعد وہ ریختہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے گھر ہفتے میں ایک بار مشاعرہ ہوتا تھا۔ انھوں نے شعرائے اُردو کا تذکرہ لکھا ہے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں وہ لکھنؤ آئے اور دو سو روپیہ وظیفہ بھی ملتا رہا۔

محمد یحییٰ تنہا ''مرآۃ الشعراء'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کو اُردو غزل میں سب پر فوقیت ہے۔ یہ فوقیت ان کے کلام میں سادگی اور درد و اثر کی وجہ سے ہے جو دوسرے شاعروں کے ہاں نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں رطب و یابس بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا منتخب کلام جواہرات سے زیادہ قیمتی اور ادنیٰ کلام بدتر ہے۔ ان کے ہاں لفظوں کا استعمال موقع کے مناسب حال ہے۔ ان کے کلام کی نمایاں خوبیوں میں سلاست، روانی اور درد ہے۔ ان کی نازک مزاجی اور بددماغی کا سبب آرزوؔ کا برتاؤ بنا۔

''مرقعِ شعراء'' جس پر مصنف کا نام لکھا ہوا نہیں ہے، اس میں میرؔ کے کلام کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سیادت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے انھیں نازک مزاج قرار دیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ ''اژدرنامہ'' لکھ کر انھوں نے اپنے کلام سے فتنہ کھڑا کر دیا۔ اصغر حسین خاں، نظیر لدھیانوی نے ''تذکرہ شعرائے اُردو'' میں لکھا ہے کہ میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ تھا اور غزل میں انھوں نے آرزوؔ سے فیض اُٹھایا۔ غزل میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی غزل میں سوز، درد، تڑپ اور حسرت و یاس کے مضامین کی فراوانی ہے۔ ان کی زبان سادہ ہے جو ہندی کے قریب ہے۔

''آبِ حیات'' محمد حسین آزادؔ کی تصنیف ہے جسے ہم تذکرہ نگاری کی روایت کی آخری کڑی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی غزل کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ اصولِ غزلیت کے لحاظ سے سوداؔ سے بہتر ہے۔ ان کی مثنویاں بھی اچھی ہیں لیکن یہ غزل کے معیار کی حامل نہیں ہیں۔ وہ اُردو میں واسوخت کے موجد ہیں بعد میں جتنے شاعروں نے واسوخت کہے ہیں ان کے معیار تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔ ان کے ہاں ذات اور کائنات کے غم نے شگفتگی کو پروان نہ چڑھنے دیا جس کی وجہ سے ان کے قصائد سوداؔ کے مقابلے میں کم درجہ کے حامل ہیں۔ ان کی زبان شستہ، کلام صاف اور بیان پاکیزہ ہے۔ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے انھوں نے میرؔ کو بددماغ ثابت کرتے ہوئے ہر شاعر کی برائی کرنے والا لکھا ہے جب کہ انھوں نے ان سے یہ بھی منسوب کیا ہے کہ میرؔ نے وؔلی کے بارے میں یہ کہا کہ یہ ایسا شاعر ہے جو شیطان سے زیادہ مشہور ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت کو مدِّنظر رکھا جائے تو میرؔ کے بارے میں تین قسم کی آراء

سامنے آتی ہیں:

۱۔ توصیفی

۲۔ معاندانہ

۳۔ معتدل

توصیفی رویّہ اختیار کرنے والوں نے میرؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تعریف کی ہے اور کسی قسم کی منفی رائے دینے سے گریز کیا ہے۔ ان کی آراء کو دیکھا جائے تو میرؔ کی شخصیت اور فن میں ہمیں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ معاندانہ رویّہ اختیار کرنے والوں میں ایسے لوگ شامل تھے جو کسی نہ کسی طرح میرؔ سے نالاں تھے۔ میرؔ کی ذات اور ان کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے انھیں سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان لوگوں نے انتقامی رویّہ اختیار کرتے ہوئے میرؔ کی ذات اور فن کے حوالے سے منفی رائے دی۔ انھیں سیّد ماننے سے انکار کیا اور ان کی شخصیت کے حوالے سے غرور، تکبّر اور بددماغی کے عناصر کو اُجاگر کیا۔ ذاتی حوالے سے مخالفت کرنے کے باوجود یہ لوگ ان کی شاعری پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کر سکے۔ البتہ ان کے ہاں رطب و یابس کے حوالے سے ان کے بلند کلام کو نہایت بلند اور پست کلام کو نہایت پست قرار دیا ہے لیکن ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے میرؔ پر اعتراضات کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے شعراء پر لعن طعن کیا ہے اور کوئی بھی ان کے اعتراضات سے بچ نہیں سکا حتیٰ کہ ولیؔ دکنی جیسے مشہور شاعر کے بارے میں اُن کی رائے یہ تھی کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس تذکرے کے حوالے سے انھوں نے شعراء کا جو انتخاب شامل کیا ہے وہ بھی معیاری نہیں ہے۔

معتدل رائے رکھنے والے تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی ذات اور فن کے حوالے سے خوبیوں کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں پر بھی رائے دی ہے۔ انھوں نے ان کی غزل کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ شاعری میں دوسرے شعراء کو ان سے بہتر گردانا ہے اور شخصی حوالے سے ایسی کوئی رائے نہیں دی جس سے ان کا رتبہ کم ہو۔ حتیٰ کہ ان کی نازک مزاجی اور بددماغی کے حقیقی اسباب تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت کے مطابق میؔر کی شخصیت اور فن کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

۱۔ میؔر، اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔

۲۔ شاعری میں سراج الدّین علی خان آرزؔو نے ان کی معاونت کی۔

۳۔ وہ اس زمانے میں کسی کو اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے عزیز واقارب میں مغرور، خود پسند اور غیر منصف سمجھتے تھے۔

۴۔ میؔر، ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ گئے۔

۵۔ چھے دیوان ریختہ مع قصائد اور مثنوی۔ ایک دیوان فارسی، ''تذکرہ نکات الشعراء''، ایک رسالہ ''فیضِ میؔر'' اور آپ بیتی ''ذکرِ میؔر'' ان کی تصانیف ہیں۔

۶۔ میؔر کے والد کا نام میر عبداللہ اور علی متقی دونوں لکھے گئے ہیں لیکن زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے علی متقی سے اتفاق کیا ہے۔

۷۔ میؔر کی طبیعت معنی ایجاد تھی۔

۸۔ ان کی شاعری شستگی اور رفتگی کی حامل ہے۔

۹۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ ان کی سادہ گوئی میں تہ داری اور پرکاری ہے۔

۱۱۔ میؔر غزل اور مثنوی میں مرزا سوؔدا سے بہتر جب کہ قصیدہ اور ہجو میں مرزا سوؔدا ان سے بہتر ہیں۔

۱۲۔ ان کا دردیہ شعر گوئی کا انداز کسی اور کو میسر نہیں۔

۱۳۔ ان کی شاعری نکتہ پردازی، معنی آفرینی، سحر بیانی اور صنائع بدائع کی حامل ہے۔

۱۴۔ ان کی شاعری سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ مطالب کی ادائیگی میں کمال رکھتی ہے۔

۱۵۔ ان کی زبان سادہ اور ہندی کے قریب ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت نے ''میؔر شناسی'' کے ابتدائی نقوش فراہم کیے ہیں۔ اس کے بعد مکمل

کتب، جزوی کتب، ادبی رسائل اور تحقیقی و تنقیدی مقالات نے ''میرؔ شناسی'' کی روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ مکمل کتاب کسی موضوع پر تفصیلات کے اظہار کے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے۔ میرؔ پر لکھی جانے والی مکمل کتب نے بھی ان کی زندگی اور فن کے حوالے سے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر کے ان کی ایسی تصویر پیش کی ہے جو بڑی حد تک واضح ہے۔ اس کے بنیادی خد و خال بے شک تذکروں سے ہی ماخوذ محسوس ہوتے ہیں لیکن ان خطوط کو نمایاں کرنے کے لیے کئی خفیہ اور امکانی گوشوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ مکمل کتابوں میں بھی ''میرؔ شناسی'' اور میرؔ شکنی کا رویّہ ساتھ ساتھ چلتا رہا، لیکن میرؔ، میرؔ رہے اور ان کی عظمت کے بت کے سامنے سب کو جھکنا پڑا۔ مکمل کتب میں ''میرؔ شناسی'' کی کوششوں کے انداز کا جائزہ ہم مختلف کتب کے مختصر جائزے کی مدد سے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب ''نقدِ میرؔ'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ کی زندگی کے ابتدائی مؤثرات کا ان کے رنگِ طبیعت پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ خلوص و صداقت، معمولیات سے دلچسپی لہجۂ عام، بول چال کا انداز، پیرایہ ہائے ادا کی گیرائی اور مانوسیّت، صوتی حسن اور کمال کی مصوّری ان کے انداز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے ہاں فکری عناصر کی کمی نہیں لیکن یہ عناصر منتشر شکل میں پائے جاتے ہیں۔ مصوّری کا ذکر ان کے ہاں محض شاعرانہ نہیں بلکہ وہ اس کے گہرے رموز سے آشنا تھے۔ ان کی خودنگر شخصیت، عجیب و غریب کردار، بلند علمی حیثیت، فنی قابلیت اور ناقدانہ قوّت نے انھیں قبولِ عام کی بنیادیں فراہم کیں۔ وہ غالبؔ کے لیے ذہنی ارتقاء کے سفر میں فیض و ہدایت کا سرچشمہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے کامیاب مثنوی نگار نہ ہونے کے باوجود اسے محدود دائرے میں خاصی ترقی دی۔ ان کے ہاں طویل بحروں کا استعمال اُردو کے تمام شعراء سے زیادہ ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے میرؔ پر اعتراضات کیے ہیں لیکن یہ اعتراضات صرف اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے ان کی ذہنی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ ہر وقت اور ہر گھڑی کے شاعر نہیں ہیں بلکہ نازک لحات اور سخت احساسات میں ہم انھیں بہترین دوست اور رہ نما پاتے ہیں۔ ان کے ہاں مہذّب قدروں کا احساس بہت زیادہ ہے۔ اس لیے انھوں نے عشق کے سلجھے ہوئے ماحول کی اہمیّت کا احساس دلایا ہے۔ ان کی شاعری میں میکدے کی جن کیفیتوں کا ذکر ہوا ہے اُن کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ ذکر محض شاعرانہ رنگ میں نہیں ہے بلکہ وہ

خود بھی ان کیفیتوں سے گزرے تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''میر تقی میرؔ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کے آباؤ اجداد حجاز سے ہندوستان آئے۔ ان کے والد زاہد و متقی تھے اور اکبرآباد کی حد تک انھیں ہر کوئی جانتا تھا۔ میرؔ نقطۂ اعتدال سے ہٹے رہے جس کی وجہ سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت تھی۔ وہ غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری احساس و جذبے کی دنیا میں ہلچل مچا کر گونگے جذبوں کو زبان عطا کرتی ہے۔ ان کے ہاں عشق ذات کے حوالے سے بھی ہے اور کائنات کے حوالے سے بھی۔ غم ان کی شاعری میں انسانی زندگی کا حصہ بن کر سامنے آیا ہے۔ طرزِ میرؔ اگرچہ سادہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں پُرکاری ہے۔ اس لیے ان کے ہاں سہل ممتنع کے باوجود کمال کی معنی خیزی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں فصاحت اور بلاغت ایک وحدت کے روپ میں سامنے آتی ہیں جب کہ ان کی طویل بحریں جذبے کی شدّت کو پھیلا کر دھیما کر دیتی ہیں۔ اس دھیمے پن کے باوجود ان کے کلام کی ''نشتریّت'' ختم نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں فن میں ٹھہراؤ اور نفاست کی وجہ سے فنی توازن قائم رہتا ہے۔ انھوں نے تخلیقی قوّتوں کو شاعری میں سمو دیا ہے۔ اسی لیے آنے والے وقتوں میں چاہے شاعری بدل بھی جائے لیکن ان کی اہمیت برقرار رہے گی۔ ان کی شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال اُردو کے مزاج میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔ انھوں نے بول چال کی زبان کو شاعری کی زبان بنا دیا ہے۔ اپنی مثنویات کی واردات کا وہ عملی تجربہ رکھتے تھے اور اپنی ہجویات میں انھوں نے کسی کی پگڑی اُچھال کر خوشی کا اظہار ہرگز نہیں کیا۔

نثار احمد فاروقی نے ''تلاشِ میرؔ'' میں لکھا ہے کہ ان کے آرٹ میں الفاظ کی بہت زیادہ اہمیت ہے جن کو انھوں نے بنیادی پتھر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کا لب و لہجہ بلاغت کی تکمیل کرتا ہے۔ ان کی شاعری جس ذہنی واردات اور کرب کا اظہار کرتی ہے، اس ذہنی واردات اور کرب سے وہ خود بھی گزرے ہیں۔ ان کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں گہری ایمائیت اور معانی کی وسعت بھی پائی جاتی ہے۔ تصوّف ان کے عہد کا عام رجحان تھا اور ان کی شاعری میں بھی تصوّف اسی عام رجحان کے تحت آیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی مثنویات بھی صفائی، سلاست، پاکیزگی اور ربط و تسلسل کی حامل ہیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق ''نکات الشعراء'' کا

متداول نسخہ کئی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اس نسخے کے علاوہ بھی کوئی نسخہ ضرور تھا جو مختلف نقادوں کے زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ میرؔ پر ابھی تک کئی پہلوؤں سے کام ہونا باقی ہے۔ اگر پورے میرؔ کو ہم نے تلاش کرنا ہے تو ان کو ان پہلوؤں سے بھی دیکھنا ہوگا جن کو نقاد ابھی تک سامنے نہیں لائے۔

نثار احمد فاروقی، میرؔ پر لکھی جانے والی اپنی دوسری کتاب ''میر تقی میرؔ'' میں لکھتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی جنونی کیفیت اُن کے عشق کا حاصل تھی۔ انھیں عمر کے آخری حصے میں بیٹی، بیٹے اور بیوی کی وفات کے صدمات سے دو چار ہونا پڑا۔ انھوں نے ایہام سے ہٹ کر نیا طرز اختیار کیا جسے وہ ''انداز'' کا نام دیتے ہیں۔ جہاں پر ان کی شاعری میں پرانی روایات کی تقلید پائی جاتی ہے، وہاں پر انھوں نے اجتہاد سے کام لے کر کئی جدّتیں بھی پیدا کی ہیں۔ وہ ابتذال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی امیجری متحرّک ہے۔ ان کے ہاں مختصر بحروں میں وسیع تجربات اور طویل بحروں سے موسیقی کا کام لیا گیا ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنھیں لفظوں کا مصوّر کہا جا سکتا ہے، کیونکہ انھوں نے رعایتِ لفظی سے بھی کام لیا ہے اور اپنی شاعری میں جذبے کی صداقت کو بھی نبھایا ہے۔ ان کے ہاں شخصی کیفیتیں صرف شخصی کیفیتیں نہیں ہیں بلکہ ان کیفیتوں میں ہمیں پورا ماحول دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا فن شاعری میں اس مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں پر وہ عالمی ادب کے معیار پر پورا اُتر سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتاب ''میر تقی میرؔ'' میں لکھا ہے کہ انھوں نے درد کو شاعری اور شاعری کو درد بنا دیا ہے۔ یہ شاعری اداس ضرور کرتی ہے لیکن اس سے گھٹن کا احساس ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر چہ ان کے ہاں الم ناکی کا احساس زیادہ ہے لیکن ہم انھیں مسرتوں سے ناواقف بھی نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری جذبے کی حامل ہے جو کبھی کبھی عقل پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ وہ نسلاً اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے قناعت اور توکّل پر عمل کیا۔ اس لیے وہ مجبوراً درباروں میں جانے کے باوجود درباری نہ بن سکے۔ ان کے فنی شعور میں خلوص، صداقت اور واقعیت ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں رمزیت، ایمائیت، تہ داری اور پیچ داری پر زور دیا ہے۔ محبوب میرؔ کی شاعری پر غالب ہے لیکن اس کے باوجود ان کی اس سے جسمانی قربت نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں عشق زیادہ تر مجازی حوالے سے آیا ہے لیکن تصوّف کی وجہ سے ان کے ہاں کہیں کہیں عشقِ حقیقی کی

جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں پر تغزّل پایا جاتا ہے، وہاں پر فکری پہلو بھی موجود ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مکمل طور پر اظہار اور ابلاغ کے قائل ہیں۔ ان پر فارسی کی شعری روایت کا اثر ضرور ہے لیکن وہ مکمل طور پر اس روایت کے غلام بن کر نہیں رہ گئے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ناسازگار حالات سے نبرد آزما ہونا سکھایا، انسانیت کے نغمے گائے اور خودی کو بیدار کیا۔

''کارگہہ شیشہ گری'' ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کتاب ہے جس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ میؔر کی وجہ سے شعری قدریں تولّدِ دیگری سے گزریں۔ ان کے شعری کمالات ہرگز اکتسابی نہیں بلکہ ان کے یہ کمالات وہبی ہیں۔ ان کی شاعری پر خارجیّت کا اثر بھی ہے لیکن داخلیّت کا اثر خارجیّت کے اثر سے زیادہ ہے۔ ان کی شاعری کو ہر سطح پر حقیقت سے ہم رشتہ قرار دینے کی وجہ سے ان کا شعری وجود معرضِ ہلاکت میں پڑ گیا، کیونکہ شاعری تو خالصتاً تخلیقی عمل ہے جس کا مقصد فوری نوعیّت کی مقصدیت حاصل کرنا نہیں بلکہ نورِ بصیرت کو عام کرنا ہے۔ ان کے ہاں قنوطیّت ہرگز نہیں اور نہ ہی اُن کا جنون عام جنون ہے بلکہ انھوں نے اپنے خلّاق ذہن کی وجہ سے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچایا اور اپنے جنون کو جنونِ جستجو میں بدل ڈالا۔ ان کا شعری شعور ارادی نہیں تھا، اس لیے ان کے ہاں تجربے لفظ و پیکر کے روپ میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربے کو کبھی بے نقاب نہیں کیا، کیونکہ وہ ابہام کے قائل ہیں۔ انھوں نے اشعار کی تخلیق میں جگرکاوی سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو پستی کی آخری حدوں کو چھو لیتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میر تقی میؔر۔۔۔حیات اور شاعری'' کے مطابق میؔر نے مخصوص علامتی انداز میں عوام کے دل کی دھڑکنوں اور رمزیّت میں خارجی حقیقتوں کو سمو دیا ہے۔ انھوں نے ایہام کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی عناصر میں اعتدال پیدا کیا۔ انھوں نے غزل کو بلند معنویّت اور اعلیٰ سنجیدگی دی۔ بے شک انھیں پوری زندگی نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ باوقار رہے اور اپنے کلام میں سماجی شعور اور تاریخی سچائیوں کو پیش کرتے رہے۔ اُن کی سیرت اور کلام تناقصات کے حامل بھی ہیں اور بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے سامنے دو میؔر کھڑے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی غزل تمام خوبیوں کی حامل ہے۔ اُردو شاعری کو اُنھوں نے

پاکیزہ اسلوب اور بلند درجہ عطا کیا۔

گوپی چند نارنگ کی کتاب ''اسلوبیاتِ میرؔ'' کے مطابق میرؔ کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ کئی اسلوبیاتی امتیازات کی بنا پر ہم ان کے لہجے کو شدید انفرادیت کا حامل لہجہ قرار دے سکتے ہیں۔ نثر کی نحوی تراکیب برقرار رہنے کی وجہ سے ان کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک سہل ممتنع کی خوبی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں یہ سادگی صرف نحوی ہے، معنوی ہرگز نہیں، کیونکہ ان کی شاعری میں ظاہری معنی کے ساتھ ساتھ باطنی معنی بھی موجود ہیں۔ انھوں نے زبان کے تمام روپ کھنگال کر زبان کے آئندہ امکانات کو واضح کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں زبان کی وجہ سے تہ داری اور حسن کاری پائی جاتی ہے۔ انھوں نے پوری اُردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔

قاضی افضال احمد اپنی کتاب ''میرؔ کی شعری لسانیات'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ نے اپنے باطن کے اظہار کے لیے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، علامت اور قافیہ کے حربے کامیابی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے لفظ کی تعبیرات کو بروئے کار لا کر اسے اپنے تجربے کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس لیے ان کی غزل الفاظ کے تخلیقی استعمال کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ انھوں نے روایتی علامتوں کو روایتی علامتیں نہیں رہنے دیا بلکہ انھیں انوکھی معنوی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں معمولی الفاظ میں بھی تعبیرات کے کئی پہلو سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں تشبیہ کا دائرہ کار محدود ہے لیکن مشابہت میں ندرت پیدا کر کے انھوں نے اس محدودیت کی تلافی کر دی ہے۔ استعارے ان کے ہاں ظاہری حسن کو تو بڑھا دیتے ہیں لیکن معنویّت کی سطح پر یہ کوئی خاص اضافہ نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں آہنگ کا دھیما پن جذبے کی خاص نوعیّت سے مطابقت کے ساتھ ان کی شخصیت کا بھی اظہار ہے۔

''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' میں مصطفیٰ کمال فاطمی لکھتے ہیں کہ ''نکات الشعراء'' اُردو شاعروں کے اب تک دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے جس میں شاعر کی شخصیت، سیرت اور ماحول کو بیان کرتے وقت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس تذکرے کی مدد سے میرؔ کے نظریاتِ شعری کا پتہ چل جاتا ہے۔ انھوں نے جو اصلاحیں مختلف شاعروں کے کلام پر دی ہیں، اس سے ان کا تنقیدی شعور واضح ہو جاتا ہے۔ یہی تذکرہ ہمیں اردو ادب کے حوالے سے نئی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ

اپنے زمانے کی ادبی تحریکات اور رجحانات کے بارے میں بتاتا ہے۔ میرؔ کے بارے میں عام تاثر کہ وہ تارک الدّنیا تھے، اس تذکرے کی مدد سے غلط ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس تذکرے کے حوالے سے ان کی زندہ دلی اور یار باشی ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ تذکرہ سادہ، پاکیزہ، شیریں اور پُرلطف زبان کا حامل ہے اور اس کی تنقید غیر جانبدار، بے باک اور بے لاگ ہے۔

ایم۔کے۔فاطمی نے ایک کتاب ''تذکرۂ میرؔ'' کے نام سے بھی لکھی جس میں انھوں نے انھیں باتوں کو بیان کیا ہے جو ''اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت'' میں میرؔ کی شخصیت اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے لکھی ہیں۔

راشد آذر ''میرؔ کی غزل گوئی۔۔۔ ایک جائزہ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کے ہاں متضاد رویے پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہ ساری زندگی کسی ایک ہی راستے پرنہیں چلے اور ان متضاد رویّوں کی وجہ سے ان کے کلام میں تنوّع اور حسن ہے۔ وہ جذبے کو شخصی دائرے سے نکال کر کائناتی وسعت دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں جذبے کے ساتھ ساتھ فکر کا پہلو بھی ہے اور یہ جذبہ اور فکر ان کے ہاں گھل مل گئے ہیں۔ ان کے کلام میں جہاں پر نئی تراکیب سامنے آتی ہیں، وہاں پر تنافرِ لفظی کی خامی بھی پائی جاتی ہے۔

عبدالمغنی ''میرؔ کا تغزّل'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ اپنے دور اور ماحول کے ترجمان تھے۔ ذاتی اور اجتماعی صدموں کی وجہ سے ان کے ہاں سوز و گداز کی کیفیّت حد سے بڑھ گئی تھی۔ وہ جنس زدہ ہرگز نہیں تھے، کیونکہ ان کے ہاں ہمیں عشقِ مجازی سے زیادہ عشقِ حقیقی کے اشارے ملتے ہیں۔ ان کے تغزّل کا مخصوص انداز ان کی دھیمی لَے اور لہجے کی گھلاوٹ کی وجہ سے ہے۔ ان کے ہاں قنوطیّت اور دردانگیزی ہستی کے تصوّرِ فناہ کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ان کا ذہنی رویّہ مثبت ہے۔ اسلوبِ بیان کے حوالے سے ان کے ہاں سادگی و نرمی بھی ہے اور شوکت و صلابت بھی۔ ان کا تصوّرِ محبوب محدود نہیں ہے۔ طرزِ میرؔ، عام فہم، آہنگ سے بھرپور اور بے ساختہ ہے اور یہی ان کے اسلوبِ تغزّل کی پہچان ہے۔

ادریس صدیقی کی کتاب ''خدائے سخن۔۔۔ میر تقی میرؔ'' کے مطابق میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں۔ آرزوؔ نے اگرچہ شاعری میں ان کی مدد کی لیکن بعد میں ان کے آرزوؔ کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے۔ انھیں غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ غمِ عشق کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ غم ان کی شاعری کا لازمی جزو ہے

جو ذاتی حوالے سے بھی ہے اور خارجی حوالے سے بھی لیکن ان کی شاعری میں ذات اور کائنات کا فرق مٹ گیا ہے۔ میرؔ کی نظر میں شاعری کے کچھ اصول تھے جن کی پیروی کر کے ہی اچھا شعر تخلیق کیا جا سکتا تھا۔ وہ دردؔ کی طرح صوفی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں صوفیانہ عناصر بھی ہیں۔

محمد یار گوندل نے ''مثنویاتِ میرؔ، تحقیق و تنقید'' میں میرؔ کو بحیثیت مثنوی نگار سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے اس موضوع پر خاص توجہ دی ہے جس پر اکثر نقادوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ میرؔ کی مثنویات کی مدد سے جہاں پر اُن کی نجی اور سماجی زندگی کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں پر میرؔ کی مثنویات کے حوالے سے کئی نئے پہلو بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں میرؔ کی اکتالیس مثنویات کو سامنے لایا گیا ہے جبکہ زیادہ تر نقادوں نے ان کی مثنویات کی تعداد چالیس سے کم لکھی ہے۔ یہ کتاب میرؔ کی شاعری کے ایک خاص پہلو مثنویات کو تحقیق اور تنقید کے ساتھ سامنے لا کر میرؔ شناسی میں اضافے کا سبب بنی ہے۔

محمد بن علی باوہاب کی کتاب ''ذکرِ میرؔ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مع ترجمہ''، ''میرؔ شناسی'' سے زیادہ میرؔ شکنی کی مظہر ہے۔ اس کتاب میں میرؔ کی ذات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام اور آپ بیتی پر بھی شدید نوعیت کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو بے نقاب نہیں کیا۔ خاص کر کے داستانِ عشق کو وہ شعوری طور پر چھپا گئے ہیں۔ ان کی شاعری عشقِ مجازی کی حامل ہے نہ کہ عشقِ حقیقی کی۔ وہ ناآسودہ جذبات کی تسکین نہ ہونے کی وجہ سے ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ جب لکھنؤ آئے تو انھیں Homo Sex کے زیادہ مواقع نہ ملے جس کی وجہ سے ان کا رجحان اشیاء پرستی کی طرف ہو گیا۔ ''ذکرِ میرؔ'' میں اُنھوں نے والد اور چچا کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ سراسر جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس آپ بیتی میں ان کی طرف سے شیعت کا برملا اظہار اس منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے کہ انھیں سیّد تسلیم کر لیا جائے۔ آرزوؔ نے میرؔ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا لیکن میرؔ نے ان کے ساتھ بے وفائی کی اور ان کی عزت پر ڈاکہ ڈالا۔ ان کی شاعری میں وارداتِ قلب کے علاوہ صرف ہجو، رطب و یابس اور فحش کلامی ہے۔ مصنف نے میرؔ سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ناصرؔ کاظمی، حامدی کاشمیری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور مولوی عبدالحق کی آراء کو ردّ کرتے ہوئے

انھیں صرف میر کے عقیدت مند قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق میر Complex کا شکار تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی ذات کے شدید اظہار کا تقاضا کیا۔ وہ دروں بیں تھے جس کی وجہ سے ان کے ہاں انانیت نے جنم لیا اور اسی انانیت نے جب اپنے آپ کو آفاقیت میں ڈھالا تو اُن کے کلام میں مریضانہ انانیت کی جگہ عالم گیری آ گئی۔ وہ مصائب اور نامرادیوں کے باوجود زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں زندہ رہنے کے عزم کا اظہار ملتا ہے۔

میر پر لکھی جانے والی مکمل کتب نے ''میر شناسی'' کی روایت میں مفید اضافے کیے۔ ان میں میر کی زندگی اور فن کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے میر کی جو تصویر پیش کی گئی۔ اس کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

۱۔ میر، اکبرآباد میں ۱۷۲۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

۲۔ اُن کے والد کا نام علی متقی تھا۔ اگرچہ بعض نقادوں نے اُن کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے لیکن زیادہ تر نقاد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کے والد کا نام علی متقی ہی تھا۔

۳۔ میر کے والد اور چچا کی وفات دس گیارہ سال کی عمر میں ہوئی جس کے بعد انھیں نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

۴۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد اُن کے سوتیلے بھائی نے میر کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا اور وہ چھوٹے بھائی کو اکبرآباد چھوڑ کر دلّی آ گئے۔

۵۔ میر جب دلّی آئے تو اُن کی عمر گیارہ سال تھی، جب کہ بعض نقاد اس سے اتفاق نہیں کرتے، کیونکہ اکبرآباد سے دلّی تک کا سفر کرنا اس وقت گیارہ سال کے بچے کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اُن کا خیال ہے کہ اس وقت میر کی عمر سترہ سال تھی لیکن زیادہ تر محققین کی یہی رائے ہے کہ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال تھی۔

۶۔ دلّی میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہ واپس اکبرآباد آ گئے لیکن دوبارہ چلے گئے اور سوتیلے بھائی کے ماموں سراج الدّین علی خان آرزو کے گھر رہنے لگے۔

۷۔ آرزوؔ نے ان کی شعرگوئی میں معاونت کی لیکن بعد میں میرؔ اور آرزوؔ کے تعلقات خراب ہو گئے اور اسی وجہ سے انھوں نے آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں آرزوؔ کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔

۸۔ میرؔ اور آرزوؔ کے تعلقات خراب ہونے کی وجہ، میرؔ کا اُن کی بیٹی سے عشق اور مذہبی عقائد دونوں تھے۔

۹۔ میرؔ مختلف عمائدینِ سلطنت کی ملازمت کرتے رہے۔

۱۰۔ دلّی سے ساٹھ سال کی عمر میں نواب آصف الدّولہ کے بلانے پر میرؔ لکھنؤ آ گئے جہاں پر اُن کی بڑی عزت افزائی ہوئی لیکن ان کا لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے دل نہ لگ سکا۔

۱۱۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں بیٹی، بیٹے اور بیوی کی موت کے صدمات سہنے پڑے۔

۱۲۔ وہ ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن کیے گئے لیکن آج اُن کی قبر کا نشان بھی باقی نہیں ہے۔

مکمل کتب کے حوالے سے جو ان کا فنّی خاکہ بنتا ہے، اس کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اس صنفِ شاعری میں ان کا کوئی مقابل نہیں۔

۲۔ اگرچہ میرؔ کا منتخب کلام اپنے اندر اعلیٰ شاعری کی تمام خصوصیات رکھتا ہے لیکن اگر اُن کے تمام کلام کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں رطب و یابس کی بھی کمی نہیں۔

۳۔ ان کی شاعری داخلیّت اور خارجیّت کا خوبصورت امتزاج ہے جس میں ان کی ذات اور کائنات کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے۔

۴۔ میرؔ کی مثنویاں اعلیٰ خوبیوں کی حامل ہیں لیکن اس کے باوجود یہ معیار کے لحاظ سے اُردو کی سب سے اچھی مثنویاں نہیں ہیں۔ ان مثنویوں کی تعداد اکتالیس ہے۔

۵۔ میرؔ کے قصائد اعلیٰ درجے کے ہرگز نہیں ہیں، کیونکہ ان کا مزاج قصیدے سے ہم آہنگ ہی نہیں تھا۔ قصیدہ جس شان و شکوہ کا تقاضا کرتا ہے، وہ میرؔ کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھا۔

۶۔ اُردو میں وہ واسوخت کے موجد ہیں۔

۷۔ اگر چہ غزل کے علاوہ اُردو کی دیگر اصنافِ شاعری میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن ان اصناف میں وہ کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے۔

۸۔ ''نکات الشعراء'' اُردو شاعروں کے اب تک دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے۔

۹۔ ''نکات الشعراء'' کے متداول نسخے کی یہ صورت بہت سی تبدیلیوں کے بعد کی صورت ہے۔

۱۰۔ میرؔ کی تصانیف یہ ہیں:

اُردو شاعری کے چھے دیوان۔ فارسی شاعری کا ایک دیوان۔

تین نثری تصانیف:

نکات الشعراء، ذکرِ میرؔ، فیضِ میرؔ۔

''میرؔ شناسی'' کے ساتھ ساتھ ایک رویّہ ایسا بھی سامنے آیا جسے ہم میرؔ شکنی کا نام دے سکتے ہیں۔ اس رویّے کے تحت ان کی ذات اور فن کے حوالے سے شدید نوعیت کے الزامات لگائے گئے جیسے:

۱۔ میرؔ، غیر سیّد تھے اور انھوں نے شیعت کا برملا اظہار اس لیے کیا کہ انھیں سیّد مان لیا جائے۔

۲۔ اُن کے سوتیلے بھائی اور آرزوؔ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن میرؔ نے بھائی کا ناجائز شکوہ کیا اور آرزوؔ کی عزت پر ڈاکہ ڈالا۔

۳۔ میرؔ نے آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنی والدہ کا کہیں پر ذکر نہیں کیا، کیونکہ وہ اس وقت کے معیارِ شرافت پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔

۴۔ وہ خودسر، متکبر اور بددماغ تھے۔

۵۔ میرؔ کے والد اور چچا امان اللہ کا نقشہ جس طرح کا ''ذکرِ میرؔ'' میں کھینچا گیا ہے بالکل غلط ہے، کیونکہ ان کے والد اور چچا لڑکوں سے عشق کرتے تھے جو کہ عظمت کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔

۶۔ میرؔ خود بھی امرد پرستی کا شکار رہے۔

۷۔ میرؔ کی آپ بیتی کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جگہ جگہ شعوری طور پر جھوٹ بولا ہے اور کئی واقعات کو جان بوجھ کر بیان نہیں کیا۔

۸۔ ان کی شاعری ہجو، رطب و یابس اور فحش کلامی پر مبنی ہے۔

''میرؔ شناسی'' کے مقابلے میں میرؔ شکنی کا رویّہ ایک رجحان کے طور پر سامنے نہیں آسکا اور نہ ہی ان لوگوں کے پاس اتنے مضبوط دلائل ہیں جن کی بنیاد پر ان کی تمام باتوں کو سچ مان لیا جائے۔ اس لیے یہ رویّہ سامنے آنے کے باوجود میرؔ کی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ''میرؔ شناسی''، تذکرہ نگاری کی روایت تک محدود رہی لیکن جب بیسویں صدی میں تحقیق و تنقید کے رجحانات بدلے تو مختلف کتابیں مخصوص رجحانات کے تحت لکھی جانے لگیں۔ جہاں پر ادبی شخصیات پر ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مکمل کتابیں لکھی گئیں وہاں پر جزوی کتب میں بھی مختلف ادبی شخصیات اور ان کے فن پاروں کو زیرِ بحث لایا گیا۔

''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے تذکرہ نگاری کی روایت سے آگے بڑھتے ہوئے جہاں پر مکمل کتب نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں وہاں پر ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے جزوی کتب کا بھی اپنا مقام ہے۔ میرؔ پر لکھی جانے والی جزوی کتب نے ''میرؔ شناسی'' میں جو کردار ادا کیا ہے، اب اُس کا جائزہ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنی کتاب ''ولیؔ سے اقبالؔ تک'' میں میرؔ کے کلام کے بارے میں اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں فکر و نظر کے عنصر کی کمی ہے، کیونکہ میرؔ کی شاعری میں افکار و حقائق کا ایک معقول سرمایہ مل جاتا ہے۔ ان کے ہاں یہ افکار مرتّب شکل میں نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے صرف اپنے آپ کو استفہام تک محدود نہیں رکھا بلکہ حقائق کا انکشاف اور اثبات بھی کیا ہے۔ بے شک

ان کے ہاں جذباتی نقطۂ نظر ہے لیکن ساتھ ساتھ عقلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''سخنور۔۔۔ نئے اور پرانے'' کے مطابق جدید ذہن میرؔ کے کلام اور شخصیت سے زیادہ متاثر ہوا ہے، کیونکہ ایک تو ان کے کلام میں ایسی سچائیاں ہیں جو مستقل اور پائیدار ہیں اور دوسرا جدید ذہن کو ان کے کلام میں دھندلی سی اپنی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'' کے مطابق میرؔ کا اُردو شعراء کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اب تک کے دستیاب تذکروں میں اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جس نے تذکرہ نگاری کی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ''طیفِ غزل'' کے نام سے مرتب کردہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے کلاس لیکچرز کے مطابق میرؔ کا غم ذاتی ہونے کے باوجود کائناتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اس غم کو رومانی انداز سے بسر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ نیچر کے متعلق ان کا مشاہدہ محدود تھا بلکہ انھوں نے تو فطرت کے مشاہدات پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان کی شاعری میں ایماء اور تفصیل کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی اشاروں سے سمجھانے کی کوشش بھی بڑی معنویت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنی کتاب ''اردو شاعری میں المیہ تصورات'' میں میرؔ کو غمِ عشق، غمِ حیات اور غمِ کائنات کے حوالے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ میرؔ کے غم کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے بعد مصنف اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ ان کے غم میں خلوص اور سچائی ہے اسی وجہ سے ان کے ہاں غم زندگی کی ناگزیر حقیقت کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ انھوں نے اسی غم سے زندگی گزارنے کا طریقہ تلاش کیا ہے۔ غم عام طور مایوسی کا سبب بنتا ہے لیکن میرؔ کے ہاں جو غم ہے وہ انھیں مغلوب نہیں کر سکا بلکہ میرؔ خود اس غم پر غالب آ کر زندگی کو ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ گزارتے رہے ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' میں میرؔ کو ایسا شاعر قرار دیا ہے جن کی استادی کا کوئی منکر نہیں ہے۔ ان کی شاعری سادہ اور دل نشیں ہونے کے باوجود تیکھی ہے۔ ان کا غم ذاتی نہیں بلکہ کائناتی ہے۔ ان کی شاعری میں بے بسی اور بے چارگی تو ہے لیکن اس بے بسی اور بے چارگی میں بھی کھوئے ہوئے وقار کو پانے کا حوصلہ ہے۔ عشق ان کے ہاں وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ اس لیے ان کی عشقیہ شاعری صرف جنسیات تک محدود نہیں ہے بلکہ اُن کی شاعری ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

''میر، غالب اور اقبال'' میں ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں کہ غالب اور میر کے ہاں فکری اور فنی فاصلے اور امتیازات ہونے کے باوجود بہت سی خصوصیات مشترک بھی پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان دونوں شعراء کے شعری تناظر مختلف ہیں، اس لیے ان کے ذہنی رویے اور فاصلے قربتوں سے زیادہ ہیں۔ میر اپنے رنگ کے ایسے شاعر ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ''میر، غالب اور اقبال'' کے مطابق میر کی شاعری میں تصوّف کے واضح اثرات ہیں۔ اس کی وجہ کلاسیکی شاعری کی روایت کے ساتھ ساتھ میر کی اس تربیّت کا بڑا ہاتھ ہے جو متصوّفانہ ماحول میں ہوئی اسی وجہ سے ان کے ہاں روحانی تربیّت کے ذریعے قربِ الٰہی اور عرفانِ ذات کی کوشش ہے۔ تصوّف کی وجہ سے ان کی شاعری پر جو مزید اثرات مرتّب ہوئے، وہ یہ ہیں:

۱۔ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا باہم امتزاج

۲۔ غمزدگی اور یاسیّت کے باوجود اثباتی عناصر

۳۔ تسلیم و رضا کی وجہ سے درد کی قبولیت کا رویّہ

۴۔ میخانے اور کفر کی تمثیل کے لوازمات کا بیان

سیّد محی الدّین قادری کی کتاب ''تین شاعر'' کے مطابق میر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی مثنویوں میں بھی ان کی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقاء اور ماحول کا عکس پایا جاتا ہے۔ اگرچہ مثنویاں انھوں نے عمر کے کسی خاص حصے میں نہیں لکھیں ہیں لیکن ان میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثنویوں کے لیے انھوں نے وہ بحریں استعمال کی ہیں جو عام طور پر مثنوی کی صنف کے لیے مروّج نہیں تھیں۔

Ralph Russell اور Khurshid-ul-Islam کی کتاب ''Three Mughal Poets'' میں میر کی مثنویوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ان مثنویوں کے ذریعے اُن کی ذات اور سماج تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔

D.J.Mathews, C. Shakle اور Shahrukh Hussain کی مشترکہ کاوش ''Urdu Literature'' کے مطابق میر اپنی شاعری میں حسّاس جذبات کی صحیح عکاسی کرنے میں

کامیاب رہے ہیں۔ محبّت اور خمریات سے متعلق ان کے تمام تر جذبات حقیقت پر مبنی ہیں جب کہ دیگر شعراء کے ہاں یہ باتیں صرف اظہار کا درجہ رکھتی ہیں۔

Ralph Russell نے اپنی کتاب "The Pursuit of Urdu Literature" میں میؔر کو اردو شاعری میں محبّت کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق انھوں نے اپنی شاعری میں محبّت کے جن تجربات کا ذکر کیا ہے اُن سے وہ خود بھی گزرے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے تجربات کے بیان میں ان کے ہاں ''حالیہ رنگ'' پایا جاتا ہے۔ ان کا پاگل پن اور شراب کی کیفیّات کا بیان محض علامتی ہے۔ ان کی حقیقی زندگی میں ایسی باتوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میؔر کے سخت گیر رویّے کی وجہ ان کی حسّاسیّت ہے۔ اسی وجہ سے عمر کے آخری حصے میں ان کا انا کا جذبہ اُبھر کر سامنے آیا اور انھوں نے شاہانِ وقت کے ناروا رویّے کا کھل کر اظہار کیا ہے۔

ثناء الحق حقی نے ''میؔر و سوؔدا کا دور'' میں میؔر کی غزل، مثنوی اور واسوخت کی تعریف کرتے ہوئے ان اصناف میں انھیں نمایاں مقام کا حامل قرار دیا ہے۔ دیگر اصنافِ شاعری میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ یہ اصناف بھی تعریف کے قابل ہیں لیکن شہنشاہ وہ صرف غزل کے ہی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی نے ''کلاسکی ادب'' میں میؔر کی سیرت کا جائزہ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے لیا ہے۔ انھوں نے عام تذکرہ نگاروں کے قائم کردہ اس تاثر کو غلط قرار دیا ہے کہ وہ خلوت پسند تھے بلکہ میؔر تو میلوں ٹھیلوں میں جاتے۔ گھر پر مشاعرے کرواتے اور دوستوں سے مل کر ہنسی خوشی کی باتیں کرتے۔ وہ عاشق مزاج اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔

الطاف حسین حالؔی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں میؔر کے دھیمے لہجے میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اس حوالے سے بھی منفرد گردانا ہے کہ وہ عام خیالات کو سادگی اور صفائی کے ساتھ نرالے اسلوب میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میؔر کی عشقیہ مثنویوں کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ نتیجہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے بھی پاک ہیں۔

امداد امام آثرؔ نے ''کاشف الحقائق'' میں جہاں پر ان کے کلام میں سے بہت سے کلام کو ترک کر دینے کی بات کی ہے وہاں پر ان کے منتخب کلام کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس سے خوبصورت کلام اردو ادب میں دستیاب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل لکھتے وقت وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

محمد حسن عسکری ''وقت کی راگنی'' میں بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کے تصوّرات ایک نظر دیکھنے سے عام سے لگتے ہیں لیکن جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو یہ تصوّرات بڑی انفرادیّت کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو دیگر انسانوں کے حوالے سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے وہ اپنی خامیوں کو بڑی جرأت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پایا جانے والا طنز، نفرت اور مایوسی کا حامل نہیں بلکہ اس میں اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت ہے۔ وہ زندگی سے قطعاً مایوس نہیں اور غم کا شاعر ہونے کے باوجود دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔

ناصرؔ کاظمی نے ''خشک چشمے کے کنارے'' میں نئے زمانے کی عورت کو اس عورت سے مشابہ قرار دیا ہے جو میرؔ کی شاعری کی عورت ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس زمانے کی عورت کے بال کاٹے ہوئے نہ ہوں۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان حالات کو بھی سمجھیں جن سے ان کو گزرنا پڑا۔ میرؔ کے ہاں عاشق اور معشوق کے تعلقات انسانی سطح پر ہیں اور انھوں نے عشق کے ذاتی تجربے کو وسعت دے کر کائناتی رنگ دے دیا ہے۔ ان کے ہاں دردمندی، آدمیّت اور انسانی محبّت کی تلاش پائی جاتی ہے۔ ان کے تخلیقی امیج کی وجہ سے احساس وفکر، شیر وشکر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی تقلید سے بچنا بھی مشکل ہے اور ان کی تقلید کرنا بھی مشکل ہے، کیونکہ انھوں نے اُردو شاعری میں تمام امکانات کو ظاہر کر دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب ''اُردو شاعری کا فنّی ارتقاء'' میں سیّد ولی الرّحمٰن ولیؔ کے مضمون کے حوالے سے اس نظریے کو باطل قرار دیا ہے کہ میرؔ اُردو کا پہلا واسوخت لکھنے والے ہیں بلکہ انھوں نے شاہ مبارک کو اُردو کا پہلا واسوخت لکھنے والا ثابت کیا ہے۔

''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ میرؔ

پہلے تذکرہ نگار ہیں جو شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی شعور رکھتے تھے۔ ان کے ہاں عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نظری تنقید کے مباحث بھی ملتے ہیں۔ ''نکات الشعراء'' کے مطالعے کے بعد یہ تاثر کہ وہ خشک مزاج، مردم بیزار اور افسردہ طبیعت تھے، ختم ہو جاتا ہے۔

حنیف نقوی ''شعرائے اُردو کے تذکرے، نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک'' میں لکھتے ہیں کہ ''نکات الشعراء'' کے متداول نسخے کے علاوہ بھی کوئی نسخہ موجود تھا جس میں شاعروں کی تعداد اس نسخے میں موجود شعراء کی تعداد سے زیادہ تھی اور میؔر کی وؔلی کے بارے میں یہ رائے کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور ہیں، موجود تھی۔ ''نکات الشعراء'' میں حالاتِ زندگی لکھتے وقت انھوں نے کئی جگہوں پر سہل پسندی اور سطحیّت سے کام لیا ہے اور بقدرِ ضرورت توجہ نہیں دی لیکن پھر بھی سیرت اور شخصیت کے مرقعوں کی وجہ سے ''نکات الشعراء'' شہرت کا حامل تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں انھوں نے شعراء کے ساتھ اختلاف کے باوجود ان کی تعریف بھی کی ہے۔ انھیں چند واقعات کی بنیاد پر بددماغ کہنا ناانصافی ہے۔ بعض لوگوں کے ساتھ جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر انھوں نے زیادتیاں بھی کی ہیں۔ انھوں نے شعراء کے بارے میں جو آراء دی ہیں وہ شاعری کے بنیادی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے لسانی اور فنی ضابطوں کے ساتھ دی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری ''نقوش و افکار'' میں لکھتے ہیں کہ میؔر کو شخصی حوالے کے ساتھ ساتھ اجتماعی حوالے سے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بڑی شائستگی کے ساتھ اپنے زمانے کے کرب و اضطراب کو ظاہر کیا ہے۔ تصوّف ان کے ہاں محض روایت کے حصے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ وہ یاس پرست انسان اس لیے نہیں تھے کہ ان کے لہجے میں بغاوت کا مہذّب اور پُرتمکنت احساس ملتا ہے۔ وہ جراُتِ مردانہ کے قائل ہیں، اس لیے شکست پر شکست کھانے کے باوجود وہ فتح کے احساس سے سرشار ہیں۔ انھوں نے غم کو مقدر کی طرح تسلیم کیا، کیونکہ غم ان کے زمانے کا مزاج تھا۔ انھوں نے درد کو سرور اور الم کو نشاط بنا دیا۔ ان کی شاعری ایسی شاعری ہے جو ہمیں سنجیدگی، توازن، شائستگی اور سلیقہ سکھاتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی نے ''اصنافِ ادب'' میں میؔر کی زبان کو غزل کی زبان قرار دیا ہے، کیونکہ جو خوبیاں میؔر کی زبان کی ہیں وہی خوبیاں غزل کی زبان کی خوبیاں شمار ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ''تنقیدی تجربے'' میں لکھتے ہیں کہ میؔر فن کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کی

زندگی غم سے عبارت تھی اور اسی غم کے اظہار کو وہ شعر سمجھتے تھے۔ انھوں نے خلوص کو شعر کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اسلوب اور طرزِ کلام بلندی کا حامل اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں سنوری ہوئی کیفیت اور رچا ہوا احساس موجود ہو۔ انھوں نے روایت کی پاسداری تو کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں جدّت بھی موجود ہے۔ انھوں نے غزل کے تمام تقاضے پورے کیے ہیں، کیونکہ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں فنِ شعر پر صرف نظری مباحث ہی نہیں ملتے بلکہ انھوں نے اِنھیں عملی طور پر اپنے شعروں میں استعمال بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''شاعری اور شاعری کی تنقید'' میں میؔر کو سرتاپا درد وغم اور رنج والم کی تصویر قرار دیا ہے۔ عمومیّت اور آفاقیّت ان کی شاعری کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ وہ بظاہر دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں زندگی سے قریب ہیں۔ ان کے محبوب کی حیثیت فعالی ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری میں محبوب کو بے نقاب نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں تصوّف کی وجہ سے جگہ جگہ پر عشق کا حقیقی تصوّر بھی پایا جاتا ہے لیکن ان کا مجموعی میلان عشقِ مجازی کی طرف ہے۔ ان کی شاعری میں تغزّل کے ساتھ ساتھ فکر کا پہلو بھی موجود ہے جس کا مآخذ تصوّف ہے۔ انھوں نے افکار وخیالات اور معاملات ومسائل نئے پیش نہیں کیے لیکن انھیں زندگی سے ہم آہنگ کر کے دیکھا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی غزلوں میں تجربے اور روایت کو ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی اور فن کا خوبصورت امتزاج پیش کیا گیا ہے۔

مولوی محمد یحیٰی تنہؔا نے ''مرآۃ الشعراء'' میں میؔر کے کلام میں سلاست اور درد کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ایک بے نظیر شاعر قرار دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ان کے کلام میں رطب و یابس کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے کلام کی رکاکت کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کی ایسی شاعری کو شاعری ماننے سے ہی انکار کر کیا ہے۔

عبدالرحمٰن طارق نے ''فردوسِ معانی'' میں میؔر کے کلام کا مطالعہ صوفیانہ اور عارفانہ نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے میؔر کے کلام کے بارے میں عام تاثر کہ یہ صرف عشقِ مجازی کا حامل ہے، کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں مصنّف نے میؔر کی شاعری کی تصوّف کے حوالے سے

خوبیوں کونمایاں کیا ہے جن میں معرفت، دلداریٔ خلق، دل ذریعۂ معرفت، جہادِ نفس، شانِ عبودیّت اور تسلیم ورضا شامل ہیں۔

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی نے ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' میں میرؔ کوایسا شاعر قرار دیا ہے جن کی شاعری انفرادی رنگ کے باوجود دہلوی شاعری کا عام انداز لیے ہوئے ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ لکھنؤ میں گزارا لیکن شاعری میں وہ اپنے اصلی رنگ سے انحراف نہ کر سکے۔ ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی کتاب ''جدید اُردو ادبیات'' کے مطابق میرؔ اپنے کلام کا انتخاب لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکے۔ ان کے ہاں خیال اور بیان دونوں میں سادگی ہے اور ان کی غزلیں ان کے حال کی آئینہ دار ہیں جبکہ اپنی کتاب ادب اور حقیقت میں انھوں نے ان کی شاعری کو رمزیہ اور ایمائی قرار دیتے ہوئے اپنے عہد اور ماحول کی ترجمان قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ''دلّی کا دبستانِ شاعری'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری تاثیر کے لحاظ سے بہترین شاعری ہے۔ درد واثر دہلویت کی بہت بڑی پہچان ہے اور میرؔ کا کمالِ فن بھی یہی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فارسی اور ہندی میں اعتدال کا رشتہ قائم کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ''اُردو غزل'' میں میرؔ کی غزل کو ایسی غزل قرار دیا ہے جو اپنے اندر نمائندہ غزل کی تمام تر خصوصیات رکھتی ہے۔ اس کا رنگ مجازی ہے لیکن پھر بھی یہ پستی یا ہوس کی طرف راغب نہیں کرتی۔

خواجہ منظور حسین نے ''اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ'' میں میرؔ کے کلام کا مطالعہ خارجی حوالوں سے کرتے ہوئے ان کے ہاں سیاسی، سماجی اور معاشی شعور کو دریافت کیا ہے۔

امیر حسن نورانی نے ''اُردو کے چاند تارے'' میں میرؔ کے کلام کو سادہ اور صنعتوں سے پاک قرار دیتے ہوئے اس میں سوز وگداز، روانی اور تاثیر کی نشاندہی کی ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ''بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں متعصبانہ آراء بھی دی ہیں۔

ایم نذیر تشنہ نے اپنی کتاب ''اُردو ادب کا ارتقاء'' میں میرؔ کی غزل کو پورے عروج پر قرار دیا

ہے اور اس غزل کے المیہ لہجے کو خارجی اور ذاتی حالات کی پیداوار قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان حالات کی وجہ سے ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب کا نمونہ تھی۔

ڈاکٹر ناہید کوثر نے ''اُردو شاعری کا ارتقاء'' میں میرؔ کی شاعری کو عوامی لب و لہجہ کی حامل شاعری قرار دیا ہے۔

''اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات'' میں ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں کہ میرؔ نے غزل میں اپنے عہد کی روح کو سمو کر رکھ دیا ہے۔ ان کی تہذیب کا مرکز و محور تصوّف تھا جو عشق کی بنیاد پر قائم تھا۔ ان کی شاعری میں خمریات، عشق کی رسمی تصویریں اور امرد پرستی کے مضامین کی کثرت ایرانی تہذیب کی وجہ سے ہے۔ وہ صرف غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں دیگر اصنافِ شاعری غزل ہی کی توسیع ہیں۔

جمیل احمد ''اُردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کا اصل رنگ غزل گوئی میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کی غزل غیرت و خودداری، عارفانہ رنگ، خمریات، فلسفہ کی آمیزش، ندرتِ بیان، لطافتِ خیال، حسنِ تشبیہ، روزمرہ اور محاورہ کی خوبصورت آمیزش کا نمونہ ہے۔

انجم اعظمی نے ''ادب اور حقیقت'' میں میرؔ کے لہجے کو اُردو کا سب سے نرم، مانوس، دلگداز اور باوقار لہجہ قرار دیا ہے۔ ان کا درد و غم ایک گلدستے کی شکل میں سامنے آیا ہے، کیونکہ ان کے ہاں ایک ناکامی کے بعد دوسری ناکامی کے لیے جدوجہد کا تسلسل ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ''آئینۂ سخن فہمی'' میں میرؔ کے شعر میں حشویات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی اختصاری صورت بھی پیش کر دی ہے جس پر دیگر نقادوں نے اس بنیاد پر اعتراضات کیے ہیں کہ یہ میرؔ کے کلام پر اصلاح کی کوشش ہے۔

سید مرتضٰی زیدی نے ''تنقیدی ادب'' میں میرؔ کے کلام میں مشاہدے کی گہرائی، بول چال کا انداز، دردمندی، موسیقیّت، تصوّف، مصوّری، حسن و عشق اور انسان دوستی جیسی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں عظیم شاعر ثابت کیا ہے۔

ڈاکٹر عارف بٹالوی نے اپنی کتاب ''جنت میں مشاعرہ'' میں میرؔ کی شاعری کو ایسی شاعری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس میں زندگی کے درد و غم بیان کیے گئے ہیں جبکہ ان کے خیال میں

سوؔدا کے ہاں زندگی کی خوشی کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اسی لیے میرؔ کی شاعری ''آہ'' اور سوؔدا کی شاعری ''واہ'' ہے۔

فرزانہ سیّد نے ''نقوشِ ادب'' میں میرؔ کی شاعری کو المیہ شاعری قرار دیتے ہوئے انھیں مسلّم الثبوت شاعر تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے سلجھی ہوئی زبان میں ذاتی حوالوں کو کائناتی وسعت دے کر اپنی شاعری کو ایسا انداز بخشا ہے جو کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

پروفیسر خالد ندیم نے ''میرؔ سے فیضؔ تک'' میں میرؔ کے ساتھ آرزو کے رویئے کو تکلیف دہ قرار دیا ہے اور ان کی شاعری کے عروج کا زمانہ ان کے دلّی کے قیام کے زمانے کو قرار دیا ہے۔

''سفینۂ ادب'' میں پروفیسر حمید احمد خان نے سوز و گداز کو میرؔ کی طبیعت کا خاص رنگ قرار دیا ہے۔ غمِ عالم کے ساتھ ساتھ عشق و محبت اور تصوّف ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔

کلیم الدّین احمد ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی قوّتِ حاسہ محدود اور مخصوص تھی۔ اسی وجہ سے ان کے جذبات و تصوّرات میں تنوّع نہیں پایا جاتا۔ وہ عشق کو باعثِ نشاط نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس کا حاصل یاس انگیز ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کے مضامین پامال ہونے کے باوجود اثر کے حامل ہیں۔ وہ ایک کامل مصوّر ہیں جو خارجی اور باطنی تصویریں حسن و خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی رسماً ہے جب کہ اصل عشق، عشقِ مجازی ہی ہے۔ ان کے کلام میں ایسی ناہمواری ہے جو ناگوار محسوس ہوتی ہے۔

سیّد آغا حیدر کی تصنیف ''مطالعہ آبِ حیات'' میں آزاؔد کی تحقیقی کمزوریوں کا دفاع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں انھوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ آزاؔد نے ''نکات الشعراء'' کو دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ''نکات الشعراء'' کا اصل نسخہ ''آبِ حیات'' لکھتے وقت آزاؔد کے سامنے تھا جبکہ متداول نسخہ کئی ترامیم کے بعد موجود شکل میں سامنے آیا۔

سیّد امداد امام اثرؔ نے ''کاشف الحقائق'' میں میرؔ کی غزل کو داخلیت کی مظہر قرار دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں دل گرفتگی، محزونی اور نشتریت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا انداز ایسا ہے جس کا اتباع آج تک کوئی شاعر نہیں کر سکا۔

حکیم عبدالحئی نے ''گلِ رعنا'' میں میرؔ کی نازک مزاجی اور بد دماغی سے متعلق آزادؔ کے الزامات کو ردّ کرتے ہوئے انھیں مہذّب، زندہ دل، یارباش، انصاف پسند اور وضع دار انسان قرار دیا ہے جنھوں نے سو برس عمر پائی اور فورٹ ولیم کالج میں ان کا انتخاب عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے نہ ہو سکا۔

عبدالسلام ندوی نے ''شعرالہند'' میں میرؔ کے ہاں عاجزی کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی غزل کو تغزل کی حامل قرار دیا ہے۔ ان کے قصائد سوداؔ سے کم درجے کے ہیں لیکن مثنوی ان کی غزل جتنا بلند مقام حاصل نہ کرنے کے باوجود عام پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔

ادبی تاریخ نگاری کی روایت نے اُردو ادب کے رجحانات کو موضوع بنایا ہے، چونکہ رجحانات بنانے میں شخصیات کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ اس لیے ان تواریخ میں میرؔ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اب ہم ادبی تواریخ میں ''میر شناسی'' کے انداز پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ ادبِ اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ نے ساری زندگی غموں میں بسر کی جس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوا۔ اس غم کی نوعیّت ذاتی سے بڑھ کر آفاقی ہے۔ ان کی شاعری میں احساس اور جذبے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ عشق ان کے ہاں ذاتی حوالے سے بھی ہے اور کائناتی حوالے سے بھی لیکن عشق کے کیفیات میں وہ انسانی سطح برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان اور انسانی رشتوں کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل کی زبان عام بول چال کی زبان ہے جس میں تخلیقی شعور پایا جاتا ہے۔ یہ زبان ان کی اپنی خاص زبان ہے جس نے فارسی زبان کی حاکمیّت کو ختم کر دیا۔ غزل میں انھیں بلند مقام ملا لیکن دیگر اصنافِ شاعری میں انھیں غزل جتنا بلند مقام نہ مل سکا۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کے قصائد اس اہمیّت کے حامل نہیں ہیں جس اہمیّت کی حامل ان کی غزل ہے۔ ان کے دردمند دل نے ان کی زبان کو سادہ اور دردمند بنا دیا۔ ان کی مثنویاں کمزور ہونے کے باوجود اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری نے ان کی شخصیت اور زندگی کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ ان کا ذاتی غم، کائناتی غم کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔ وہ زندگی کو گوہرِ گرامی سمجھتے ہیں جو موت کے بغیر نامکمل ہے۔ خدا کی بحث میں وہ صوفیاء کے عام عقائد کے ہمنوا

ہیں۔ انھوں نے سچی کیفیاتِ قلبی کو سادہ اور مؤثر زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی کوئی بھی کامیاب تقلید نہیں کر سکا۔

ڈاکٹر انور سدید ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری داخلی واردات اور پریشان حال دور کی سماجی صورت کا آئینہ ہے۔ انھوں نے ذات کے حوالے سے کائنات کے تجربات سادہ زبان میں بیان کیے جو صداقت اور معصومیت رکھتی ہے۔ مزاج کے اعتبار سے وہ بھی صوفی تھے لیکن انھوں نے تصوّف کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر ''تاریخ ادبِ اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ اور غم لازم وملزوم ہیں لیکن ان کے ہاں نشاطیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ غزل میں انھیں بلند مقام حاصل ہے جب کہ ان کی مثنویاں فنی کمزوریوں کے باوجود اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی زندگی تضادات کا شکار رہی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ انھوں نے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے سادہ ترین زبان استعمال کی۔ اگر چہ انھوں نے مثنوی کی صورت میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان کا سارا زور غزل پر صرف ہوا ہے۔ ان کی شاعری سہل ممتنع، جذبے کے رچاؤ اور احساس کی گھلاوٹ کا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین ''مختصر تاریخ ادب اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ آرزو کے برتاؤ نے میرؔ کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ اُن میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی۔ غزل میں ان کا پایہ سب سے بلند ہے جس میں انھوں نے تغزل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے۔ اُردو میں وہ واسوخت کے موجد ہیں۔

''مختصر تاریخ ادبِ اُردو'' کے مصنف محمود بریلوی کے خیال کے مطابق میرؔ کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ ہے اور غزل میں کوئی شاعر ان کے مقام تک نہیں پہنچ سکا۔ نسیم قریشی ''اُردو ادب کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ واسوخت کے موجد ہیں لیکن اُردو ادب میں ان کا مقام غزل کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سچے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی زبان سادہ، نرم اور میٹھے انداز کا خوبصورت امتزاج ہے۔ صغیر احمد جان ''تاریخ زبان و ادب'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی غزل اُردو شاعری کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ ان کی مثنویاں کمزور منظر نگاری کے باوجود اہم مقام رکھتی ہیں۔

آغا محمد باقر نے ''تاریخ نظم ونثر اُردو'' میں میرؔ کو بے حد وضعدار، کم گو اور آزاد طبیعت انسان

لکھا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ان کے کلام میں مایوسی اور درد ہے۔ وہ اُردو میں واسوخت، مربع اور مثلث کے موجد ہیں۔ ان کے اشعار جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ ''تاریخ ادبیات اُردو'' کے مصنف ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے لکھا ہے کہ انھیں دنیا کا روشن پہلو کبھی نظر ہی نہیں آیا۔ ان کے کلام میں درد و سوز بہت زیادہ تھا۔ وہ فطری شاعر تھے جن کی شاعری کو سادگی، موسیقیت، سوز و گداز، لطافت و پاکیزگی، سہل ممتنع اور تغزل نے عالمگیر حسن عطا کیا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ''اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ'' کے مطابق میرؔ اُردو غزل کے بڑے اُستاد ہیں جن کی زندگی آلام و مصائب میں گزری جس کی وجہ سے ان کے کلام میں درد وغم پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی زبان سہل ممتنع کی حامل ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' میں میرؔ کی شاعری کو دل اور دلّی کے مرثیے قرار دیتے ہیں۔ انھیں غزل میں نمایاں مقام ملا لیکن مثنوی کے فروغ میں بھی ان کا کردار نہایت اہم ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی ''اُردو زبان و ادب کا خاکہ'' میں میرؔ کو اُردو غزل کا مسلّم الثبوت اُستاد قرار دیتے ہیں۔ ان کی زندگی پریشان حالی میں گزری جس کا عکس ان کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ان کا غم ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ کائناتی بھی ہے۔ وہ قنوطی ہرگز نہیں تھے۔ انھوں نے انسان اور عشق کا بلند تصوّر اپنی شاعری میں پیش کیا۔

ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کی کتاب ''تعارف تاریخِ اُردو'' کے مطابق سادگی میرؔ کی شاعری کا خاصہ ہے جس نے ان کی فصاحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کیا۔ ان کی غزل بہترین ہے جبکہ مثنویوں میں سوز و گداز کا پہلو بھی قابلِ تعریف ہے۔ مضامین کی جدّت، تاثیر، نشتریّت اور شیرینی ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

سیّد احتشام حسین نے ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں میرؔ کی غزل کو ان کی دیگر اصنافِ شاعری سے بہت بہتر قرار دیا ہے۔ عطش درانی نے بھی ''اُردو اصناف کی مختصر تاریخ'' میں میرؔ کی غزل کو اس تغزل کی وجہ سے بلند درجہ قرار دیا ہے جو انھوں نے سادگی سے نبھایا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے "A History of Urdu Literature" میں میرؔ کو ضابط، کم گو اور آزاد طبیعت قرار دیا ہے۔ میرؔ سے متعلق آزادؔ کی آراء کو انھوں نے ردّ کر دیا ہے۔ ان کے خیال کے

مطابق میرؔ کی زندگی درد سے معمور تھی۔ ان کی شہرت غزلوں اور مثنویوں کی وجہ سے ہے۔ الفاظ کی سادگی، سلاست ِزبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوّف ان کی شاعری کی خوبیاں ہیں۔ ان کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جو ''آبِ حیات'' لکھتے وقت آزادؔ کی نظر سے نہیں گزرا۔

''A History of Urdu Literature'' ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی شاعری کو درد وغم کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ جس میں زمانے کی پوری روح سمٹ آئی ہے۔ ان کے شہر آشوب، سوداؔ کے شہر آشوب سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ انھوں نے شاعری کے لیے سادہ زبان استعمال کی۔ ان کے ہاں جو سادگی پائی جاتی ہے وہ بالکل سپاٹ ہے۔ اگرچہ انھوں نے مختلف اصناف میں شاعری کی لیکن انھیں سب سے زیادہ کامیابی غزل میں ہوئی۔ ان کی اعلیٰ پائے کی شاعری بہت اعلیٰ ہے جب کہ پست شاعری زیادہ پست درجے کی ہے۔

"An Outline of Urdu Literature" میں Naz نے میرؔ کی غزل کو احساسات کی ترجمان قرار دیتے ہوئے انھیں غزل کا ایک ایسا شاعر قرار دیا ہے جس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی لیکن قصائد میں سوداؔ کو میرؔ پر برتری حاصل ہے۔ ناز نے اس کتاب میں میرؔ کی زندگی اور فن پر مروّجہ خیالات کو ہی بیان کیا ہے۔ جس سے میرؔ کی ایک تصویر تو ہمارے سامنے آتی ہے لیکن ان کی زندگی اور فن کے متعلق کسی نئے پہلو کو سامنے لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

جزوی کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ''میرؔ شناسی'' کے حوالے سے تحسینی اور تردیدی دونوں رویّے ہمیں نظر آتے ہیں لیکن ردِّ میرؔ کا رویّہ، تحسینِ میرؔ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس تحسین و تردید میں میرؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو تصویر بنتی ہے اس کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں اکبرآباد میں محمد علی کے گھر پیدا ہوئے لیکن کچھ نقادوں نے میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ بھی لکھا ہے۔

۲۔ میرؔ سیّد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ ان کی زندگی میں مشکلات بہت زیادہ تھیں لیکن جب وہ لکھنؤ آئے تو انھیں قدرے خوشحالی نصیب ہوئی۔

۴۔ ان کی ذات میں خودداری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

۵۔ اگرچہ آرزؔو نے میرؔ کی شاعری میں معاونت کی لیکن میرؔ نے اس کا برملا اظہار کبھی نہیں کیا۔

۶۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

۷۔ میرؔ نے ابتدائی عمر میں شاعری شروع کر دی۔

۸۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

۹۔ غزل میں ان کا کوئی شاعر مقابلہ نہیں کرسکتا۔

۱۰۔ وہ مثنوی کے بھی بہترین شاعر ہیں لیکن ان کی مثنویوں میں فنی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔

۱۱۔ سہل ممتنع ان کی شاعری کی بنیادی خوبی ہے۔

۱۲۔ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ شاعری میں وہ کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔

۱۳۔ میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اُردو شعراء کے دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے جس نے تذکرہ نگاری کی روایت پر گہرے اثرات مرتّب کیے۔

''میرؔ شناسی'' کی روایت میں ادبی تذکروں، مکمل اور جزوی کتب کے ساتھ ساتھ انتخابات کے دیباچوں اور مقدّموں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

''شعرِ شورانگیز'' ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کا انتخاب کلام میرؔ مع تشریحات ہے جسے انھوں نے چار جلدوں میں پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے میرؔ کے کلام کا معتبر متن پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مشرقی شعریات کے حوالے سے سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے میرؔ اور غالبؔ کو الگ الگ طرح کا شاعر قرار نہیں دیا کیونکہ دونوں کے اسلوب الگ الگ ہونے کے باوجود شعریات ایک ہی ہے۔ غالبؔ نے بھی میرؔ کے تجربات اور وسائلِ اظہار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا ہے۔ میرؔ کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ انھوں نے روزمرہ یا خالص زبان کی شاعری کی ہے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری میں کئی طرح کے لسانی اور شاعرانہ وسائل کا استعمال کیا ہے۔ اصل میں ان کا کلام ہمیں گھریلو

اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان کے استعمالات اب عوام کی سطح پر ہیں۔ میرؔ کا عاشق روایتی عاشق ہے جس کے انسانی رشتوں سے تعلق کی بنا پر میرؔ ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کے کردار حقیقی کردار ہیں۔ ان کی شاعری کا معشوق بے بس ہرگز نہیں بلکہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ ان کے ہاں جنسی مضامین میں بھی گہرائی ہے۔ وہ ان مضامین میں بھی معنی آفرینی اور مضمون آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے وصل کی لذت اندوزی کے وقت بھی رعایتِ لفظی، ابہام اور استعارے سے کام لیا ہے۔

عشق میرؔ کے ہاں ایسا مرکزی نقطہ ہے جس کے حوالے سے انھوں نے کائنات کے ہر مظہر کو پیش کیا ہے۔ ان کے آہنگ کو دھیما، انفعالی اور نرم رُو قرار دے کر انھیں سراپا یاس وحرماں، منفعل اور شکست خوردہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ غلط ہے بلکہ ان کے کلام کے معنی کو بھی ہم دھیما، انفعالی اور نرم رو نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری پُرشور ہے اور یہ بلند قرأت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ شاعری بڑی شاعری ہے جو بار بار پڑھنے کے باوجود بھی ہماری گرفت میں نہیں آتی۔ ان کے ہاں کثیرالمعنویّت ہے کیونکہ ہم ان کے متن کو منشائے مصنّف سے ہٹ کر پڑھتے ہیں۔ ادب چونکہ اقدار سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کی سائنسی توجیہ ہو ہی نہیں سکتی۔ ادب کا مطالعہ محض تنقیدی نظریات کی روشنی میں ناممکن ہے کیونکہ ادب کے معیار کا فیصلہ صرف وہی تہذیب کرتی ہے جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہو۔ کلاسیکی غزل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس غزل کی شعریات کو دریافت کریں۔ اگر ہمیں میرؔ کے صحیح مقام کا تعیّن کرنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی غزل کو اس کی اپنی شعریات اور رسومیات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں لفظ کے معنی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ان کے ہاں کیفیت کے ساتھ معنی کی کثرت بھی ہے۔ انھوں نے استعارے کو لغوی معنی میں استعمال کر کے اس سے پھر استعارہ بنایا ہے۔

''مزامیر'' جعفرعلی خان اثرؔ کا مرتّب کردہ کلامِ میرؔ ہے جس میں مرتّب نے ان کے کلام کو ایسا خزانہ قرار دیا ہے جس سے ہر اہلِ نظر فیض اور لذت اُٹھا سکتا ہے۔ انھیں تصوّف کے حوالے سے بھی عظمت حاصل ہے لیکن دردؔ سے کم۔ میرؔ نے شاعری کے جن اصولوں کا تذکرہ

''نکات الشعراء'' میں کیا ہے۔ اُن اصولوں کی انھوں نے اپنی شاعری میں بھی پیروی کی ہے۔ مرتب نے ''ذکرِ میر'' کے حوالے سے بیان کردہ حالات و واقعات کو درست تسلیم کرتے ہوئے ان کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیونکہ ان حالات و واقعات کا ان کی شاعری پر براہ راست اثر ہوا ہے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ میرؔ نے ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنے والد کا کہیں پر ذکر نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس صفحے کی نشان دہی بھی کر دی ہے جس پر ان کے والد کا نام لکھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری ظاہری و معنوی خوبیوں کی حامل ہے جس میں انھوں نے ہمہ گیر تخیّل اور قوّتِ اختراع کی آخری حدوں کو چھونے کے باوجود حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے ہاں سہل ممتنع کے باوجود معنی کا دریا موجزن ہے۔ اُردو میں صرف میرؔ ایک ایسے شاعر ہیں جو پاکیزہ عشق کے نغمے گاتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق میں وضعِ احتیاط دونوں طرف سے دیدہ درائی کی مانع ہے۔ وہ بناوٹی ناز نخرے اور بے جا غرور و تمکنت کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان کا عشق مساوات کی توقّع رکھتا ہے۔ عام اُردو شعراء نے صرف عاشق کو نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کو ذلیل قرار دیا ہے لیکن میرؔ کے سامنے تو ہمیشہ انسان کی عظمت رہی ہے۔ اُردو شاعری میں صوتی تراکیب کا فقدان ہے لیکن ان کی شاعری بہترین صوتی تراکیب کا نمونہ ہے۔

میرؔ کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے مناظرِ فطرت کا مطالعہ نہیں کیا اور وہ گوشہ نشیں شاعر تھے۔ انھوں نے دربدر کی خاک چھانی تھی۔ اس لیے ان کی شاعری میں مناظرِ فطرت کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے عریانی، ابتذال اور حیا سوزی سے بچ کر ادا نگاری کی ہے جو کہ نہایت مشکل کام ہے۔ ان کے ایسے اشعار پڑھ کر روحانی لذّت تو ہوتی ہے لیکن نفسانی اشتعال نہیں ہوتا۔ انھوں نے رباعی کی بحر میں غزل کہی اور وہ اُردو میں واسوخت کے موجد ہیں۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر امرناتھ جھا کے مقالے میں میرؔ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انھوں نے جس زمانے میں شاعری کی اس زمانے میں اُردو زبان کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہر دور میں ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے سادگی سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود اظہارِ خیال پر اپنی قدرت کو برقرار رکھا ہے۔ ''محزونیت'' ان کی شاعری کی قدرِ مشترک ہے اور ان کے ہاں کوئی مربوط فلسفہ نہیں ہے۔

مولوی نورالرحمٰن ''انتخابِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری کی عظمت کو انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے جو اپنے وقت کے مجدّد تھے۔ ان کی طبیعت میں غصہ تھا۔ وہ دلّی سے بڑی محبّت رکھتے تھے اس لیے لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ سے بیزار رہے۔ انھیں زبان کی اصلاح اور تحفظ کا بڑا خیال تھا۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو اپنا بنا کر استعمال کیا ہے۔ محاکات میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں رندانہ مضامین شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے ہیں وگرنہ وہ پرہیزگار تھے۔

امیر حسن نورانی نے ''میر تقی میرؔ ۔۔۔ حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام'' میں ان کو نہایت خوش اخلاق، دوست نواز اور وضع دار آدمی قرار دیا ہے۔ وہ باتیں کم کرتے تھے لیکن زود رنج تھے۔ دلّی میں جب حالات خراب ہوئے تو انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن بعد میں آصف الدّولہ نے انھیں لکھنؤ بلا کر درباری ملازمین میں شامل کر لیا اس کے باوجود انھیں لکھنؤ سے محبت نہ ہو سکی۔ ان کے ہاں رنج و غم معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے تھا۔

''انتخاب کلامِ میرؔ مع مقدّمہ'' میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ان کا کلام عالمگیر حسن کا حامل ہے۔ آرزؔو کے ساتھ ان کے تعلّقات ناخوشگوار تھے۔ ان کی ساری زندگی نامساعد حالات میں گزری، شگفتگی اور زندہ دلی ان کے نصیب میں نہیں تھی۔ ان کا کلام اردو شعراء میں تاثیر کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں رطب و یابس بھی ہے۔ ان کی اپنے عہد میں عزت ان کے کلام اور سیرت دونوں وجہ سے ہوئی۔

علی سردار جعفری کے مرتّب کردہ ''دیوانِ میرؔ'' کے مطابق لوگوں کو میرؔ کے کلام میں اپنا درد محسوس ہوا جس کی وجہ سے انھوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں کمتر درجے کے شعراء کا کلام بھی شامل ہو گیا۔ ان کی شاعری سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ بانکی بھی ہے۔ ان کا غم کائناتی اور شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری نے اُردو زبان کو مقامی بولیوں سے آزاد کرا کر ہندوستان گیر زبان بنا دیا۔ ولؔی کی شاعری کے ان پر اثرات ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری کو صرف محبوب تک محدود نہیں رکھا۔ اگرچہ ان کی شاعری کا دردیہ پہلو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے لیکن ان کے ہاں نشاطیہ رنگ کی بھی کمی نہیں ہے۔

عبدالباری آسی کے مرتب کردہ ''دیوانِ میر'' میں میر کا سالِ وفات ۱۸۰۸ء درست تسلیم کیا گیا ہے جب کہ دیگر میر شناسوں نے ان کا سالِ وفات ۱۸۱۰ء لکھا ہے۔ آسی کے خیال کے مطابق میر فطری شاعر ہونے کے باوجود آرزو کے شاگرد تھے جن سے ان کے تعلقات عشق کی وجہ سے خراب ہوئے۔ ان کی شاعری کی تعریف ہر نقاد نے کی ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ بلا لیا جہاں پر ان کی بڑی قدردانی ہوئی۔

ظلِ عباس عباسی کے مرتب کردہ کلیاتِ میر میں میر شناسوں کے تحقیقی مقالات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ ہر بڑے شاعر کے منکر موجود ہیں لیکن میر کا کوئی منکر نہیں ہے۔ ان کے ہاں مقامی اور آفاقی حقیقتیں ایک ہو گئی ہیں اور انھوں نے اس زندگی اور اس کے مظاہر سے جتنے معنی نکالے ہیں۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ رشید احمد صدیقی کے خیال کے مطابق میر کے کلام کی تاثیر عالمگیر ہے اور انھوں نے صرف اردو اور اپنے مخصوص لب و لہجے سے کام لیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے میر کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ''ذکرِ میر'' کے بیان کردہ بیانات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کی۔ نثار احمد فاروقی نے میر کی آپ بیتی کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تحقیقی اور تنقیدی آراء بھی دی ہیں۔ ظلِ عباس عباسی نے ان تذکروں کا ذکر کیا ہے جن میں میر پر آراء شامل ہیں لیکن انھوں نے ان آراء کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ آل احمد سرور، میر کے مطالعے کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر کی مسلمہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھیں دورِ حاضر کے جامع تنقیدی اصولوں کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ میر کی ذاتی زندگی کو صرف ''ذکرِ میر'' کے حوالے سے سمجھنا اور درست تسلیم کر لینا صحیح نہیں بلکہ دیگر حوالوں سے تحقیق کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ میر کی شاعری کے حوالے سے ان کا خیال ہے کہ اس شاعری کو ایک اصطلاح میں بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ اس میں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور ایک حساس اور دردمند انسان کا گریہ موجود ہے۔ فراق گورکھپوری ''میر کی عالمگیر مقبولیت'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے داخل ترین محسوسات کی کم سے کم اور معمولی سے معمولی الفاظ میں اتنی فطری مصوری کی ہے جو کوئی اور شاعر نہیں کر سکا۔ محمد حسن عسکری ''میر جی'' میں لکھتے ہیں کہ میر کے ہاں

زندگی کا جس قسم کا شعور پایا جاتا ہے، وہ انگریزی شاعروں کے ہاں بھی موجود نہیں ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ''اسلوبیاتِ میرؔ'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ میرؔ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ محض بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے سبب یہ زبان میرؔ کے شدید انفرادیت کے حامل لہجے کو سامنے لاتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ میرؔ ہر قسم کے مضامین کو بڑی آسانی کے ساتھ شاعری میں شامل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے جنسی مضامین کو بڑی فنکاری کے ساتھ شاعری میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں کے مرتب کردہ ''کلیاتِ میرؔ'' کے مطابق میرؔ کو احساسِ کمتری نے خوددار، حساس اور زودرنج بنا دیا تھا۔ آخرکار ان کی خودداری اور خودپسندی، غرور اور نخوت میں بدل گئی۔ مرتب نے میرؔ کے مرثیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے واقعاتِ کربلا کے دردانگیز مناظر کو منتخب کر کے بار بار نظم کیا ہے۔

''فرہنگ کلامِ میرؔ: دیوان اوّل مع مقدّمہ'' میں شاہینہ تبسم لکھتی ہیں کہ زبان کے حوالے سے میرؔ نے محاورۂ دلّی ہی کو مستند سمجھا ہے۔ انھوں نے الفاظ کا مناسب ترین استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں سنسکرت الفاظ، فارسی مرکبات وتراکیب اور ہندی محاورات کا خوبصورت استعمال اس طرح ہوا ہے کہ یہ اُردو زبان کے لیے اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ انھوں نے زبان کا آزادانہ استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس زبان کے حوالے سے ان کے ہاں کوئی بدصورتی نہیں پائی جاتی۔ وہ کئی زبانوں سے استفادہ کر کے اُردو زبان کو نیا طرز اور مخصوص انداز دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حامدی کاشمیری نے ''انتخاب کلامِ میرؔ'' میں لکھا ہے کہ ابھی تک میرؔ کی تحسین شناسی ادھوری ہے جب کہ وہ باکمال شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھیں لسانی اظہارات پر مکمل قدرت حاصل ہے۔

''بدن نامۂ میرؔ'' ایم۔اے یزدانی کا مرتب کردہ کلام میرؔ ہے جس میں انھوں نے میرؔ کے اشعار کو انسانی جسم کے اعضاء کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ ان کے خیال میں بھی میرؔ کا غم صرف ذات کا غم نہیں بلکہ نوعِ بشر کا غم ہے۔

ناصرؔ کاظمی نے میرؔ کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اس میں انھوں نے میرؔ کے ذاتی، سیاسی اور

سماجی ماحول کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے زمانے اور میرؔ کے زمانے کے درمیان تعلّق کا کھوج لگایا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مرتّب کردہ ''نکات الشعراء'' کے مطابق یہ اُردو شعراء کے دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے کی عبارت ایجاز، شگفتگی اور پختگی کی حامل ہے اور تنقید منصفانہ اور بے باکانہ ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ''مثنویاتِ میرؔ بخطِ میرؔ'' میں میرؔ کے رسم الخط کو سامنے لا کر ''میرؔ شناسی'' کا ایک نیا انداز متعارف کرایا ہے۔

انتخابات کے دیباچوں اور مقدّموں کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل کے تحقیقی و تنقیدی مضامین نے بھی ''میرؔ شناسی'' میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ مضامین میرؔ کی زندگی اور فن کو سامنے لانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ان کی زندگی پر لکھے جانے والے مضامین میں ان کی زندگی کے بے شمار گوشوں کو متعارف کرایا گیا ہے لیکن ابھی تک ان کی زندگی پر مختلف حوالوں سے کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔ ان کے فن کے حوالے سے لکھے جانے والے مضامین میں اُن کے فن کو تحقیقی اور تنقیدی انداز سے پرکھتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو نمایاں کر کے ان کے فنّی مرتبے کا تعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین میں ''میرؔ شناسی'' کے ساتھ ساتھ میرؔ شکنی کا انداز بھی نظر آتا ہے لیکن یہ انداز ان کے خلاف کوئی تحریک یا رجحان پیدا نہیں کر سکا۔

''میرؔ شناسی'' کا ایک انداز جامعات کی سطح پر ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات کی صورت میں بھی ہے۔ اگرچہ ان مقالہ جات کی کوششیں طالب علمانہ سطح پر ہیں لیکن ماہرینِ مضمون کی نگرانی ان کی قدر و قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیتی ہے۔ اگرچہ ان مقالہ جات کا غالب رجحان ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور تنقید ہے لیکن ان میں اُن کی زندگی پر بھی قابلِ قدر تحقیق و تنقید نظر آتی ہے۔

میرؔ شناسی کی ابتداء میرؔ کی اپنی ذات سے ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پر محیط عرصہ کتابی حوالے سے دیکھا جائے تو صرف تذکرہ نگاری کی روایت پر مشتمل کتب ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں میرؔ شناسی کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کتب میں میرؔ شناسی کا انداز جدید تحقیقی اور تنقیدی معیار پر کس حد تک پورا اُترتا ہے، اس حوالے سے بحث کے بجائے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تذکرہ نگاری نے میرؔ کی ذات اور فن کو کس حد تک نمایاں کیا ہے اور اس کا انداز کیا ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت زیادہ تر فارسی تذکروں پر مشتمل ہے، اردو شعراء کے احوال پر مشتمل چند ایک تذکرے ضرور مل جاتے ہیں جن کے لیے اُردو زبان کا سہارا لیا گیا ہے لیکن غالب رجحان کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو شعراء کا حال بیان کرتے وقت بھی فارسی زبان میں تذکرے لکھنے کو ترجیح دی گئی ہے۔

میرؔ شناسی کے ابتدائی نقوش ان کی اپنی شاعری میں بھی ہیں لیکن اس کا انداز شاعرانہ تعلّی کا حامل ہے۔ بے شک یہ شاعرانہ تعلّی آنے والے وقت نے سچ ثابت کر دی لیکن اپنی ذات کے بارے میں زیادہ آگاہی ہونے کے باوجود بھی بندہ اپنی خامیوں کو شعوری طور پر چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرؔ کے ہاں بھی خودشناسی توصیفی انداز کی حامل ہے۔

؎ کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

؎ حُسن تو ہے ہی کرو لطفِ زبان بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

لیکن اس توصیفی انداز کے باوجود میرؔ شناسی کا یہ رویّہ ان کی شاعری کی کئی خصوصیات کو سامنے لانے میں کامیاب رہا۔

تذکرہ نگاری کی روایت جو ''نکات الشعراء'' ۱۷۵۲ء سے شروع ہوئی اور ''آبِ حیات'' ۱۸۸۰ء تک جاری رہی، اس روایت میں میرؔ شناسی کی کوششوں کو میرؔ شناسی کے ابتدائی نقوش تصوّر کر سکتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں وہ تحقیقی اور تنقیدی انداز اختیار نہیں کیا گیا جس کا تقاضا آج کا قاری کرتا ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت میں تین قسم کے واضح رویّے سامنے آتے ہیں:

۱۔ توصیفی رویّہ

۲۔ معاندانہ رویّہ

۳۔ معتدل رویّہ

توصیفی انداز اختیار کرنے والے تذکرہ نگاری میں قیام الدّین قائمؔ، لچھی نرائن شفیقؔ، قدرت اللہ شوقؔ، میر حسن، مردان علی خان مبتلاؔ، اعظم الدّولہ سرمدؔ، قطب الدّین باطنؔ، محمد حسین خاں،

کلبِ حسین نادؔر اور بھگوان داس ہندی شامل ہیں۔ توصیفی انداز کے حامل تذکروں کے ساتھ ساتھ میرؔ کی مخالفت میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ ان تذکرہ نگاروں کا رویّہ میرؔ کے ساتھ معاندانہ رہا۔ ان تذکرہ نگاروں میں غلام حسین شورشؔ، امیر الدّین امؔر اللہ، قدرت اللہ قاسؔم اور سعادت خان ناصؔر شامل ہیں۔ توصیفی اور معاندانہ رویّے کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاروں نے کسی حد تک معتدل رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان تذکرہ نگاروں میں غلام ہمدانی مصحفیؔ، علی ابراہیم خاں، مرزا علی لطفؔ، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، کریم الدّین رفیلن، سید محسن علی، مولوی عبدالغفور نساخؔ، سیّد علی حسن خان اور محمد حسین آزادؔ شامل ہیں۔

ادبی تذکرہ نگاری کی روایت میں میرؔ کے بارے میں فراہم کردہ معلومات اور کلام کے بارے میں تنقیدی رویّہ آج کے تحقیقی اور تنقیدی معیار پر پورا نہ بھی اُترے تو اس روایت کو میرؔ کے بارے میں چند بنیادی معلومات کی فراہمی کا نمونہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ادبی تذکرے جو توصیفی رجحان کے تحت لکھے گئے ان میں میرؔ کی ذات اور کلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ تعریفوں پر مبنی ہے اور بڑی حد تک کوشش کی گئی ہے کہ کوئی ایسا جملہ نہ لکھا جائے جو ان کی ذات اور کلام کی قدر و قیمت کم کرنے کا سبب بنے۔ وہ تذکرہ نگار جنھوں نے معاندانہ رویّہ اختیار کیا ان کا مقصد میرؔ کی ذات اور فن کی تحقیر کرنا تھا۔ انھوں نے شعوری طور پر ان کے بارے میں ایسی باتیں کیں جو ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کے لیے نقصان دہ تھیں۔ معتدل رویّہ اختیار کرنے والوں نے جہاں پر میرؔ کی ذات اور فن کے بارے میں خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے وہاں پر ساتھ ساتھ ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا بھی ضروری سمجھا ہے۔

تذکرہ نگاری کی روایت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میرؔ کی ذات اور فن کے حوالے سے جو تصویر بنتی ہے اس کے نمایاں خدّ و خال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ، اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔

۲۔ شاعری میں سراج الدّین علی خان آرزؔو نے ان کی معاونت کی۔

۳۔ وہ متوکل انسان تھے۔

۴۔ وہ اس زمانے میں کسی کو اپنا مخاطب نہیں سمجھتے تھے اس لیے عزیز و اقارب انھیں مغرور، خود پسند اور غیر منصف سمجھتے تھے۔

۵۔ اسّی سال کی عمر تک ان کے چار دیوان ریختہ اور ایک دیوان فارسی کے ساتھ، متعدّد مثنویاں اور شکارنامے سامنے آچکے تھے۔

۶۔ میرؔ ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ گئے۔

۷۔ چھے دیوان ریختہ مع قصائد اور مثنوی، ایک دیوان فارسی، تذکرہ ''نکات الشعراء'' ایک رسالہ ''فیضِ میرؔ'' اور آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' ان کی تصانیف ہیں۔

۸۔ میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ اور علی متقی دونوں لکھے گئے ہیں لیکن زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے علی متقی نام سے اتفاق کیا ہے۔

ایسے تذکرے جن میں میرؔ شکنی کا انداز اختیار کیا گیا ہے ان کے مطابق:

۱۔ میرؔ، سیّد نہ تھے۔

۲۔ وہ فطرتاً مغرور اور سب شاعروں کی عیب جوئی کرتے تھے۔

۳۔ وہ خودسر اور بدمزاج تھے۔

تذکرہ نگاری کی روایت کے حوالے سے میرؔ کی شخصی تصویر اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ میرؔ، اکبرآباد میں پیدا ہوئے، نوعمری میں دلّی آگئے وہاں پر اپنے رشتہ دار سراج الدّین علی خان آرزوؔ سے شاعری میں اصلاح لیتے رہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں لکھنؤ آگئے اور یہاں پر ہی وفات پائی۔ وہ اپنے زمانے میں کسی کو اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے دوستوں میں مغرور اور متکبّر تصوّر کیے جاتے تھے۔ اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی سیادت پر شک کیا ہے لیکن اکثر تذکرہ نگار میرؔ کو سیّد ہی مانتے تھے۔

تذکرہ نگاری کی روایت کے مطابق میرؔ کی فنی تصویر کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ کی طبیعت معنی ایجاد تھی۔

۲۔ ان کی شاعری شستگی و رفتگی کی حامل ہے۔

۳۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت ہے۔

۴۔ ان کی سادہ گوئی بھی پرکاری و تہ داری کی حامل ہے۔

۵۔ میرؔ غزل اور مثنوی میں مرزا سوداؔ سے بہتر جبکہ قصیدہ اور ہجو میں مرزا سوداؔ ان

سے بہتر ہیں۔

۶۔ ان کا دردیہ شعر گوئی کا انداز کسی اور کو میسر نہیں ہے۔

۷۔ ان کی شاعری نکتہ پردازی، معنی آفرینی، سحر بیانی اور صنائع بدائع کی حامل ہے۔

۸۔ ان کے کلام میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ مطالب کی ادائیگی کمال درجے کی ہے۔

۹۔ ان کی غزل میں سوز، درد، تڑپ اور حسرت و یاس کے مضامین کی افراط ہے۔

۱۰۔ ان کی زبان سادہ اور ہندی کے قریب ہے جس میں فارسی تراکیب اور بندشیں کم ہیں۔

تذکرہ نگاری کی روایت باقاعدہ تنقید نگاری کی روایت نہیں تھی بلکہ یہ بیاض نگاری کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ جدید تنقیدی انداز آنے سے یہ روایت اگرچہ ختم ہوگئی لیکن جدید تحقیقی اور تنقیدی انداز کو پروان چڑھانے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

میؔر پر لکھی جانے والی مکمل کتب نے میؔر شناسی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کتب میں میؔر کی ذات اور فن کے حوالے سے لکھنے والوں نے مدلّل بحث کرتے ہوئے حتمی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مکمل کتب میں سے کسی کتاب میں تو میؔر کی پوری زندگی اور فن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں ان کی کسی تصنیف کو زیرِ بحث لاتے ہوئے میؔر شناسی کی روایت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ مکمل کتب میں میؔر کی زندگی اور فن پر بڑی مدلّل بحث کی گئی ہے۔ میؔر شناسی کی ایسی کوششیں کرنے والوں میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر افضال حسین قاضی، ایم۔ کے فاطمی، راشد آذر، عبدالمغنی، ادریس صدیقی اور محمد بن علی باوہاب وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی رویّہ اختیار کرتے ہوئے ان کی زندگی اور فن کی تصویر کو بھرپور انداز میں نمایاں کیا ہے۔ مکمل کتب میں سامنے آنے والا رویّہ بڑی حد تک معتدل ہے لیکن اس کے باوجود میؔر کی ذات اور فن کے حوالے سے اعتراضات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ محمد بن علی باوہاب جیسے ناقدین نے میؔر شناسی سے زیادہ میؔر شکنی کا رویّہ

اختیار کیا اور ان کی ذات اور فن کے حوالے سے جا بجا اعتراضات ہی کرتے چلے گئے۔

مکمل کتب نے میرؔ شناسی کی روایت میں مفید اضافے کیے۔ ان کتب میں میرؔ کی زندگی اور فن کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ان کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ، اکبرآباد میں ۱۷۲۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

۲۔ ان کے والد کا نام علی متقی تھا، اگرچہ بعض نقادوں نے ان کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے لیکن زیادہ تر نقاد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کے والد کا نام محمد علی ہی تھا جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔

۳۔ میرؔ کے والد اور منہ بولے چچا امان اللہ کی وفات اس وقت تک ہو چکی تھی جب میرؔ کی عمر گیارہ سال تھی جس کے بعد میرؔ کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

۴۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد میرؔ کے سوتیلے بھائی نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کو اکبرآباد چھوڑ کر دلّی آ گئے۔

۵۔ میرؔ جب پہلی بار دلّی آئے تو اس وقت ان کی عمر گیارہ سال تھی لیکن بعض نقاد اس سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اکبرآباد سے دلّی تک کا سفر اس زمانے میں گیارہ سال کے بچے کے لیے کرنا ممکن نہیں تھا لیکن زیادہ تر محققین کی رائے یہی ہے کہ میرؔ کی اس وقت عمر گیارہ سال ہی تھی۔

۶۔ دلّی میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہ واپس اکبرآباد آ گئے لیکن دوبارہ دلّی چلے گئے۔ اس وقت وہ وہاں پر اپنے سوتیلے ماموں سراج الدّین علی خان آرزوؔ کے گھر رہنے لگے۔

۷۔ آرزوؔ نے ان کی شعر گوئی میں معاونت کی لیکن بعد میں میرؔ اور آرزوؔ کے تعلّقات خراب ہو گئے اور اسی وجہ سے انھوں نے آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں آرزوؔ کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔

۸۔ میرؔ اور آرزوؔ کے تعلقات خراب ہونے کی وجہ میرؔ کا اُن کی بیٹی سے عشق اور مذہبی عقائد دونوں تھے۔

۹۔ میرؔ مختلف عمائدینِ سلطنت کی ملازمت کرتے رہے۔

۱۰۔ دلّی سے ساٹھ سال کی عمر میں وہ نواب آصف الدّولہ کے بلانے پر لکھنؤ گئے۔

۱۱۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں بیٹی، بیٹے اور بیوی کی موت کے صدمات سہنے پڑے۔

۱۲۔ وہ ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن کیے گئے لیکن آج اُن کی قبر کا نشان بھی باقی نہیں۔

مکمل کتب کے حوالے سے اُن کا جوفنی خاکہ بنتا ہے، اس کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں:

۱۔ میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اس صنفِ شاعری میں کوئی ان کا مقابل نہیں ہے لیکن اگر ان کے تمام کلام کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں رطب و یابس کی بھی کمی نہیں ہے۔

۲۔ میرؔ کی شاعری خارجیّت اور داخلیّت کا ایسا خوبصورت امتزاج ہے جہاں پر ذات اور کائنات کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے۔

۳۔ میرؔ کی مثنویاں اعلیٰ خوبیوں کی حامل ہیں لیکن اس کے باوجود یہ معیار کے لحاظ سے اُردو کی سب سے اچھی مثنویاں نہیں ہیں۔ ان مثنویوں کی تعداد اکتالیس ہے۔

۴۔ میرؔ کے قصائد اعلیٰ درجے کے ہرگز نہیں ہیں کیونکہ ان کا مزاج قصیدے سے ہم آہنگ ہی نہیں تھا، قصیدہ جس شان و شوکت کا تقاضا کرتا ہے وہ میرؔ کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔

۵۔ اُردو میں وہ واسوخت کے موجد ہیں۔

۶۔ اگرچہ غزل کے علاوہ اردو کی دیگر اصنافِ شاعری میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن ان اصناف میں وہ کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے۔

۷۔ ''نکات الشعراء'' اُردو شاعروں کا اب تک دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے۔

۸۔ ''نکات الشعراء'' کے متداول نسخے کی یہ صورت بہت سی تبدیلیوں کے بعد کی ہے۔

۹۔ میرؔ کی تصانیف یہ ہیں:

اردو شاعری کے چھے دیوان، فارسی شاعری کا ایک دیوان۔

تین نثری تصانیف:

نکات الشعراء، ذکرِ میرؔ، فیضِ میرؔ۔

میرؔ شناسی کا ایک انداز میرؔ شناسی سے زیادہ میر شکنی کا انداز اختیار کر گیا ہے۔ اس انداز کے حامل نقادوں سے میرؔ کی ذات اور شاعری کے حوالے سے بہت زیادہ الزامات لگائے۔ ان کی تصانیف میں کسی کسی جگہ پر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر میرؔ کی ذات اور شاعری کی خوبیوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سب سے سخت رویّہ محمد بن علی باوہاب کا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق:

۱۔ میرؔ، غیر سیّد تھے اور انھوں نے شیعت کا برملا اظہار اس لیے کیا کہ انھیں سیّد مان لیا جائے۔

۲۔ میرؔ کے سوتیلے بھائی اور آرزوؔ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن میرؔ نے بھائی کا ناجائز شکوہ کیا اور آرزوؔ کی عزت پر ڈاکہ ڈالا۔

۳۔ میرؔ نے آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنی والدہ کا کہیں پر ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس وقت کے معیارِ شرافت پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔

۴۔ وہ خودسر، متکبّر اور بددماغ تھے۔

۵۔ میرؔ کے والد اور چچا امان اللہ کا نقشہ جس طرح کا ''ذکرِ میرؔ'' میں کھینچا گیا ہے بالکل غلط ہے کیونکہ ان کے والد اور چچا لڑکوں سے عشق کرتے تھے جو کہ عظمت کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔

۶۔ میرؔ خود بھی امرد پرستی کا شکار رہے۔

۷۔ میرؔ کی آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جگہ جگہ شعوری طور پر جھوٹ بولا ہے اور کئی واقعات کو جان بوجھ کر بیان نہیں کیا۔

۸۔ ان کی شاعری ہجو، رطب و یابس اور فحش کلامی پر مبنی ہے۔

مکمل کتب میں میر شناسی کے حوالے سے توصیفی رویّے کے ساتھ ساتھ تنقیصی رویّہ بھی سامنے آیا جو بعض اوقات میر شکنی کا انداز اختیار کر گیا لیکن یہ رویّہ کوئی غالب رجحان کی شکل اختیار نہ کر سکا۔

مکمل کتب کے ساتھ ساتھ میر کے بارے میں ایسی کتب بھی سامنے آئیں جو مکمل طور پر میر پر نہیں تھیں بلکہ ان میں میر کے ساتھ دیگر شعراء کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس انداز کی حامل کتابوں میں جہاں پر میر کی ذات اور فن کے حوالے سے بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے وہاں پر قاری کو تقابلی انداز سے مطالعہ کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح میر کو دیگر شعراء کے ساتھ دیکھنے سے ان کے ادبی مقام کا تعیّن کرنے میں اور بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ ادبی تاریخ نگاری کی روایت نے بھی میر شناسی میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب کی تواریخ کو بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے۔ ادبی تاریخ میں شخصیات سے زیادہ رجحانات پر بحث کی جاتی ہے۔ رجحانات کی بحث میں شخصیات کا ذکر بھی ہوتا ہے کیونکہ رجحانات کے فروغ میں شخصیات کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔

جزوی کتب بھی میر شناسی کے انھیں رجحانات کو سامنے لاتی رہیں جن رجحانات کو مکمل کتب سامنے لائیں۔ ان کتب میں بھی میر شناسی کے حوالے سے تحسینی اور تردیدی دونوں رویّے سامنے آئے لیکن ردِ میر کا رویّہ تحسینِ میر کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس تحسین و تردید میں میر کی شخصیت اور فن کی جو تصویر بنتی ہے، اس کے نمایاں خد و خال یہ ہیں:

۱۔ میر ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں اکبرآباد میں محمد علی کے گھر پیدا ہوئے لیکن کچھ نقادوں نے میر کے والد کا نام میر عبداللہ بھی لکھا ہے۔

۲۔ میر، سیّد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ ان کی زندگی میں بہت زیادہ مشکلات تھیں لیکن جب وہ لکھنؤ آئے تو انھیں قدرے خوشحالی نصیب ہوئی۔

۴۔ میر کی ذات میں خودداری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

۵۔ اگرچہ آرزو نے میر کی شاعری میں معاونت کی لیکن میر نے اس کا برملا اظہار

کبھی نہ کیا۔

۶۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

۷۔ میؔر نے ابتدائی عمر میں شاعری شروع کر دی۔

۸۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

۹۔ غزل میں ان کا کوئی شاعر مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۱۰۔ وہ مثنوی کے بھی بہترین شاعر ہیں لیکن ان کی مثنویوں میں فنّی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔

۱۱۔ سہل ممتنع ان کی شاعری کی بنیادی خوبی ہے۔

۱۲۔ غزل کے علاوہ وہ دیگر اصنافِ شاعری میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔

۱۳۔ میؔر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اُردو شعراء کے دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ ہے جس نے تذکرہ نگاری کی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

مکمل کتب اور جزوی کتب کے ساتھ ساتھ درج ذیل انداز سے بھی میؔر شناسی کی کوششیں جاری رہیں:

۱۔ دیباچہ جات/مقدمہ جات

۲۔ ادبی رسائل میں شامل تحقیقی و تنقیدی مضامین

۳۔ تعلیمی اداروں میں ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات

جب میر تقی میؔر کے کلام کی اہمیت کا احساس بڑھا تو ان کے کلام کو مرتب کرنے کا کام بھی شروع ہوا۔ مرتبین اپنے زمانے کے نامور میؔر شناس بھی تھے، انھوں نے جہاں پر میؔر کے کلام کو مرتب کیا وہاں پر مقدموں اور دیباچوں کے ذریعے میؔر شناسی کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ان مقدموں اور دیباچوں میں جہاں پر میر کی ذات کے حوالے سے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے وہاں پر ان کے فن کی خصوصیات کو بھی نمایاں کرنے کی کوششیں کی گئیں ہیں۔ یہ دیباچے اور مقدمے بھی میؔر کی جو تصویر سامنے لائے وہ بڑی حد تک اس تصویر سے ملتی جلتی تھی جو میؔر پر لکھی جانے والی کتب ہمارے سامنے لانے میں

کامیاب ہوئیں۔ ان دیباچوں اور مقدّموں کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل کا کردار میؔر شناسی میں بڑی اہمیّت کا حامل رہا ہے۔ ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوعیّت کے ہیں۔ ان مضامین کے حوالے سے جہاں پر میؔر کی زندگی اور فن کے پوشیدہ گوشوں سے پردہ اُٹھایا گیا وہاں پر ساتھ ساتھ ان کی ذات اور فن کے حوالے سے نئے نئے سوالات بھی اُبھارے گئے۔ ان تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں میں انھیں لوگوں کا کردار نمایاں رہا جنھوں نے کتب کے حوالے سے میؔر کے مرتبے کا تعیّن کرنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تحقیقی اور تنقیدی نوعیّت کے مضامین سے بننے والی تصویر بھی کتب سے بننے والی تصویر سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔

تعلیمی اداروں میں تحقیقی اور تنقیدی نوعیّت کی سرگرمیوں کو مقالہ جات کی مدد سے فروغ دیا گیا۔ اگرچہ یہ تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جات طالب علمانہ کوششیں ہیں لیکن انھیں قابل ترین اساتذہ کی نگرانی میں تکمیل کے مراحل سے گزارا جاتا ہے، اس لیے ان کی اہمیت کو کسی طور پر بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میؔر شناسی کے حوالے سے ہونے والے زیادہ تر تحقیقی مقالہ جات میؔر کے فن سے متعلق ہیں۔ ان مقالہ جات میں میؔر کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ حتمی نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

میؔر شناسی کی اس روایت نے میؔر کی زندگی اور فن کے حوالے سے ہزاروں پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کر کے میؔر کی تفہیم میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی اور فن کے حوالے سے کئی پہلو توجہ طلب ہیں:

۱۔ میؔر کے والد کا اصل نام کیا تھا؟ کئی نقادوں نے ان کے والد کا نام میر عبداللہ بھی لکھا ہے اس کی کیا وجوہات ہیں؟

۲۔ میؔر اور آرزؔو کے تعلّقات میں بگاڑ کا اصل سبب کیا تھا؟

۳۔ جب پہلی مرتبہ میؔر دلّی آئے تو انھوں نے آرزؔو کے ہاں قیام کیا یا کہ نہیں۔ اگر ان کا قیام آرزؔو کے ہاں نہیں تھا تو اس کے اسباب کیا تھے؟

۴۔ میؔر نے اپنی آپ بیتی ''ذکرِ میؔر'' میں اپنی والدہ کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ ان کی والدہ کون تھیں اور کہاں کی رہنے والی تھیں؟

۵۔ میرؔ کی بیٹی جو بیگمؔ کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتی تھی اس کا اصل نام کیا تھا؟

۶۔ ''نکات الشعراء'' کے بارے میں پایا جانے والا ابہام کن وجوہات کی بنیاد پر ہے اور ''نکات الشعراء'' کے اصل نسخہ کی کیفیت کیا ہے؟

۷۔ میرؔ کے مدفن کا حتمی تعین ممکن ہے یا کہ نہیں؟

۸۔ میرؔ کے کلام میں دیگر شعراء کا الحاقی کلام کس حد تک ہے اور وہ کون کون سے اشعار ہیں جو میرؔ کے نام سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن اصل میں یہ اشعار ان کے نہیں ہیں؟

۹۔ میرؔ کا غیر مطبوعہ کلام کتنا ہے اور اسے کس حد تک یکجا کر کے سامنے لایا گیا ہے؟

۱۰۔ میرؔ کے ہاں سائنسی شعور کو دریافت کرنے کی بھی ضرورت ہے جس کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جن پر تحقیقی اور تنقیدی نوعیّت کی بحث کرنے کے بعد نتائج اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرؔ شناسی کی عصرِ حاضر میں روایت اپنی جگہ پر گراں قدر ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا تقاضا بھی کرتی ہے کہ اسے مزید مستحکم کیا جائے تا کہ ''خدائے سخن'' کی زندگی اور فن کے حوالے سے کسی قسم کی تشنگی کا احساس باقی نہ رہے۔



کتابیات

کتب

آزاد، محمد حسین	آبِ حیات (مرتبہ تبسم کاشمیری)	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۷۰ء
آغا حیدر، سیّد	مطالعہ آبِ حیات	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۶۹ء
آفتاب اقبال، ڈاکٹر	میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ	دوست پبلشرز اسلام آباد	۲۰۰۴ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۹۰ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	تجربے اور روایت	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۵۹ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	جدید اردو ادبیات	فیروز سنز لاہور	۱۹۷۱ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	غضنفر اکیڈمی کراچی	۱۹۷۸ء
ابوسعید نورالدّین، ڈاکٹر	تاریخ ادبیاتِ اردو (حصہ دوّم)	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۹۷ء
آثرؔ، امداد امام	کاشف الحقائق (مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی)	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
آثرؔ لکھنوی، نواب جعفر علی خان	مزامیر	کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی	۱۹۴۷ء
احتشام حسین، سیّد	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	مکتبۂ خیال لاہور	۱۹۸۹ء
احتشام حسین، سیّد	داستانِ اُردو	الکتاب کراچی	۱۹۶۵ء
احمد فاروقی، خواجہ	کلاسکی ادب	آزاد کتاب گھر دہلی	۱۹۵۳ء
احمد فاروقی، خواجہ	میر تقی میرؔ۔ حیات اور شاعری	انجمن ترقیٔ اردو علی گڑھ	۱۹۵۴ء
ادریس صدیقی	خدائے سخن، میر تقی میرؔ	مکتبہ عزم و عمل کراچی	۱۹۶۳ء
ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر	بارہویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول	الوقار پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
اے۔بی۔اشرف، ڈاکٹر	میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ	بیکن بکس ملتان	۱۹۹۹ء
اسلم انصاری، ڈاکٹر	اردو شاعری میں المیہ تصوّرات	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۲۰۰۸ء
اعجاز حسین سیّد، ڈاکٹر	مختصر تاریخ ادبِ اردو	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۱ء
افضال حسین، قاضی	میرؔ کی شعری لسانیات	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۳ء
امراللہ، امیرالدّین،	تذکرہ مسرت افزاء (ترجمہ عطاؔ کاکوی)	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ	۱۹۶۸ء
امیر حسن نورانی	اُردو کے چاند تارے	مطبع نول کشور لکھنؤ	س۔ن
امیر حسن نورانی	میر تقی میرؔ، حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام	راجہ رام کمار بکڈپو لکھنؤ	۱۹۵۷ء

انجم اعظمی	ادب اور حقیقت	اشاعت گھر کراچی	۱۹۷۹ء
انور سدید، ڈاکٹر	اُردو ادب کی مختصر تاریخ	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۱ء
م-ن	ادبیاتِ اُردو	شعبہ تصنیف و تالیف اردو اکیڈمی کراچی	س-ن
باطن، قطب الدّین	گلستانِ بے خزاں	منشی نول کشور لکھنؤ	۱۸۷۵ء
بھگوان داس ہندی	سفینۂ ہندی (مرتبہ عطا کاکوی)	ادارہ تحقیقاتِ عربی و فارسی	۱۹۵۸ء
تشنہ، ایم نذیر احمد	اردو ادب کا ارتقاء	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۹۱ء
تنہا، محمد یحیٰ	سیرُ المصنفین	جامعہ ملیہ پریس دہلی	۱۹۲۸ء
تنہا، محمد یحیٰ	مرآۃ الشعراء	حافظ محمد عالم پرنٹرز لاہور	۱۹۴۵ء
ثناء الحق حقی	میر و سودا کا دور	ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی	۱۹۶۵ء
جمیل احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	غضنفر اکیڈمی کراچی	۱۹۹۶ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (جلد دوّم)	مجلس ترقیٔ ادب لاہور	۱۹۸۷ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر	محمد تقی میر	ایجوکیشنل بک ہاؤس لاہور	۱۹۸۳ء
حالی، الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری	پاپولر پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۸۴ء
حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۶۱ء
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	کارگہ شیشہ گری	ادارۂ ادب سری نگر	۱۹۸۲ء
حسن اختر ملک، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور	۱۹۷۹ء
حسینی، سیّد فتح علی	تذکرہ ریختہ گویاں (مرتبہ مولوی عبدالحق)	انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد	۱۹۳۳ء
حفیظ الرحمٰن خاں، عبدالعزیز بلوچ	تعارف، مشاہیر نظم و نثر کا سوانحی و تنقیدی جائزہ	کاروانِ ادب ملتان	۱۹۸۷ء
حنیف نقوی	شعرائے اُردو کے تذکرے، نکات الشعراء سے گلشنِ بے خار تک	اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۹۸ء
خالد ندیم، پروفیسر	میر سے فیض تک	تخلیقات لاہور	۱۹۹۹ء
خوشحال زیدی، ڈاکٹر	اردو زبان و ادب کا خاکہ	بزمِ خضرِ راہ نئی دہلی	۱۹۸۹ء
خویشگی، نصر اللہ خان	گلشنِ ہمیشہ بہار (مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی)	انجمن ترقیٔ اردو کراچی	۱۹۶۷ء
خیال، نواب نصیر حسین	داستانِ اردو	ادارہ اشاعتِ اردو، حیدرآباد دکن	س ن
راشد آذر	میر کی غزل گوئی۔ ایک جائزہ	انجمن ترقیٔ اردو ہند دہلی	۱۹۹۱ء

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	اصناف ادب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۱ء
زورؔ، محی الدین قادری	اردو شہ پارے	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن	۱۹۲۹ء
زورؔ، محی الدین قادری	تین شاعر	صفیہ اکیڈمی کراچی	۱۹۶۵ء
ساجد امجد، ڈاکٹر	اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات	الوقار پبلیکیشنز لاہور	۲۰۰۳ء
سردار جعفری	پیغمبرانِ سخن	مکتبہ اردو ادب لاہور	س ن
سرور، اعظم الدولہ	عمدۂ منتخبہ	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۶۱ء
سکسینہ، رام بابو	مثنویاتِ میرؔ بخطِ میرؔ	دھومی مل دھرم داس چاوڑی بازار دہلی	۱۹۵۶ء
سکسینہ، رام بابو (مرتب)	مرقعِ شعراء	دھومی مل دھرم داس چاوڑی بازار دہلی	۱۹۵۶ء
سلیم اختر ملک، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۷۸ء
سلیم اختر ملک، ڈاکٹر	تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
شاہینہ تبسم	فرہنگ کلامِ میرؔ (دیوانِ اوّل) مع تنقیدی مقالہ	معیار پبلیکیشنز نئی دہلی	۱۹۹۳ء
شبلی نعمانی	شعرالعجم	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۶۶ء
شجاعت سندیلوی، ڈاکٹر	تعارف تاریخِ اردو	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۲ء
شفیقؔ، لچھمی نرائن	چمنستانِ شعراء (مرتبہ مولوی عبدالحق)	انجمن ترقیٔ اردو دکن	۱۹۲۸ء
شورشؔ، غلام حسین	تذکرہ شورش (رموز الشعراء) مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۴ء
شوقؔ، قدرت اللہ	تذکرہ طبقات الشعراء مرتبہ نثار احمد فاروقی	مجلس ترقیٔ ادب لاہور	۱۹۶۸ء
شیفتہؔ، نواب غلام مصطفیٰ خاں	گلشنِ بے خار مرتبہ کلب علی خاں فائق	مجلس ترقیٔ ادب لاہور	۱۹۷۳ء
صغیر احمد جان	تاریخ زبان و ادبِ اردو	نفیس اکیڈمی کراچی	۱۹۸۷ء
طارقؔ، عبدالرحمٰن	فردوسِ معانی	ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور	۱۹۵۰ء
عارف بٹالوی، ڈاکٹر	جنت میں مشاعرہ	نیا کتاب گھر دہلی	س ن
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	اردو تنقید کا ارتقاء	انجمن ترقیٔ اردو کراچی	۱۹۵۲ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	تنقیدی تجربے	اردو دنیا کراچی	۱۹۵۹ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	شاعری اور شاعری کی تنقید	اردو دنیا کراچی	۱۹۶۵ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	میر تقی میرؔ	ادارہ ادب و تنقید لاہور	۱۹۸۰ء

عبدالحق، مولوی	انتخابِ کلامِ میرؔ مع مقدمہ	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۴۵ء
عبدالحیی، حکیم	گلِ رعنا	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۲۰ء
عبدالسلام ندوی، مولانا	شعرالہند (حصہ اوّل)	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۴۹ء
عبدالسلام ندوی، مولانا	شعرالہند (حصہ دوم)	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۵۴ء
عبدالمغنی	میرؔ کا تغزل	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۲۰۰۰ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۵۲ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	اشاراتِ تنقید	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۶ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	سخن ور۔ نئے اور پرانے	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۷۶ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	مباحث	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۵ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	نقدِ میرؔ	مکتبہ خیابانِ ادب لاہور	۱۹۶۸ء
عبداللہ سیّد، ڈاکٹر	ولیؔ سے اقبالؔ تک	مکتبہ خیابانِ ادب لاہور	۱۹۷۶ء
عسکری، محمد حسن	انسان اور آدمی	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۵۳ء
عسکری، محمد حسن	ستارہ یا بادبان	مکتبہ سات رنگ کراچی	۱۹۶۳ء
عسکری، محمد حسن	وقت کی راگنی	مکتبہ محراب لاہور	۱۹۷۹ء
عطش درانی	اُردو اصناف کی مختصر تاریخ	مکتبہ میری لائبریری لاہور	۱۹۸۶ء
علی حسن خان، سیّد	بزمِ سخن	مفیدِ عام آگرہ	۱۹۷۹ء
علی لطف، مرزا	گلشنِ ہند	حیدرآباد دکن	۱۹۰۶ء
غلام حسین، ڈاکٹر	اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۸ء
فاروقی، شمس الرحمٰن	شعرِ شورانگیز (جلد اوّل)	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۹۰ء
فاروقی، شمس الرحمٰن	شعرِ شورانگیز (جلد دوم)	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۹۱ء
فاروقی، شمس الرحمٰن	شعرِ شورانگیز (جلد سوم)	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۹۲ء
فاروقی، شمس الرحمٰن	شعرِ شورانگیز (جلد چہارم)	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۹۴ء
فاروقی، نثار احمد	تلاشِ میرؔ	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی	۱۹۹۴ء
فاروقی، نثار احمد	میر تقی میرؔ	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۸۵ء
فاروقی، نثار احمد	میرؔ کی آپ بیتی	مکتبہ برہان دہلی	۱۹۵۷ء
فاروقی، محمد احسن	اردو میں تنقید	ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ	س ن
فاطمی، مصطفیٰ کمال	اردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت	دانش محل لکھنؤ	۱۹۶۲ء

فاطمی، مصطفےٰ کمال	تذکرۂ میر		س ن
فرزانہ سیّد	نقوشِ ادب	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۰ء
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۷۲ء
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اُردو کی بہترین مثنویاں	نذیر سنز پبلشرز لاہور	۱۹۹۳ء
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	الوقار پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۷ء
قاسم، قدرت اللہ	مجموعۂ نغز (جلد اوّل) مرتبہ محمود شیرانی	نیشنل بک اکادمی دہلی	۱۹۷۳ء
قائم، قیام الدّین	مخزنِ نکات (مرتبہ ڈاکٹر اقتداء حسن)	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۶ء
کریم الدّین رفیلن	طبقات الشعرائے ہند	مطبع العلوم مدرسہ دہلی	۱۹۷۵ء
کلیم الدّین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ اوّل)	نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور	۱۹۸۳ء
مبتلاؔ، مردان علی خان	گلشنِ سخن مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۶۵ء
مجنوں گورکھپوری	نقوش وافکار	صفیہ اکیڈمی کراچی	۱۹۶۶ء
محسن علی، سیّد	سراپا سخن تلخیص وترتیب ڈاکٹر اقتداء حسن	اظہار سنز لاہور	۱۹۷۰ء
محمد باقر، آغا	تاریخ نظم ونثر اردو	آزاد بکڈپو لاہور	۱۹۵۸ء
محمد بن علی بادہاب	ذکرِ میرؔ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (مع ترجمہ)	یونائیٹڈ بک کارپوریشن کراچی	۱۹۹۷ء
محمد حسین خان	ریاض الفردوس	شیخ مبارک علی ناشر وتاجر کتب لاہور	۱۹۶۸ء
محمد ذکی الدہلوی	گلہائے خنداں	ایوانِ ادب کراچی	۱۹۹۳ء
محمد زکریا، ڈاکٹر	اُردو میں قطعہ نگاری	منیب بکڈپو لاہور	۱۹۷۷ء
محمد یار گوندل	مثنویاتِ میرؔ، تحقیق وتنقید	مثال پبلشرز فیصل آباد	۲۰۰۸ء
محمود بریلوی	مختصر تاریخ ادب اردو	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۸۵ء
مرتضیٰ حسین مولوی، سیّد	مشاعرہ عالمِ ارواح	نسیم بکڈپو لکھنؤ	۱۹۵۵ء
مرتضیٰ زیدی، سیّد	تنقیدی ادب	پولیمر پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۴ء
مسعود حسن رضوی ادیب، سیّد	آئینۂ سخن فہمی	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۵۹ء
مشہدی، محمد فاضل	میرؔ کے بہتر نشتر	نذیر پرنٹنگ پریس امرتسر	۱۹۳۷ء
مصحفی، غلام ہمدانی	تذکرہ عقدِ ثریا تلخیص وترجمہ عطاؔ کاکوی	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ	۱۹۶۷ء
مصحفی، غلام ہمدانی	تذکرہ ہندی گویاں مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو دکن	۱۹۳۳ء
ممتاز منگلوری (مرتب)	طیفِ غزل	لاہور اکیڈمی لاہور	۱۹۴۵ء
منظور حسین، خواجہ	اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ	مکتبہ کاروان لاہور	۱۹۸۱ء

میر حسن	تذکرہ شعرائے اُردو	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۴۰ء
	تصحیح وتنقید مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی		
نادر، کلب حسین	تذکرہ نادری	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۵۷ء
	مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب		
نارنگ، گوپی چند	اسلوبیاتِ میر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۸۵ء
میر، میر محمد تقی	انتخاب کلامِ میر مرتبہ حامدی کاشمیری	ساہتیہ اکیڈمی دہلی	۱۹۹۲ء
میر، میر محمد تقی	انتخاب کلامِ میر مع مقدمہ مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۸۶ء
میر، میر محمد تقی	انتخابِ میر	مکتبۂ خیال لاہور	۱۹۸۹ء
	انتخاب ناصر کاظمی، مرتبہ باصر سلطان کاظمی		
میر، میر محمد تقی	انتخاب مثنویاتِ میر مرتبہ سر شاہ محمد سلیمان	نظامی پریس بدایون	۱۹۳۰ء
میر، میر محمد تقی	بدن نامۂ میر مرتبہ ایم۔ اے یزدانی		۱۹۸۶ء
میر، میر محمد تقی	دیوانِ میر مرتبہ سردار جعفری	ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی	۱۹۶۰ء
میر، میر محمد تقی	فیضِ میر مرتبہ مسعود حسن رضوی	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۲۹ء
میر، میر محمد تقی	کلیات	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۸۷۴ء
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۲۰۰۳ء
	مرتبہ ظلِ عباس عباسی	نئی دہلی	
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر مرتبہ سردار جعفری	ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی	۱۹۶۰ء
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر مرتبہ عبادت بریلوی	اُردو دنیا کراچی	۱۹۵۸ء
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر مرتبہ عبدالباری آسی	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر مرتبہ کلب علی فائق	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۷۷ء
میر، میر محمد تقی	کلیاتِ میر مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۸۷ء
میر، میر محمد تقی	مثنویاتِ میر مرتبہ سید محمد	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد	۱۹۳۲ء
میر، میر محمد تقی	مثنویاتِ میر بخطِ میر مرتبہ رام بابو سکسینہ	دھرم داس چاوڑی بازار دہلی	۱۹۵۶ء
میر، میر محمد تقی	نکات الشعراء مرتبہ عبادت بریلوی	ادارہ ادب وتنقید لاہور	۱۹۸۰ء
میر، میر محمد تقی	نکات الشعراء مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۷۹ء
ناصر، سعادت خان	خوش معرکۂ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۷۰ء
ناصر کاظمی	خشک چشمے کے کنارے	مکتبۂ خیال لاہور	۱۹۸۲ء

ناہید کوثر، ڈاکٹر	اردو شاعری کا ارتقاء	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۹۳ء
نسّاخ، مولوی عبدالغفور	سخنِ شعراء	منشی نول کشور لکھنؤ	۱۸۷۴ء
نسّاخ، مولوی عبدالغفور	قطعۂ منتخب مرتبہ انصار اللہ نظر	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۴۷ء
نسیم قریشی	اردو ادب کی تاریخ	ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ	۱۹۶۱ء
نظیر لدھیانوی، اصغر حسین خاں	تذکرہ شعرائے اردو	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۵۳ء
نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر	دلی کا دبستان شاعری	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۶۵ء
نورالحسن، نقوی	تنقیدِ فن اور اردو تنقید نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۰ء
نورالرحمٰن، مولوی	انتخابِ میر	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۴۵ء
وقار عظیم سیّد (مدیر خصوصی)	تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند جلدے	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۱ـ۷۲ء
یوسف حسین خان، ڈاکٹر	اردو غزل	آئینۂ ادب لاہور	۱۹۶۴ء
یزدانی۔ ایم۔ اے	بدن نامۂ میر	لاہور	۱۹۸۶ء

انگریزی کتب

Ahmad Ali	An Anthology of Urdu Poetry	Columbia University Press New York	1973
Daiches David	Critical approaches to Literature	London	1956
D. J. Mathews, C Shakle, Shahrukh Hussain	Urdu Literature	Urdu Markaz London	1995
H. Coombs	Literature and Criticism	Penguin Book London	1963
M. Sadiq, Dr.	A History of Urdu Literature	Oxford University Press Karachi	1985
Naz	An Outline of Urdu Literature	Feroze sons Karachi	1971
Ralph Russell/ Khurshidul Islam	Three Mughals Poets	George Allen and Unwin Ltd, London	1968
Ralph Russell	The Persuit of Urdu Literature	Zed Books London	1992
Saksena, Ram Babu	A History of Urdu Literature	Sang-e-meel pulications Lahore	1996
T- Graham Bailay	A History of Urdu Literature	Sathi Publication Dehli	1979

مقالہ جات

اختری بیگم	اردو شاعری میں غم کے تین نمائندے میرؔ، غالبؔ، فانیؔ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۳ء
اسلم انصاری	اردو شاعری میں المیہ تصورات (میرؔ سے فانیؔ تک)	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۹۸ء
اسماء عزمی	میرؔ کا فلسفۂ حسن	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۸۷ء
افضال حسین قاضی	میرؔ کی شعری لسانیات (غزلوں کی روشنی میں)	گورکھپور یونیورسٹی	۱۹۸۱ء
بشریٰ شریف	میرؔ کی شاعری کے انگریزی تراجم تحقیقی وتنقیدی جائزہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۳ء
باقر علی شاہ	شاعری کا دبستانِ دہلی ودبستانِ لکھنؤ ایک غیر حقیقی تقسیم	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۹۹ء
ثریا اختر	کلامِ میرؔ کا فنی تجزیہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۰ء
ثریا شاہین	میرؔ کی غیر غزلیہ شاعری	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۲ء
حمید اللہ خان	میرؔ کا عروضی مطالعہ	میرٹھ یونیورسٹی	۱۹۹۰ء
حمیرا ارشاد	میرؔ کے اردو اور فارسی کلام کا تقابلی مطالعہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۶ء
در شہوار	میرؔ کی امیجری	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۲ء
راحیلہ بشیر	اشاریہ کلیاتِ میرؔ (جلد پنجم، ششم)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۱ء
رخسانہ جبین	اشاریہ تراکیب غزلیاتِ میرؔ فرہنگ دو دیوان (دوسرا + چوتھا)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۰ء
رخسانہ رشید	پاکستان میں غزل پر میرؔ کے اثرات ناصرؔ، شہرتؔ، باقیؔ، انشاؔ کے حوالے سے	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۳ء
سعادت ظفر	میرؔ، سوداؔ، دردؔ (اشاریہ)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۳ء
سمعیہ مقبول	کلیاتِ میرؔ کا موضوعاتی مطالعہ	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۹۰ء

شاہد پرویز	میر تقی میر کی مثنویات کا اسلوبی مطالعہ	جواہر یونیورسٹی	۱۹۷۹ء
شاہین نقوی	مثنویاتِ میر۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۸۹ء
شاہین نقوی	میر تقی میر کی شخصیت اور شاعری کا نفسیاتی مطالعہ	کراچی یونیورسٹی	۲۰۰۴ء
شائستہ لطیف	میر تقی میر کی سوانح اور شخصیت ان کی شاعری کے آئینے میں	شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۱ء
شفیقہ پروین	(جدید اردو غزل میں) میر کی روایت	کشمیر یونیورسٹی	۱۹۸۱ء
صفیہ حیات	میر کا غم	میسور یونیورسٹی	۱۹۷۰ء
عذرا نسیم	میر کی شاعری کے انتخابات تنقیدی جائزہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۵ء
عمران اختر	اشاریہ کلیاتِ میر (جلد اوّل، دوم)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۰ء
فاطمہ جمشید	اشاریہ کلیاتِ میر (جلد سوم، چہارم)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۱ء
فریدہ یاسمین	اشاریہ تراکیب میر تقی میر	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۹۰ء
فیض احمد بلوچ	تراکیب میر تقی میر و فرہنگ	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۹۰ء
قمر جبین	میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۹ء
محمد اشرف	اردو ادب کی مختصر تاریخوں کا تنقیدی جائزہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۸۸ء
محمد ساجد خان	تدوین غزلیات میر (دیوان اوّل تا ششم)	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۲۰۰۴ء
محمد صفدر رانا	اردو شعراء و ادباء کی خود نوشتیں ۱۹۹۰ء تک	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۲۰۰۴ء
محمد ہارون قادر	میر تقی میر کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۵۲ء
محمد یار گوندل	میر تقی میر۔۔۔ مثنوی نگار	شعبہ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد	۱۹۹۱ء
مسرت حفیظ	پیرویٔ میر	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۷۹ء

مطلوب عالم	میر اور سودا کے عہد کی شاعری میں اخلاقی تصورات، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۲ء
ممتاز عرشی	میر کی امیجری	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۲ء
میمونہ بیگم	میر کی شاعری کا استعاراتی نظام	گلبرگہ یونیورسٹی	۲۰۰۵ء
ناہید فاطمہ	تراکیب۔ میر تقی میر وفرہنگ	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۹۰ء
نسرین تاج گل	میر کی امیجری	شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۳ء
نواب حسین سید	میر۔ ایک مطالعہ	الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد	۱۹۵۰ء
یاسمین حبیب	میر تقی میر کا تصورِ شعر	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۹۶ء
یاسمین رعنا	میر کی شاعری میں فکری عناصر	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۹۷۱ء

ادبی رسائل

آجکل، دہلی	اگست ۱۹۵۰ء، اکتوبر ۱۹۵۱ء، فروری ۱۹۶۴ء، مارچ ۱۹۶۷ء، نومبر ۱۹۶۷ء
ادبی دنیا، لاہور	جنوری ۱۹۳۴ء، اکتوبر ۱۹۴۹ء، جون ۱۹۵۰ء، اگست ۱۹۵۰ء، شمارہ ۳، ۱۹۵۶ء، ستمبر ۱۹۶۵ء
اردو، کراچی	اکتوبر ۱۹۴۹ء، اپریل ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۴ء، جنوری ۱۹۶۸ء
اردو، دکن	اپریل ۱۹۲۶ء، جنوری ۱۹۳۱ء، جنوری ۱۹۳۸ء، جنوری ۱۹۴۱ء، اکتوبر ۱۹۴۱ء، اپریل ۱۹۴۲ء، جولائی ۱۹۴۹ء، جنوری ۱۹۵۵ء
اردو، علی گڑھ	اپریل ۱۹۵۵ء
اردو ادب، علی گڑھ	اکتوبر ۱۹۵۰ء، جنوری واپریل ۱۹۵۱ء، شمارہ نمبر ۴، ۱۹۶۲ء
افکار، کراچی	فروری ۱۹۶۴ء
الشجاع، کراچی	نومبر ۱۹۵۵ء
برہان، دہلی	جون ۱۹۶۵ء
تخلیقی ادب، اسلام آباد	مارچ ۲۰۰۴ء
تہذیب، پٹنہ	اکتوبر ۱۹۵۳ء
تہذیب الاخلاق، علی گڑھ	جولائی ۱۹۶۵ء
جامعہ دہلی	ستمبر ۱۹۶۴ء، جولائی ۱۹۶۶ء، نومبر ۱۹۶۶ء

خاتون۔ دکن	۱۹۶۷ء
دہلی کالج میگزین	میر نمبر ۱۹۶۲ء
رہنمائے تعلیم، دہلی	جنوری ۱۹۶۶ء
زمانہ۔ کانپور	جولائی ۱۹۱۶ء، جولائی ۱۹۱۹ء، جون ۱۹۲۹ء، دسمبر ۱۹۳۲ء، مارچ ۱۹۳۴ء، جون ۱۹۴۰ء
ساقی۔ کراچی	جون ۱۹۵۸ء، میر نمبر ستمبر ۱۹۵۸ء
صبح نو، پٹنہ	اپریل ۱۹۶۶ء، ستمبر ۱۹۶۶ء
سویرا، لاہور	شمارہ نمبر ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳
صحیفہ، لاہور	ستمبر ۱۹۵۷ء، جولائی ۱۹۶۱ء، جولائی ۱۹۶۲ء
فروغ اردو، لکھنؤ	دسمبر ۱۹۶۴ء، جون ۱۹۶۶ء
فیض الاسلام، راولپنڈی	اپریل ۱۹۶۷ء
ماہ نو، کراچی	دسمبر ۱۹۵۴ء، مارچ ۱۹۶۳ء
مشرب، کراچی	نومبر، دسمبر ۱۹۵۴ء
معارف۔ علی گڑھ	جون ۱۹۴۳ء، جون ۱۹۵۸ء
نقوش۔ لاہور	اکتوبر ۱۹۴۹ء، مئی رجون ۱۹۵۳ء، اگست رستمبر ۱۹۵۳ء، مئی رجون ۱۹۵۴ء، ستمبر راکتوبر ۱۹۵۴ء، جنوری رفروری ۱۹۵۹ء، دسمبر ۱۹۵۹ء، اکتوبر ۱۹۶۲ء، مارچ ۱۹۶۳ء، جون ۱۹۶۴ء، اکتوبر رنومبر ردسمبر ۱۹۶۶ء، میر تقی میر نمبر ۱، ۲، ۱۹۸۰ء، ادبی معرکے نمبر ۱، ۲، ۱۹۸۱ء، میر تقی میر نمبر ۳، ۱۹۸۳ء
نگار، بھوپال	نومبر ۱۹۲۶ء، جنوری ۱۹۳۵ء
نگار، کراچی	دسمبر ۱۹۵۰ء، مئی ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۵ء، اگست ۱۹۵۵ء، مئی ۱۹۵۶ء، دسمبر ۱۹۵۶ء جون ۱۹۵۹ء، سالنامہ ۱۹۶۴ء، ستمبر ۱۹۶۵ء، مئی رجون ۱۹۶۷ء

اردو لغات رفرہنگ

اشرف ندیم	جدید اردو لغت	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان	۲۰۰۰ء
امیر مینائی	امیر اللغات	لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز	۱۹۸۹ء
بلیاوی، عبدالحفیظ	مصباح اللغات	دہلی، مکتبہ برہان	۱۹۵۸ء
سید احمد دہلوی	فرہنگ آصفیہ	لاہور، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ	

شان الحق حقی	فرہنگِ تلفظ	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان	۱۹۹۵ء
شاہینہ تبسم	فرہنگ کلام میر	لکھنؤ	۱۹۹۳ء
شفق لکھنوی	فرہنگِ شفق	لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۸۳ء
عبدالقدوس عرشی	اردو تلمیحات و اصطلاحات	لاہور، مکتبہ عالیہ	۱۹۹۱ء
عبدالوحید خواجہ	جامع اللغات	لاہور، گنج شکر پرنٹرز	۱۹۸۹ء
فیروز الدین، مولوی	فیرو اللغات	لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ	۱۹۷۲ء
محمد اکرام چغتائی	تشریحی لغت	لاہور،	۲۰۰۱ء
نذیر حق، محمد اسلم کولسری		اردو سائنس بورڈ	
مقبول بیگ بدخشانی	اردو لغت	لاہور، مرکزی اردو بورڈ	۱۹۶۹ء
نورالحسن نیر کاکوروی	نوراللغات	کراچی، ٹائمنر پریس	۱۹۵۹ء
وارث سرہندی	علمی اردو لغت (جامع)	لاہور، علمی کتاب خانہ	۱۹۷۶ء
وارث سرہندی	قاموس مترادفات	لاہور، اردو سائنس بورڈ	۱۹۸۶ء

انگریزی لغات

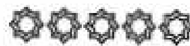
Cuddon. J. A.	The Penguin Dictionary of Literary Terms and Theory.	England, Lays Ltd.	1992
Elison Johns.	Chamber's Dictionary of Quotations	France, Cambridge University	1996
Graw-Hill-MC	Dictionary of Literary Terms	New York	1972
Johnson, Brintain.	The Oxford English Dictionary	Oxford University Press	1933
Peter Kemp.	The Oxford Dictionary of Literary Quotation.	New York, Oxford University Press	1997
Routledge, Kegan Paul.	David Grambs Dictionary Literary Companion word About world.	London	1984
Shipley Josept, T.	Dictionary of world Literary Terms	London, George Allen and Unwin	1970

اردو انسائیکلوپیڈیاز

اردو انسائیکلوپیڈیا	لاہور، فیروز سنز	۱۹۸۴ء
اردو جامع انسائیکلوپیڈیا	لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز	۱۹۸۷ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ	لاہور، پنجاب یونیورسٹی	۱۹۶۶ء
اسلامی انسائیکلوپیڈیا	لاہور، الفیصل ناشران	۱۹۹۴ء
شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا	لاہور، شعاع ادب	۱۹۸۷ء

انگریزی انسائیکلوپیڈیاز

Chamber's Encyclopedia	London, George New ness Ltd.	1968
Encyclopedia American	U. S. A. Americana Corporation.	1947
Princeton Encyclopedia of Poetry and Poetics	London	1975



MIR SHANASI
ASR-E-HAZIR MAIN

Thesis for Ph.D. (Urdu)

Regular Programme.

Session: 2003 - 2008



Research Scholar

Nazar Abbas

Lecturer in Urdu

Govt. College Bhalwal

Supervisor

Dr. Muhammad Kamran

Associate Professor of Urdu

Oriental College, Punjab University, Lahore.

Department of Urdu

Oriental College,

University of The Punjab, Lahore.